کلّیاتِ عیش

(حکیم آغا جان عیش دہلوی)

مرتّبہ

ڈاکٹر حبیبہ بانو

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

(حکیم آغا جان عیش دہلوی)

مرتبہ

ڈاکٹر حبیبہ بانو

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

KULLIYAT-E-AISH
by HAKIM AGHA J/ J AISH
Compiled by:- DR HABIBA BANO

سنہ اشاعت :- اپریل تا جون ۱۹۹۲ء شک ۱۹۱۴ء
پہلا ایڈیشن ۱۰۰۰
سلسلہ مطبوعات نمبر :- ۶۹۶
کتابت :- ڈاکٹر حبیبہ بانو
مصحح (پروف ریڈر) جناب دیانند سوانی
قیمت :- ۸۰/=

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک I آر کے پورم۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶
ٹیلیفون : ۶۰۳۹۳۸ ۶۰۳۳۸۱
طابع :- سپریم آفسیٹ پریس ۵ - K مالویہ نگر نئی دہلی

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کررہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

دیوانِ اوّل کی تنقیدی تدوین

○ حصہ غزلیات :- دیوان اول کے دستیاب نسخوں میں داخلی شہادتوں کی بنا پر نسخہ بنارس نہ صرف عیش کی ملکیت تھا بلکہ اس پر خود ان کی تحریریں بھی موجود ہیں مقدار و اصناف کلام کے اعتبار سے بھی مذکورہ نسخہ گرانقدر ہے اسلیے اس نسخے کو بنیاد بنا کر دیوان اول کی تدوین کی گئی ہے ان تمام نسخوں کے حصہ غزلیات میں ردیفوں کی وضاحت نہیں ہے - اس لیے ردیفوں کا تعین اور وضاحت کر دی گئی ہے۔

○ سہرا :- سہرا نسخہ بنارس کے حصہ غزلیات میں شامل ہے۔ جسے بہ طور صنف سخن علیحدہ درج کیا گیا ہے۔

○ قصائد :- قصائد کے عنوانات نسخہ بنارس اور نسخہ کراچی کے مطابق ہیں۔ لندن کے نسخے میں شامل قصائد پر عنوانات درج نہیں ہیں۔

○ نعت :- نسخہ بنارس اور نسخہ کراچی میں نعتیہ کلام سب سے آخر میں درج ہے۔ موجودہ ترتیب میں نعتیہ کلام کو ابتدا میں جگہ دی گئی ہے۔

○ رباعیات :- رباعیات اور رباعی نما قطعات اصل کے مطابق درج کیے گئے ہیں وضاحت کے لیے رباعیات و قطعات کا عنوان قائم کر دیا گیا ہے

مخفّفات

۱۔ س : قلمی نسخۂ دیوان عیش،
بنارس ہندو یونیورسٹی (ذخیرۂ سری رام)

۲۔ ل : قلمی نسخۂ دیوانِ عیش،
انڈیا آفس لائبریری، لندن

۳۔ ک : قلمی نسخۂ انتخاب دیوانِ عیش،
میوزیم کراچی (پاکستان)

۴۔ ف۔ د : فغانِ دہلی مرتبہ محمد تفضّل حسین خان کوکب (مطبوعہ)

فہرست

پیش لفظ — ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

• عیش کا عہد

دلی دیارِ عیش

بہادر شاہ ظفر — 15

معروف، میرزا الٰہی بخش خان — 18

شاہ نصیر، شاہ نصیر الدین عرف کلّو — 19

ممنون، میر نظام الدین — 20

احسان، حافظ عبدالرحمٰن خان (حافظ جیو) — 22

مومن، محمد مومن خان — 23

ذوق، شیخ محمد ابراہیم — 25

آزردہ، مفتی محمد صدرالدین خان — 27

غالب، میرزا اسداللہ خان — 28

شیفتہ، نواب مصطفٰے خان — 30

• حیاتِ عیش — 33

سکونت — 34

زندگی کے معمولات — 37

سراپا اور لباس — 38

اسبابِ معیشت 39
ریاست جھجر کی ملازمت 46
دلّی کی تباہی (۱۸۵۷ء) //
مذہبی رجحان 51
شریکِ حیات کا انتقال 54
احباب سے تعلقات //
آخری ایام 57
وفات 58
اولاد 60
عیش کی قبر 61

● عیش بحیثیت شاعر 63
سلسلۂ تلمذ //
خواجہ میر درد دہلوی 64
خواجہ میر محمد اثر 65
میر محمدی بیدار دہلوی 66
مجرم اکبرآبادی 67
مشاعروں میں شرکت 68
لکھنؤ اسکول 73
عیش کی غزل 75
روزمرّہ اور محاورے پر قدرت 78
ہندی الفاظ کا استعمال 79
قصائد 82

رباعیات 89
اخلاقیات 91
غدریہ شاعری 92
لکھنؤ کا مرثیہ 96
کلام عیش کے بعض خصوصیات اور عیوب 97
رعایت لفظی //
تبع الجمع 98
واو عاطفہ کا استعمال 99
تذکیر و تانیث //
تکیۂ کلام 100
اجی، ہاں، سنا //
ہاں ہاں، ہاں جی ہاں 101
اساتذہ کا ادب //
تعلّی 103

● دیوان کے مخطوطات 107
دیوان اوّل: 108
نسخۂ لندن //
نسخۂ بنارس 110
نسخۂ کراچی 113
دیوان دوم: 115
● تلامذۂ عیش 118
1 آزاد دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد //

2	تجلی دہلوی، رسول خان	28
3	تشنہ دہلوی۔ محمد علی	130
4	حسن سکندر آبادی، میر محمد حسن	134
5	ہادی، مرزا غلام فخر الدین	//
6	ہُدہُد۔ عبدالرحمن	//
7	واحد دہلوی، شیخ عبدالواحد	141
	کتابیات	143
	دیوانِ اول	147
	دیوان دوم	439

۱۔ عیش کا عہد

دِلّی : دیارِ عیش

ہندستان جنت نشان کی راجدھانی ہونے کے باعث دِلّی ہر زمانے میں ہر طرح کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ یہاں اہلِ دل بھی آئے، اور صاحبانِ دول بھی۔ اس شہر میں ان سب کے لیے یکساں کشش تھی۔ علم و فن، صنعت و حرفت، تجارت و سوداگری، جاہ و منصب، غرض دنیوی عزت اور سربلندی کا کون سا شعبہ تھا جس پر دلّی نے اپنی چھاپ نہ لگائی ہو اور جس کے حصول کے لیے یہاں کے رہنے والوں نے کوشش نہ کی ہو۔

خدا معلوم، ماضی میں دلّی کَے بار اجڑی اور کَے بار بسی۔ سولھویں صدی کے شروع میں تیمور کے خاندان میں سے بابر نے وسطِ ایشیا سے آکر اس عروس البلاد کے حسن میں چار چاند لگا دیے تو اس کی شہرت دنیا کے چار کھونٹ میں پھیل گئی۔ پھر اس پر وہ دَور بھی گزرا جب اسی آلِ تیمور کے قدموں کے نیچے دلّی کی ایک اِنچ زمین بھی نہ رہی اور وہ قلعۂ معلّیٰ کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئی۔ ان کی شاہی، فقیری میں، اور آزادی اسیری میں بدل گئی۔ زمانے نے نئی کروٹ لی اور دلّی نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب بے دست و پا انسانوں کا غیر منظم گروہ غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا انگریز حکمرانوں کے فوجی دستوں سے ٹکرا گیا اور بالآخر اپنے ہی خون کے سیلِ بیکراں کا شکار ہو گیا جس کے نتیجے میں ملک پر آیندہ ایک صدی کے لیے غیروں کی غلامی مسلّط ہو گئی۔

شخصی اور شاہی طرزِ حکومت میں اقتدار کی ہوس جو رنگ رنگ کے گُل کھلاتی

ہے، اس کی مثالیں تاریخ کے صفحات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہندستان میں خود مغلوں کی حکومت کا قیام بھی مقامی حکمرانوں کی اسی ہوسِ اقتدار میں گرفتاری کے سبب ہوا تھا۔ لیکن مغلوں نے نئی حکمتِ عملی اختیار کی۔ انھوں نے ہندستان پر اپنا اقتدار قائم کر لینے کے بعد اس کی بنیادوں کو مضبوط اور دیرپا بنانے کے لیے یہاں کے باشندوں سے اپنا ربط و ضبط اس درجہ بڑھایا کہ رفتہ رفتہ وہ خود اس ملک کے سرکردہ اور معزز شہری بن گئے۔ اور یہاں کے اعلیٰ اور ممتاز افراد مغلیہ خاندان کا حصّہ بن گئے۔ افسوس کہ اکبر کے وارث اس کی مصالحانہ پالیسی پر کاربند اور قائم نہ رہ سکے اسی کا نتیجہ تھا کہ رفتہ رفتہ مقامی طاقتوں نے سر اٹھایا۔ مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی آخر کار اُسے ایک غیر ملکی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اس صورتِ حال کے لیے سب سے زیادہ اورنگ زیب کو ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اورنگ زیب ہوا کا رخ پہچاننے میں قاصر رہا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ چاروں طرف سے مزاحمت اور مخالفت بلکہ بغاوت کے جو بادل اُمنڈے آرہے ہیں، مرکزی حکومت کے لیے اس طوفان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اسی لیے اس نے سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے آخری وقت میں اپنے تین بیٹوں کو یہ وصیت کی کہ وہ باہمی جنگ و جدل ختم کرکے مغلیہ سلطنت کو تین برابر حصّوں میں بانٹ لیں اور ایک دوسرے کی پشت پناہ بن کر دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ لیکن اس کے بیٹوں نے اس وصیت پر عمل نہ کیا۔ اور اس کا خمیازہ نہ صرف حکمرانوں کو، بلکہ رعایا کو بھی بھگتنا پڑا۔[1]

اورنگ زیب کے بعد دکن سے مرہٹے، اور شمال سے جاٹ اور روہیلے پایۂ تخت پر چڑھ دوڑے۔ امرائے دربار کی باہمی آویزشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث حکومت کی ساکھ ختم ہوگئی۔ نظم و نسق اور امن و امان نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ امرا جسے چاہتے تخت سے اتار دیتے اور اس کی جگہ کسی اور کو تخت نشین کر دیتے۔

۱۔ زوالِ سلطنتِ مغلیہ (فال آف دی مغل امپائر) (سر جادو ناتھ سرکار): ۳۹ ہ

موئے کو مارے شاہِ مدار۔ رہی سہی کسر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دلّی ویران ہو گئی۔ پایۂ تخت کی دولت، جو صدیوں کی جمع جتھا تھی، بوریوں میں بھر بھر کر، گھوڑوں اور اونٹوں پر لاد لاد کر حملہ آوروں کے ساتھ گئی۔ یوں اگلے سو برس کے لیے دلّی بے چراغ ہو گئی۔

۱۷۷۱ء میں عالم گیر ثانی کا جانشین شاہ عالم ثانی مرہٹوں کے پنشن خوار کی حیثیت سے لال قلعہ میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ شاہ عالم نے مرہٹوں سے نجات پانے کے لیے بہت ہاتھ پانو مارے لیکن اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ دلّی مرہٹوں کی فوجی چھاؤنی بن کے رہ گئی[۲]

شاہ عالم ثانی کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی اس کا جانشین ہوا اور اسی کے انتقال پر ۲ ستمبر ۱۸۳۷ء کو مغلیہ خاندان کا آخری نام لیوا بہادر شاہ ظفر لال قلعہ میں اپنے بزرگوں کے تخت پر بیٹھا۔

یہ حقیقت ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کی اصلی شان و شوکت اورنگ زیب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ۱۵۲۶ء سے لے کر (جب بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی) ۱۷۰۷ء تک (جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا) یعنی ۱۸۱ سال میں چھ بادشاہ ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک جب "غدر" ہوا اور جس پر مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اس ڈیڑھ صدی میں ۱۷۔ ۱۸ بادشاہ تخت پر بیٹھے اور ان میں کئی غیر فطری موت کا شکار ہوئے۔

اس ناموافق فضا میں بھی بہادر شاہ ظفر کی فطری نیکی اور شرافت، ہمدردی، غمگساری اور رعایا پروری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اگرچہ سیاسی سطوت و طاقت کب کی

۲۔ چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی): ۵۱

رخصت ہو چکی تھی، اس کے باوجود علمی، ادبی اور کلچرل پہلو سے وہ غنیمت ثابت ہوا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی اس کے دربار میں ہر طرح کے فکر و فن کے ماہر موجود تھے۔

بہادر شاہ نے اپنے پیشروؤں کے زیرِ سایہ پنپنے والی مشرقی تہذیب و ثقافت قائم رکھنے کی کوشش کی اور دلّی کے معاشرے کی ان خصوصیات کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا جو فرنگی تہذیب اور غلبے کی روز افزوں یلغار کے سامنے بے بسی محسوس کر رہی تھیں۔

دوسرے تمام فنونِ لطیفہ کی طرح زبان اور اس کے ادب کی ترقی بھی ہمیشہ سیاسی امن و امان اور اصحابِ اقتدار کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی طالب رہی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ظاہری سیاسی سکون اور امن ضرور تھا اگرچہ اہلِ بصیرت اور اصحابِ نظر سے یہ بھی مخفی نہیں تھا کہ سطح کا یہ سکون اور خاموشی کسی خطرناک طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اور ہوا بھی یہی کہ ۱۸۵۷ء میں لوگوں کے دبے ہوئے جذبات پورے ملک میں انگریزی تسلط کے خلاف کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح سے پھوٹ پڑے۔

رہی سرپرستی اور حوصلہ افزائی! تو بہادر شاہ ظفر کی اوقات ہی کیا تھی کہ وہ کچھ کر سکتا۔ اسے انگریزوں سے لاکھ سوا لاکھ ماہانہ تنخواہ یا وظیفہ ملتا تھا۔ اس میں بمشکل اس کی اپنی اور اس کے وسیع کنبے کی بسر اوقات ہوتی تھی لیکن چونکہ وہ اکبر و جہانگیر، شاہجہان و اورنگ زیب کا نام لیوا اور ان عظیم الشان اور شہرۂ آفاق حکمرانوں کا وارث اور جانشین تھا، اس لیے لال قلعہ کے مکین کی حیثیت سے ہر کسی کی یہی تمنّا تھی کہ اس کے دربار سے وابستہ ہو جائے اور خود اس کے قریب پہنچے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کی دلّی میں ہر فن کے اصحابِ کمال اتنی تعداد میں جمع ہو گئے تھے کہ پھر چشمِ فلک نے ان کا ثانی نہ دیکھا۔ یہ گویا موت سے پہلے مریض کا سنبھالا تھا۔ یہ بساط ۱۸۵۷ء کے "غدر" کے ساتھ اُلٹ گئی۔ اسی پہ نہ صرف ہندوستان کی سیاسی آزادی کا خاتمہ ہو گیا، بلکہ دوسری اقدارِ عالیہ کے ساتھ علم و ادب کی پُرانی روش اور اقدار نے بھی دم توڑ دیا، اور اس کے بعد اس نے نیا رُخ اختیار کر لیا۔

عہدِ ظفر (و عیش) کا ادبی ماحول

فنونِ لطیفہ میں سے ایک شاعری ہی کو دیکھیے کہ یہی اس وقت موضوعِ سخن ہے سب سے پہلے بادشاہ سلامت ہی کو لیجیے۔

بہادر شاہ ظفر:

ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی ۱۷۷۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ شاہزادگی کے زمانے سے شعر وسخن کے عاشق وشیدا تھے۔ ظفر تخلّص اختیار کیا۔ شاعری کی کچھ روایت گھر میں موجود تھی۔ ان کے دادا شاہ عالم ثانی اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں آفتاب تخلّص کرتے تھے۔ دیوان موجود ہے۔ ان کے بیٹے (ظفر کے والد) اکبر شاہ ثانی نے باپ کے تخلّص کی رعایت سے شعاع تخلّص پسند کیا۔ لیکن انھوں نے زیادہ نہیں کہا، تذکروں میں صرف چند متفرق اشعار ملتے ہیں ان کے مقابلے میں ظفر بالکل شعر وشاعری کے ہو کے رہ گئے۔ دیکھا جائے تو اور کر بھی کیا سکتے تھے! انگریزی سیاست نے جو حالت کر رکھی تھی، بادشاہ سلامت کے لیے کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ظفر نے سب سے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ جب وہ دکن چلے گئے تو میر کاظم علی بیقرار سے مشورہ کرنے لگے۔ چندے بعد ۱۸۰۸ء میں انگریزوں نے جان الفنسٹن کی سرکردگی میں ایک وفد سندھ اور کابل کے امیروں سے گفت وشنید اور عہد نامے مرتّب کرنے کے لیے بھیجا، تو میر کاظم علی اس کے ساتھ میر منشی بن کر روانہ ہو گئے۔ یوں میدان خالی ہو گیا، تو شیخ محمد ابراہیم ذوق جن کی بیقرار کی وساطت سے ولی عہد کے دربار میں رسائی ہو چکی تھی، ظفر کے استاد مقرّر ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں کی خوب نبھی۔ ذوق کی وفات (۱۸۵۴ء) کے بعد غالب اُن کے استاد مقرر ہوئے۔

ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کا ۱۸۳۷ء میں انتقال ہوا، تو یہ ان کے جانشین ہوئے لیکن سچ یہ ہے کہ اب یہ شاہی بس برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ پورا ملک تو درکنار، یہاں دلّی میں بھی، لال قلعہ کی چار دیواری کے باہر، بادشاہ کا حکم نہیں چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا

ہنگامہ، جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا ہے، انھیں بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوا۔ دیسی سپاہ کی شکست کے ساتھ ہی خاندانِ مغلیہ کی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور یوں جس سلطنت کا آغاز بابر کی شمشیر و سناں کے ساتھ ہوا تھا، بہادر شاہ ظفر کے طاؤس و رباب پر اس کا اختتام ہوا۔ بہادر شاہ گرفتار ہو کر رنگون (برما) بھیج دیے گئے، جہاں نظر بندی ہی کی حالت میں بعمر ۸۷ سال ان کا ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال ہوگیا وہیں رنگون میں مدفون ہیں[۳]۔

ان کے چار دیوان ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ کلام بے حد پختہ اور اثر انگیز، زبان صاف اور سلیس اور مستند ہے۔

رعایا عام طور پر امرا اور رؤسا کی پیروی کرتی ہے۔ اونچے طبقے کی پسند، عوام کی پسند بن جاتی ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ والیِ حکومت شعر و سخن کا دلدادہ ہے، اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے شعر گوئی سے دلچسپی لازم ہے، تو ہر ایک کا اس طرف میلان ہوگیا۔ جو اصحاب اس کے واقعی اہل تھے، اور جنھیں قدرت کی طرف سے سخنوری کا ملکہ ودیعت ہوا تھا، وہ ترقی کر گئے۔ ان کی دنیا بھی کامیاب رہی کہ اپنی زندگی ہی میں انھیں شہرت بھی نصیب ہوئی اور قدر و منزلت بھی؛ ہم چشموں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور عاقبت بھی سنور گئی کہ آج تک اہلِ علم و ادب ان کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں اور انھیں اپنا محسن تسلیم کرتے ہیں۔

یہ صرف اعلیٰ یا تعلیمیافتہ طبقے ہی کی بات نہیں، اس دور میں یہاں سب چھوٹے بڑے اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ یا شاعر تھے، یا شعر کے والہ و شیدا۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے مرتبہ تذکرہ "مجموعۂ نغز" کے دیباچے میں اس وقت کی دِلّی کا خوب نقشا کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں[۴]:

۳۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے "تلامذۂ غالب" (مالک رام): ۳۷۹ ـ ۳۸۹

۴۔ مجموعۂ نغز (مرتبہ محمود شیروانی) دیباچہ (ع ـ ط)

سلاطین وعمّال، امراو علما، سپاہ، اہلِ دیوان کے علاوہ ہر طبقے کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے مثلاً منیر صیقل گر ہے، اگرچہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ محمد امان نثار معمار ہیں، جامع مسجد دہلی انھی کے بزرگوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اور یہ خود بھی اسی پیشہ سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ یہ وہی نثار ہیں جنھوں نے میر تقی میر کے "اژدر نامہ" کے جواب میں بدیہہ نظم پڑھ کر اہلِ مشاعرہ سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا۔ اسی طرح حسین بخش پارچہ فروش ہے۔ بدھ سنگھ آشفتہ آہنگر ہے۔ خواجہ ہینگا علاقہ بند ہے۔ شمبھو ناتھ عزیز نہاجن ہے۔ میر لطیف علی لطیف جواہرات کا دلّال ہے۔ اور مغل علی مغل علاقہ بند و سوداگر۔ بدر الدین مفتون بزاز اور بکرنگ سُنار ہے۔ محمد ہاشم شائق خیاط ہے، اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ضم کر لیا ہے اور کافی شہرت رکھتا ہے۔ محمد عارف رفوگر ہے۔ عنایت اللہ عرف کلّو حجّام ہے اور حضرت مولانا فخرالدین کی شعر تراشی کرتا ہے۔ شعر میں میاں کلّو کو سودا کے تلمذ پر فخر ہے۔ مذاق اس قدر بلند ہے کہ سودا کے سوا کسی کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے۔ غلام ناصر جرّاح ہے۔ مقصود ایک سقّہ ہے جو فنِ شعر میں بازار کے لونڈوں کا استاد ہے۔ قرین ایک خاکروب ہے، اگرچہ تکملہ میں درج کرتے وقت مصنّف نے اس کے اصل پیشے کا ذکر ترک کر دیا ہے۔ اس طرح ہر وضع اور قماش کے شعر گو موجود ہیں۔ ثقہ اور سنجیدہ نگار سے لے کر رندو اوباش، ہزّال و پوآج اور فحش گو تک اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔

یہ تو رہا عوام کا حال، "ثقہ اور سنجیدہ نگار" حضرات کا ذکر کیا جائے، تو اس صنف میں متعدد ان حضرات کے نام ملتے ہیں، جن کے حالات اور کلام سے ہماری تاریخِ ادب کے صفحات روشن ہیں۔ جنھوں نے اردو زبان کو وہ آبرو بخشی کہ آج اس کی بدولت وہ دنیا کی ترقی یافتہ قدیم زبانوں سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کر سکتی ہے ان میں سے چند

بہت نمایاں اصحاب کا مختصر تذکرہ پیش ہے۔

معروف، میرزا الٰہی بخش خان:

ان کا سلسلۂ نسب باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور ولی اللہ خواجہ احمد یسوی سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد حکومتِ بخارا میں ممتاز عہدوں پر متمکن رہے۔ جب وہاں سیاسی افراتفری کا دَور دَورہ ہوا، اور امن و امان مفقود ہو گیا تو ان کے دادا عارف جان بھی وہاں سے نقلِ مکان کر کے عہدِ احمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۵۴ء) میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں، قاسم جان اور عالم جان، کی معیّت میں ہندستان چلے آئے۔ سرحد پار کرنے کے بعد پہلا پڑاؤ اٹک تھا۔ یہاں اس زمانے میں میرزا احمد بیگ شاہی صوبے دار تھے۔ انھوں نے اس قافلے کی مناسب آؤ بھگت کی اور انھیں اپنا مہمان رکھا۔ پھر چندے بعد اپنی بیٹی چھوٹے بھائی عارف جان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔ میرزا الٰہی بخش خان انھیں عارف جان کے تیسرے بیٹے تھے۔ دو بھائی ان سے بڑے تھے: نبی بخش خاں اور احمد بخش خان۔ سب سے چھوٹے بھائی کا نام محمد علی خان تھا۔ یہی احمد بخش خان بعد کو "فخر الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ" کا خطاب پا کر ریاست لوہارو کے نواب ہوئے۔[5]

میرزا الٰہی بخش خان تقریباً ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے اگرچہ منہ میں چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے مزاج پر شروع سے قناعت اور استغنا کا غلبہ تھا چنانچہ عنفوانِ شباب ہی میں حضرت مولانا فخر الدین چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مرشد نے منازلِ سلوک کی تکمیل کے لیے اپنے خلیفہ مولانا سیّد ضیاء الدّین کے پاس جے پور بھیج دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان میں مولانا ضیاء الدّین کی مدح میں بھی اشعار ملتے ہیں۔

شعر گوئی دراصل تصوّف ہی کا ثمرہ تھی۔ کلام پر اصلاح شاہ نصیر سے لی۔ ان کے علاوہ کچھ استفادہ شاید نصیر کے استاد شاہ محمدی مائل سے بھی کیا۔ ایک شعر میں دونوں

---

۵ - یہ حالات دیوان معروف کے دیباچے اور تلامذۂ غالب (۵۲۳-۵۲۴) سے ماخوذ ہیں

کا نام لیا ہے:

گر بُرا ہوں، یا میں قابل ہوں
مدح خوانِ نصیر و مائل ہوں

آزاد نے لکھا ہے[6] کہ معروف نے ذوق سے بھی اصلاح لی۔ اور "جو دیوانِ معروف اب رائج ہے، وہ تمام و کمال انھیں کا اصلاح کیا ہوا ہے"۔ بہت لوگوں نے اس بے سر و پا بیان کی قلعی کھولی ہے۔ دونوں کی عمروں میں اتنا فرق ہے، اور معروف نے اس زمانے میں پختگی حاصل کر لی تھی، جب ذوق ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے ذوق کا ان کے کلام پر اصلاح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان کا ایک دیوان مولانا شاہ عبدالحامد قادری بدایونی نے مرتّب کر کے شائع کر دیا تھا۔[7] دوسرا ہنوز غیر مطبوعہ حیدرآباد میں ان کے خاندان میں موجود ہے۔ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں انتقال ہوا۔ مزارِ غالب کے قرب میں بستی حضرت نظام الدّین اولیاؒ کے ایک خاص قطعہ میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔ انھیں کی چھوٹی بیٹی (امراؤ بیگم) میرزا اسداللہ خان غالبؔ کے عقدِ نکاح میں تھیں۔

شاہ نصیر، شاہ نصیر الدّین عرف میر کلّو:

ان کے والد شاہ غریب درگاہ شاہ صدر جہان کے سجّادہ نشین تھے۔ حکومت کی طرف سے بھی کچھ جاگیر ملی تھی۔ اس لیے گھر میں فارغ البالی تھی، جس سے نصیر کا بچپن اور جوانی کا زمانہ نسبتاً ناز و نعم میں بسر ہوا۔ اور اسی باعث ان کی تعلیم ڈھنگ سے نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود انھوں نے شاعری میں وہ نام پیدا کیا، اور اس میں وہ گل بوٹے کھلائے جو تاریخِ

۶۔ دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) مقدمہ: ۹؛ نیز آب حیات: ۴۵۴

۷۔ نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء

۸۔ گلشن بیخار: ۱۸۴

ادبِ اردو کی زیب و آرائش کا حصّہ بن گئے۔ اور اس سے تعلیم کی کمی کا داغ مٹ گیا۔

تاریخ ولادت کا کسی تذکرہ نگار نے ذکر نہیں کیا۔ البتّہ شیفتہ کا یہ لکھنا کہ (۶۰) برس سے ریختہ لکھنے کی مشق کرتے ہیں، پیشِ نظر رہے، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ۱۷۵۵-۱۷۶۰ء کے دوران میں پیدا ہوئے ہونگے۔ طویل عمر پائی۔ ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) میں حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ تاریخ ہوئی: "چراغ گل"۔ وہیں قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے [10]

شاعری میں شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے [11] ایک شعر میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

قبولِ خاطرِ احباب ہے سخن اپنا
یہ فیضِ صحبتِ مائل، نصیرؔ، پایا ہے

خود ان کے شاگردوں کی تعداد انگنت ہے۔ ظفرؔ اور مومنؔ اور ذوقؔ نے بھی ابتدا میں ان سے اصلاح لی۔

ان کا دیوان بھی ان کی زندگی میں نہیں چھپا۔ ایک مختصر سا انتخاب "چمنستانِ سخن" بہت بعد کو چھپا۔

چند برس ہوئے، کلّیات لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مسلم الثبوت استاد ہیں۔ زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں جیسی غزلیں لکھی ہیں، اور ان میں جو دادِ سخن دی ہے، وہ کچھ انھیں کا حصّہ تھا۔

ممنون، میر نظام الدّین

میر قمر الدّین منّت کے بڑے بیٹے۔ اگرچہ ان کا خاندان مشہد (ایران) کا تھا، لیکن منّت کے دادا وہاں سے نقلِ مکان کرکے ہندستان چلے آئے، اور یہاں سونی پت (موجودہ

---

۹ - گلشن بیخار: ۲۳ (یہ تذکرہ ۱۸۳۵ء میں مرتّب ہوا تھا)

۱۰ - آبِ حیات: ۴۰۶

۱۱ - ایضاً: ۴۰۲

ہریانہ) میں بس گئے۔ منت نے کبھی کبھی تفنناً اردو میں بھی کہا، لیکن دراصل وہ فارسی کے شاعر تھے۔ اور اس زبان میں انھوں نے بہت وافر ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے[12]

میر نظام الدین دلّی میں پیدا ہوئے۔ ساری تعلیم و تربیت اپنے صاحبِ کمال والد سے پائی۔ شعر کہنے کا شوق ہوا، تو اصلاح بھی انھیں سے لی۔ خود کہتے ہیں :

ممنون! اک جہاں کو ہے اپنے سخن سے فیض
منّت کی تربیت سے ہوئے فیضیاب ہم

شعر گوئی میں شہرت ہوئی، تو شاہ عالم ثانی کے دربار میں پہنچے۔ بادشاہ نے "فخر الشعرا" کے خطاب سے نوازا[13]

سر ڈیوڈ اختر لونی کی سفارش پر بادشاہی جاگیر کوٹ قاسم کے انتظام پر مقرّر ہو گئے تھے۔ لیکن طویل مدّت تک یہاں کام کرنے کے بعد جب دیکھا کہ لوگ حسد کے مارے سازشیں کرنے لگے ہیں، تو نوکری سے مستعفی ہو گئے[14] آخر ۱۹۱۱ھ میں لکھنؤ کا رُخ کیا، جہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں انگریزوں کا بہت عمل دخل تھا۔ ممنون کی بھی ان سے راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ ان اصحاب نے ان کے علم و فضل کے پیشِ نظر ملازمت کی پیشکش کی، اور انھیں صدر الصدور مقرّر کر دیا۔ اسی حیثیت سے مدّتوں اجمیر میں قیام رہا[15]

آخری عمر میں بینائی زائل ہو گئی تھی۔ کبرسنی اور معذوری کے باعث مستعفی ہو کر دلّی آ گئے۔ یہیں ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں وفات پائی۔ صہبائی نے تاریخ کہی :

شاعرِ شیریں زبانِ ہند (۱۲۶۰)[16]

---

۱۲ - عقدِ ثریا : ۵۴ ؛ سخن شعرا : ۴۵۷
۱۳ - گلشن بیخار : ۱۸۷؛ گلستان سخن : ۴۳۲
۱۴ - علم و عمل، ۲ : ۲۰۲ ؛ مجموعۂ نغز، ۲ - ۲۱۲
۱۵ - گلشنِ بیخار : ۱۸۷
۱۶ - گلستان سخن : ۴۳۳

ان کے متعدد معاصرین کی طرح ان کا دیوان بھی ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اُس کے قلمی نسخے بہت جگہ محفوظ ہیں۔ ابھی چند برس ہوئے، جب ان کے دیوان کے انتخاب شائع ہوئے ہیں۔ ہر ایک صنف میں لکھا اور دادِ سخن دی۔ بہت پُر گو اور ریختہ گو تھے۔

احسان، حافظ عبدالرحمن خان (حافظ جیو):

ان کا سلسلۂ نسب عمّ رسولؐ حضرت عباسؓ سے ملتا ہے۔ ان کے والد حافظ غلام رسول خان لال قلعے میں شاہی خاندان کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کو قرآن مجید پڑھانے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ احسان ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ـ۱۷۷۰ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنے ماحول کی مناسبت سے انھوں نے قرآن بہت کم عمری میں حفظ کر لیا تھا۔ اسی سے "حافظ جیو" گویا ان کے نام کا جُزو بن گیا۔

والد کی وفات کے بعد ان کے فرائض بھی اُن کے سپرد ہوئے۔ تین تین بادشاہوں، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ثانی۔ کے استاد رہے۔ سب نے قرآن احسان سے پڑھا۔ ایک زمانے تک میرزا ایزد بخش کی سرکار میں بعہدۂ مختاری فائز رہے[17] ایک قطعے میں خود بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ احسان نے خاصی طویل عمر پائی۔ تقریباً ۸۴ برس کے تھے، جب ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ـ۱۸۵۱ء) میں انتقال ہوا[18] صابر نے تاریخ کہی:

دل گیا بیٹھ، آہ جب عالم سے احسان اُٹھ گیا (۱۲۶۷)

فارسی میں منتہی تھے، اردو میں استناد کا درجہ حاصل تھا۔ اساتذہ کے ہزاروں شعر نوکِ زبان پر تھے۔ سنداس مستعدی اور برجستگی سے دیتے تھے کہ سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

افسوس کہ دیوان ان کی زندگی میں شائع نہ ہوا۔ اس کے قلمی نسخے ہندستان اور

۱۷۔ گلشن بیخار : ۱۸

۱۸۔ گلستانِ سخن (قادر بخش صابر) ؛ ۱۳۲

بیرونِ ہندستان مختلف مشہور کتابخانوں میں محفوظ تھے ۔ چند برس اُدھر حیدر آباد میں چھپ گیا ہے ۔ لیکن اسے نئے سرے سے مرتّب کرنے کی ضرورت ہے ۔ ان کے ہاں اگرچہ مضمون آفرینی نہیں ملتی، لیکن زبان کے ارتقا اور سلاست اور "ٹھیٹ زبان" کے پہلو سے اس کی بہت اہمیت ہے۔

مومن، محمد مومن خان :

شاہ عالم ثانی (۱۷۵۸ - ۱۸۰۶ء) کے عہدِ حکومت میں دو بھائی، کامدار خان اور نامدار خان کشمیر سے نقلِ مکان کرکے دہلی آئے ۔ پیشے کے لحاظ سے دونوں طبیب تھے ۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور وہ شاہی طبیبوں میں شامل کرلیے گئے ۔ حکومت کی طرف سے معاش کا مناسب انتظام ہو گیا اور جاگیر میں کچھ علاقہ بھی عطا ہوا ۔ یہی نامدار خان ہمارے مشہور شاعر مومن خان مومن کے دادا تھے ۔

نامدار خان کی پانچ اولادوں کے نام ہمیں معلوم ہیں ۔ تین بیٹے (حکیم غلام حیدر خان، حکیم غلام حسن خان اور حکیم غلام نبی خان) اور دو بیٹیاں (مبارک النسا بیگم اور عائشہ بیگم) حکیم غلام نبی خان ہی مومن کے والد تھے ۔ ان کا ۱۲۴۱ھ میں انتقال ہوا ۔ مومن نے والد کی تاریخِ وفات کہی :

غرض آگیا وقتِ موعود جب	گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
"جنازہ" اٹھایا، فرشتوں نے آہ	تو "قد فاز فوزاً عظیماً" کہا

۶۶

(۱۳۰۷ - ۶۶ = ۱۲۴۱)

مومن ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے ان کے والد حکیم غلام نبی خان کو شاہ عبد العزیز ابن حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بہت عقیدت تھی ۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ وہ آئے اور مولود کے کان میں اذان کہی، اور محمد مومن نام رکھا ۔ گھر والے نام حبیب اللہ رکھنا چاہتے تھے ۔ لیکن محمد مومن ہی سے شہرت ہوئی ۔

طب کی تعلیم اپنے والد سے اور دوسرے علوم کی شاہ عبد العزیز کے مدرسے میں

دجوان کے مکان کے بہت قریب تھا) پائی۔ فارسی میں منتہی تھے۔ عربی کی واقفیت بھی خاصی تھی۔ نجوم اور رمل سے بھی بہرۂ وافر حاصل تھا۔ صرف بارہ برس کی عمر تھی کہ شعر گوئی کا شوق ہوا، تو استادِ عصر شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی انھیں چھوڑ دیا۔ ممکن ہے، اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ اُن کا رنگِ سخن جس میں ابہام اور آورد اور تصنّع کی بھرمار تھی، ان کے عام میلانِ طبع کے منافی تھا۔ بہر حال اس کے بعد عمر بھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ فارسی دیوان (اور انشا) ان کے پھوپھی زاد بھائی احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان نے مطبع سلطانی قلعۂ دلّی میں چھپوا کر ۱۲۰۱ھ (۱۸۸۰ء) میں شائع کیا۔ دیوانِ اُردو بھی ان کی زندگی ہی میں ان کے دلی دوست اور شاگرد رشید نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ نے مرتب کیا تھا۔[۲۰] اسے پہلی مرتبہ مولوی کریم الدین نے مطبع رفاہِ عام دہلی میں ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) میں چھاپا تھا۔[۲۰]

مومن نے ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ صحت اچھی تھی۔ کسی قسم کا عارضہ نہیں تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ایک زیرِ مرمت مکان کی چھت پر کھڑے تھے کہ پا نور پٹا اور نیچے گر گئے۔ ضرب شدید آئی، ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ خود ہی زائچہ دیکھ کر حکم لگایا کہ پانچ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا اور اس حادثے کی تاریخ کہی: بشکستِ دست و بازو (۱۲۶۸) چنانچہ پانچ ماہ کے اندر ۱۴ مئی ۱۸۵۲ء کو جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔[۲۱] میرزا قربان علی بیگ سالک کی کہی ہوئی تاریخ ہے: ارم میں عارف و تسکین و مومن۔[۲۲]

۱۹۔ گلشنِ بیخار: ۱۹۶

۲۰۔ تذکرۂ شعرا اردو (کریم الدین): ۳۴۴

۲۱۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام): ۴۴

۲۲۔ یہ دراصل تین شاعروں کی تاریخِ وفات ہے، جن کا انتقال اسی سال (۱۲۶۸ھ میں) ہوا تھا: (۱) میرزا زین العابدین خان عارف، (۲) میر حسین تسکین، (۳) محمد مومن خان مومن۔ 'ارم' کے اعداد (۲۴۱) میں عارف کے (۳۵۱) اور تسکین کے (۵۸۰) اور مومن کے (۹۶) جمع کرنے سے مطلوبہ (۱۲۶۸) برآمد ہوتے ہیں۔

دلّی میں دلّی دروازے کے باہر حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی قبرستان مہندیان میں سپردِ خاک ہوئے[۲۳]

ذوق، شیخ محمد ابراہیم:

بقول مولانا محمد حسین آزاد ان کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ وہ کابلی دروازہ، دلّی میں رہتے تھے۔ یہیں ذوق کی ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ (۲۲ اگست ۱۷۹۰ء) کو ولادت ہوئی[۲۴] ابتدائی تعلیم محلّے کے مکتب میں حافظ غلام رسول شوق سے پائی۔ ابھی مکتب ہی میں تھے، جب شعر گوئی کا شوق ہوا۔ حافظ غلام رسول کو معلوم ہوا تو انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اگرچہ آزاد نے نہیں لکھا، لیکن تعجب نہیں اگر استاد کے تخلص شوق ہی کے وزن پر اپنا تخلص ذوق رکھا ہو۔

اسی محلّے کے رہنے والے ان کے ہم سبق میر کاظم حسین تھے۔ وہ شعر کہتے اور بیقرار تخلص کرتے تھے، وہ حافظ غلام رسول شوق ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک دن بیقرار نے آکر ذوق کو بتایا کہ میں تو شاہ نصیر کا شاگرد ہوگیا ہوں۔ اس پر ذوق کو بھی ترغیب ہوئی اور انھوں نے بھی شاہ نصیر کی باقاعدہ شاگردی اختیار کرلی[۲۵]

اس زمانے میں لال قلعے اور دربارِ شاہی میں جانے کے لیے کسی امیر کبیر اور بارسوخ شخص کے توسّط کی ضرورت تھی۔ معمولی آدمی ان مجلسوں میں نہیں جاسکتا تھا۔ کاظم حسین بیقرار ان کے دوست اور ہم سبق نواب سیّد رضی خان وکیلِ سلطانی کے بھانجے تھے۔ اسی باعث ان کی بھی قلعے اور دربار میں آمد و رفت تھی۔ گاہے ماہے ذوق بھی بیقرار کے ساتھ قلعے میں جانے لگے

۲۳۔ ان کے حالات آبِ حیات (۲۲۱۔۲۳۰) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ دو مستقل کتابیں (۱) مومن از کلب علی خاں فائق (۱۹۶۱ء) اور (۲) مومن از ظہیر احمد صدیقی (۲، ۱۹ء) بھی شائع ہوچکی ہیں۔

۲۴۔ آبِ حیات: ۴۳۶؛ دیباچہ دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) ۲؛

۲۵۔ ایضاً: ۴۳۸؛ ایضاً: ۴

اس طرح سے خوش قسمتی سے ان کی ولی عہد مرزا ابو ظفر محمد سراج الدین (بہادر شاہ ظفر) کے دربار میں رسائی ہو گئی، ورنہ ان کے لیے لال قلعے پہنچنا ناممکن تھا۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے مرزا ابو ظفر کو شعر سے عشق تھا۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اور ان کے دکن چلے جانے کے بعد کچھ دن بیقرار سے مشورہ رہا۔ جب بیقرار بھی انگریزی وفد کے ساتھ سندھ اور کابل سدھارے، تو ان کی نظر ذوق پر پڑی۔ اگرچہ ان کا مشاہرہ صرف چار روپے مقرر رہوا، لیکن جو تعلق اس دن قائم ہوا، وہ عمر بھر کے لیے ہو گیا۔

میرزا ابو ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی بادشاہ وقت تھے۔ ذوق، ولی عہد کے ساتھ شاہی دربار میں بھی حاضری دیتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اکبر شاہ کی مدح میں قصیدہ کہا۔ مطلع تھا:

جب کہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ابلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ کی طرف سے "خاقانیِ ہند" کا خطاب عطا ہوا۔ جب یہ اعزاز ملا ہے، ذوق صرف ۱۹ برس کے تھے[۲۶]

میرزا ابو ظفر اپنے والد اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد، ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تختِ شاہی پر بیٹھے۔ اب ذوق کا ماہانہ وظیفہ بڑھ کر پہلے تیس روپے اور پھر سو ہو گیا، اور عزت و اکرام اس کے علاوہ۔

دیوان زندگی میں نہیں چھپا بلکہ مرتب بھی نہیں ہوا تھا۔ جمعرات ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ (۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء) کی صبح جان بحق ہوئے۔ پہلی مرتبہ ان کے شاگردوں ظہیر اور انور نے اپنے استاد کے حاضر باش شاگرد حافظ غلام رسول ویراں کی مدد سے دیوان مرتب کیا اور ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں شائع کیا۔ اس کے بہت دن بعد ان کے شاگردِ رشید محمد حسین آزاد نے اسے از سرِ نو مرتب کر کے ۱۸۸۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس پر بہت لے دے ہوئی ہے

---

۲۶ - آبِ حیات: ۴۵۵؛ دیباچہ دیوانِ ذوق: ۱۵

محققوں اور نقّادوں نے آزادؔ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے بہت شعر اور غزلیں خود کہہ کر استاد سے منسوب کر دی ہیں۔ آج کل یہی دیوان متداول ہے۔

آزردہ، مفتی محمد صدرالدّین خان:

ایک کشمیری الاصل اہلِ علم و فضل خاندان کے نام لیوا، مولانا لطف اللہ کے بیٹے، ۱۷۸۹ء (۱۲۰۴ھ) میں دِلّی میں پیدا ہوئے "چراغ" سے تاریخ نکلتی ہے۔[۲۷] قرآن، حدیث، علومِ منقولات و معقولات وغیرہ اساتذۂ عہد سے حاصل کیے اور پھر ان سب میں خود وہ درجۂ استناد حاصل کیا کہ سب ان کے تبحّر اور جامعیت کے قائل ہوئے۔

انھوں نے صدقۂ جاریہ کے لیے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ اس کے لیے شاہجہانی مدرسہ "دارالبقا" کو جو مدّتوں سے خراب و خستہ حالت میں پڑا تھا، مرمّت کروا کے اسے از سرِ نو جاری کر دیا۔ اور یہاں طلبہ کو پڑھانے لگے، اُن کا خرچ بھی اپنی جیب سے دیتے تھے۔[۲۸]

مدّتوں حکومتِ وقت کی طرف سے مسندِ افتا کی زینت رہے۔ جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو انھوں نے بھی اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ سر ڈیوڈ اختر لونی کے ساتھ ایک عرصے تک اجمیر اور جے پور میں قیام رہا۔ پھر صدالصدور مقرّر ہو کر دِلّی آگئے۔[۲۹]

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف، ایک فتویٰ شائع ہوا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ کافروں سے جنگ کرنا واجب ہے، اور انگریز چونکہ کافر ہیں، اس لیے ان کے خلاف بھی جنگ فرض ہے۔ مفتی صدرالدین نے بھی اس فتوے پر دستخط کیے تھے۔ جب انگریز فتحیاب ہوئے اور اُن کا دِلّی پر دوبارہ قبضہ ہوگیا، تو مفتی صاحب بھی فتوے پر دستخط کرنے کی پاداش میں پکڑے گئے اور بغاوت کا مقدّمہ قائم ہوگیا، بارے، جان تو بچ گئی، لیکن

۲۷۔ گلشن بیخار: ۱۰؛ تذکرہ علمائے ہند: ۹۴

۲۸۔ گلِ رعنا (عبدالحیٔ): ۳۲۷

۲۹۔ علم و عمل ۱/۱: ۳۷۴

جائداد کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔ بعد کو منت سماجت سے اس میں سے نصف جایداد واگذار ہوگئی۔

۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ (۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) کو بہت تنگی اور عُسرت کی حالت میں فالج سے انتقال ہوا۔ درگاہ شاہ چراغ دہلی، کے صحن میں دفن ہوئے تھے۔ اب قبر کا نشان بھی نہیں۔ "چراغِ دوجہاں بود" سے تاریخ نکلتی ہے۔ (۱۲۸۵ھ)

اردو، فارسی، عربی، تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اور تینوں میں کہتے تھے۔ افسوس، کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اور اس کے بعد کی پریشانیوں میں ضائع ہوگیا۔

اُردو میں مختلف اوقات میں شاہ نصیر اور مجرم اکبرآبادی اور ممنون دہلوی سے مشورہ رہا۔ سچ یہ ہے کہ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے شاعری ان کے لیے چنداں باعثِ فخر نہیں۔ مختلف تذکروں میں مشکل سے (۲۰۰) شعر محفوظ رہ گئے ہیں۔ بحد پختہ کلام ہے[۱]

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیرِ تصویر — نے غمِ قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

الجھنے کو بلا ہیں آپ بھی، کچھ خیر ہو صاحب — لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلفِ پریشاں کو[۱]

غالب، میرزا اسداللہ خان:

ان کے دادا قوقان بیگ خان اٹھارویں صدی کے وسط میں وسطِ ایشیا سے ہندوستان آئے۔ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خان یہیں دِلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی آگرے کے ایک متموّل فوجی افسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ ان کے تین بچے ہوئے: ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ اسداللہ خان بیٹوں میں بڑے تھے۔ وہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اپنی ننھیال آگرے میں پیدا ہوئے۔

غالب کے چچا میرزا نصراللہ بیگ خان انگریزی پیشقدمی کے زمانے میں مرہٹوں کی طرف سے قلعۂ آگرہ کے قلعدار تھے۔ نواب احمد بخش خان والیِ لوہارو کی ہمشیر ان کے عقدِ نکاح میں تھی۔ نواب صاحب موصوف انگریزوں کے طرفدار اور بہی خواہ تھے۔

---

[۱] گلستانِ بیخزاں۔ قطب الدین باطن صفحہ ۲۲ مطبوعہ اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ

جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک یلغار کرتا ہوا آگرے پہنچا تو گمان ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی ترغیب پر نصر اللہ بیگ خاں نے قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ خود انگریزی فوج میں رسالدار مقرر کر دیے گئے۔

غالب تقریباً پانچ برس کے تھے، جب ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ خان کا ۱۸۰۲ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد میرزا نصر اللہ بیگ خان نے انھیں اور ان کی بہن اور بھائی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ بدقسمتی سے چار سال بعد ۱۸۰۶ء میں نصر اللہ بیگ خان بھی ایک حادثے میں چل بسے۔ یقین ہے کہ نواب احمد بخش خان نے سفارش کی ہو گی جس پر انگریزوں نے مرحوم کے پس ماندگان (والدہ، تین بہنیں، غالب اور ان کے برادرِ خرد اور بہن) کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

غالب سنِ شعور کو پہنچے، تو تعلیم کے لیے شیخ معظم کے مدرسے میں بھیج دیے گئے۔ لیکن ان کی درسی تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اس کی تلافی بہت حد تک اس طرح ہو گئی کہ کچھ مدت بعد ایک ایرانی فاضل عبدالصمد نامی واردِ آگرہ ہوا وہ دو سال تک غالب کے مکان پر مقیم رہا اور میرزا نے اس سے فارسی اور دوسرے علوم کی تحصیل کی۔ اگرچہ یہ اختلافی بات ہے مگر مشہور ایسا ہی ہے۔

تیرہ برس کی عمر میں، غالب کی شادی نواب احمد بخش خان، والیِ لوہارو کے برادرِ خرد میرزا الٰہی بخش خان کی چھوٹی صاحبزادی سے ہو گئی۔ اس کے چندے بعد وہ آگرے سے نقلِ مکان کر کے مستقل طور پر دلّی میں آبسے۔

ذوق کی زندگی بھر بہادر شاہ ظفر ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ جب نومبر ۱۸۵۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا، تو ظفر نے غالب کو ان کی جگہ اپنا استاد مقرر کر دیا۔ لیکن یہ شاگردی عیدِ بوقتِ شام ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں "غدر" ہو گیا، جس کے بعد نہ بادشاہ رہے نہ شاہی خاندان۔ بارے، جو قلیل پنشن انھیں اپنے چچا کی خدمات کے عوض انگریزوں کی طرف سے ملتی رہی تھی، وہ ملتی رہی۔ نیز "غدر" سے کچھ پہلے نواب یوسف علی خان والیِ رامپور نے ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی، اور سو روپیہ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، وہ بھی ملتا تھا۔ اس طرح سے لشتم پشتم بسر اوقات کا سلسلہ چلتا رہا۔

لیکن عمر کے ساتھ قوا میں اضمحلال روز افزوں ہوتا چلا گیا۔ اور وہ مختلف امراض کا شکار رہنے لگے۔ آخر کار بعارضۂ فالج ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو دِلّی میں انتقال ہوا۔ تاریخ ہوئی: آہ غالب بمرد۔ بستی نظام الدین (غربی) نئی دہلی میں خاندانِ لوہارو کی ہڑواڑ میں دفن ہوئے تھے۔ بعد کو ان کی قبر (جو اتفاق سے قطار کے آخر میں تھی) الگ کر کے نئے احاطے میں لے لی گئی۔ اس پر سنگ مرمر کی چوکھنڈی غالب سوسائٹی نے تعمیر کروائی تھی۔

شاعری وہ قیام آگرہ کے دوران ہی میں شروع کر چکے تھے۔ شعر پر کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ جو کہا، اسے خود ہی دیکھ لیا۔ پسند آیا تو رہنے دیا، ورنہ رد کر دیا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہا۔ فارسی کا ضخیم دیوان دو مرتبہ ان کی زندگی میں چھپا (۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۲ء) اردو کا دیوان ۱۹ برس کی عمر میں (۱۸۱۶ء) مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اس کے چھپنے کی نوبت کہیں ۱۸۴۱ء میں آئی، یہ ان کے مکمل دیوان کا انتخاب تھا۔ اردو دیوان پانچ مرتبہ ان کی زندگی میں شائع ہوا (۱۸۴۱ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۳ء (دو مرتبہ) اب تو ان کا وہ کلام بھی دستیاب ہو چکا ہے اور شائع ہو گیا ہے، جو انھوں نے رد کر دیا تھا۔

غالب کی مشکل پسند طبیعت اور نئے رنگ کی شاعری کی ان کی زندگی میں بہت مخالفت ہوئی، اگرچہ لوگ رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ جب انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا، اور اس میں سے بیشتر مشکل اور دور از کار شعر حذف کر دیے تو لوگوں کی مخالفت بہت کم ہو گئی۔ اب تو یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ غالب اُردو کے عظیم شاعر ہیں اور ان کی بدولت اردو شاعری میں انقلاب آیا۔[30]

شیفتہ، نواب محمد مصطفیٰ خان:

نجیب الطرفین تھے، اور ان کا امرائے شہر میں شمار ہوتا تھا۔ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ)

۳۰۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے، ذکرِ غالب مولفہ مالک رام

میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے تمام مدارج اساتذۂ وقت کی نگرانی میں طے پائے۔ فارسی اور عربی میں بہت اعلیٰ دستگاہ بہم پہنچائی۔ دینی تعلیم کی بھی تکمیل کی۔ شعر گوئی کا شوق ہوا، تو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہنے لگے۔ اردو میں تخلص شیفتہ تھا، اور فارسی میں حسرتی۔ مومن کی زندگی بھر ان سے اصلاح لیتے رہے۔ اور ان کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد غالب سے مشورہ رہا۔

یہ بھی ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی بالواسطہ مدد کرنے کے الزام میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ ابتدائی عدالت سے سات برس قید کی سزا کا حکم ہوا۔ خوش بختی سے اپیل میں سزا تو منسوخ ہو گئی، لیکن خاندانی پنشن اور جایداد ضبط کر لی گئی۔ بارے، بعد کو سفارش اور منت سماجت سے نصف جایداد واگزار ہو گئی۔

ان کا بھی بہت کلام ۱۸۵۷ء کی افتاد میں ضائع ہو گیا۔ اردو اور فارسی کا دیوان شائع ہو چکا ہے (نظامی پریس، بدایوں) اس کے علاوہ ایک تذکرہ "گلشنِ بیخار" بھی ان سے یادگار ہے، جو اس عہد کی ادبی تاریخ کا مستند اور قابلِ اعتبار ماخذ ہے ــــ حج کا سفرنامہ (ترغیب السالک الی احسن المسالک) بھی چھپ چکا ہے، اور اس کا ترجمہ بعنوان "رہ آورد" بھی موجود ہے۔

اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ تاریخ ہوئی:

از سرِ زاری بباید گفت ایں   "رحمتِ حق بر محمد مصطفیٰ"

درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں اپنی خاندانی حظیرے میں دفن ہوئے[۳۱]۔

یہاں جن اساتذہ کی مختصر سوانح عمریاں درج کی گئی ہیں، وہ گویا اس عہد کے نورتن ہیں۔ ورنہ یہ زمانہ وہ تھا کہ صاحبِ کمال اصحاب کی کمی نہیں تھی، دِلّی کے گلی کوچے شعر و نغمہ سے گونج رہے تھے۔ ان میں سے جو لوگ دربارِ شاہی سے وابستہ ہو گئے، ان

۳۱۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے، تلامذۂ غالب: ۳۲۸ ـ ۳۳۷

کے نام تو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے اور ان کا ذکر کہیں کہیں تذکروں میں مل جاتا ہے۔ لیکن مفصّل تو درکنار، ان کے مجمل حالات بھی نہیں ملتے۔ چند نام دیکھیے: حکیم ثناء اللہ فراق، میر غالب علی خاں سیّد، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبا (تلمیذ میر تقی میر) میرزا عظیم بیگ خاں شاکر۔ انھیں بزرگوں میں سے تھے، جن کے نام رہ گئے ہیں۔ لیکن کسی کا دیوان نہ چھپا، نہ اب اس کے چھپنے کی توقع ہے کیونکہ زمانے کا مذاق اور معیار بدل گیا ہے۔ ہاں، کوئی تلاش اور تحقیق کرے تو ہر ایک کے نام کے ساتھ چند شعر تذکروں میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ تھی وہ فضا، جس میں حکیم آغا جان عیش کی تربیت ہوئی اور وہ پھلے پھولے۔ اور یہ تھا وہ ماحول، جس میں ان کی شاعری شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔

کسی فنِ لطیف کا ملکہ اور رجحان انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ یہ وہبی چیز ہے، اسے سعی و کوشش سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اکتساب سے اس کے اصول، کام کے طریقے، نوک پلک درست کرنے کی تمیز اور قابلیت وغیرہ حاصل کرکے انسان فن کامیابی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو اس فن سے خداداد مناسبت یا قدرتی صلاحیت نہیں ہے، تو وہ لاکھ کوشش کرے، اس کے لیے درجۂ کمال حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس میدان میں مقابلہ اور مسابقت بہت مفید اور معاون ہوتے ہیں یعنی اگر ایک ہی فن کے اہلِ کمال کہیں جمع ہو جائیں، تو ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے ان میں سے ہر ایک سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ یوں اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اسے نئی نئی سوجھتی ہے۔ اور چونکہ ہمچشموں کو شکست دینا اور ان سے سبقت لے جانا اس کا مقصد ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے کام میں کبھی سہل انگاری کا روادار نہیں ہوتا، بلکہ خوب سے خوب تر تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

عیش کو یہ ماحول میسّر آیا۔ انھوں نے بھی یقیناً ہمعصروں پر اپنا سکہ جمانے اور ان پر برتری حاصل کرنے کی پوری سعی کی ہو گی۔ اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے، اس کا فیصلہ تاریخِ ادب کے مؤلف پر ہے۔

۲۔ حیاتِ عیش

بارھویں صدی میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کی اس ملک میں آمد شروع ہوئی۔ یہ لوگ زیادہ تر افغانستان اور ایران سے آئے۔ ان میں ہر پیشے کے لوگ تھے: سپاہی، تجارت پیشہ، اہلِ علم و فضل، صاحبانِ رشد و ہدایت اور محض قسمت آزما۔ ہر ایک نے اپنی صلاحیت اور ظرف کے مطابق، کامیابی حاصل کی اور یہیں کا ہو کے رہ گیا۔

عہدِ محمد شاہی میں جو لوگ بخارا کے اطراف سے ہجرت کر کے ہندستان آئے، ان میں ایک مغل خاندان بھی تھا جو عیش کے اجداد تھے۔ یہ لوگ اوّل خطۂ کشمیر میں قیام پذیر ہوئے اور بعد کو آب و دانہ کی کشش سے وہ کشمیر جنت نظیر سے دِلّی منتقل ہو گئے۔

عیش کے دادا کا نام خواجہ عبدالشکور خان تھا۔ وہ اپنے آبائی پیشے طب میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ دِلّی میں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت ہوئی۔ اس زمانے میں یہاں حاذق طبیبوں کی مانگ تھی۔ اس لیے حکیم عبدالشکور خان کے مطب نے بہت جلد شہرت اور کامیابی حاصل کر لی۔ رفتہ رفتہ ان کا یہاں کے رؤسا میں شمار ہونے لگا۔

حکیم خواجہ عبدالشکور خان کی تین اولادیں ہوئیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک فرزند کا نام عیسیٰ جان تھا۔ عیسیٰ جان نے بھی بعد میں طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور نہایت عزت و احترام اور فارغ البالی کی زندگی گزاری۔ عیسیٰ جان نے اپنے ترکے میں چیلوں کے کوچے میں اچھی خاصی جایداد چھوڑی۔ اس کا ایک حصہ اس جگہ تھا جو بعد کو حکیم آغا جان کے چھتّے کے نام سے موسوم و

مشہور ہوا۔

ایک معاصر محمد ارتضےٰ خان شیدا دہلوی نے اپنی تالیف "مراۃ الاشباہ" میں ان کے والد کا نام عیسیٰ جان کی جگہ عیسیٰ خان تحریر کیا ہے[1] ممکن ہے کہ وہ عرف عام میں اس نام سے مشہور رہے ہوں، ورنہ یہ ثابت ہے کہ وہ نسلاً پٹھان نہیں بلکہ مغل تھے۔ جس کی تصدیق خود عیش کی پوتی کے بیان سے ہوتی ہے[2]

عیسیٰ جان کی اولاد میں دو فرزند نرینہ اور ایک دختر کا تذکرہ ملتا ہے۔ بیٹوں میں ایک آغا جان عیش تھے، جن کو طبابت اور شاعری میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔

عیش کا نام بقول "شیدا دہلوی" آغا علی خان اور عرف آغا جان تھا۔ ان کی پیدائش بارھویں صدی کے آخری دہے میں یعنی ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) کے قریب دہلی میں ہوئی۔ قیاس ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم بھی اس زمانے کے امرا اور فارغ البال مسلم خاندانوں کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی ہوگی۔ یعنی عربی اور فارسی زبان کے علاوہ مروّجہ علوم بھی جن کی شہادت اُن کی کلام سے ملتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے انھیں زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ کہا ہے[3]

اس کے ساتھ فنِ طب کی علمی اور عملی تعلیم یقیناً اپنے اب و جد سے حاصل کی ہوگی۔

عیش کے قصائد میں موسیقی کے سازوں کے ناموں اور ان کی بعض اصطلاحات کے بے تکلفانہ استعمال سے خیال ہوتا ہے کہ انھیں علم موسیقی سے بھی واقف کارانہ تعلق تھا۔ ایک قطعۂ تاریخ سے ان کی علمِ ریاضی سے دلچسپی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

سکونت:

عیش ابتدائے عمر ہی سے مناظرِ فطرت کے عاشق تھے۔ چمن بندی کا شوق اس درجہ تھا کہ انھوں نے اپنے رہائشی مکان کے ایک بڑے حصّے کو چمن بنا رکھا تھا۔ جب طبیعت

۱۔ مراۃ الاشباہ : ۶۹ ۲۔ مضامین فرحت، ۲ : ۱۹۷

۳۔ آب حیات : ۴۸۱

کو اس چمن سے بھی سیری حاصل نہ ہوئی تو صفحۂ قرطاس پر گلہائے الفاظ سے چمن بندیاں کرنے لگے۔

عیشؔ کا رہائشی مکان دلّی میں چیلون کے کوچہ میں تھا۔ کہنے کو تو یہ ایک منزلہ مکان تھا لیکن کافی وسیع و عریض تھا۔ اور اس زمانے کے فارغ البال شرفا کے مکانوں کی تعمیر کے مطابق دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ بیرونی حصّہ مردانہ یا دیوانخانہ کہلاتا تھا۔ اس میں سامنے کے رُخ پر اکہرا دالان، دالان کے آگے سائبان اور اس کے آگے ایک کشادہ صحن جس میں چمن بندی کا خاص اہتمام تھا۔ چمن میں جابجا انواع و اقسام کے پودے اور درخت تھے۔ درختوں میں پانی اور اناج بھرے کونڈے، چھینکوں میں لٹکتے رہتے جن کے لیے حکم تھا کہ کبھی کوئی کونڈ خالی نہ رہے۔ خدّام بھی ان کے حکم کی تعمیل میں مصروف و مستعد رہتے۔ اس لیے چمن سدا مرغزار بنا رہتا۔ کبوتروں کی ٹکڑیاں، چڑیوں کے جھنڈ، طوطوں کے غول، اور پرندوں کے جھلّڑ آتے، شاخوں پر بیٹھ کے سُستاتے، آب و دانہ سے سیر و سیراب ہو کر گلشن کی بہار پرور ہواؤں کا لُطف اٹھاتے اور پھر اگلی منزل کی طرف پرواز کر جاتے۔

مکان کے اندرونی حصّے یعنی محلسرا میں دوہرے دالان تھے۔ سامنے کے حصّے میں ایک دوچھتی تھی۔ اس کا صحن بھی کافی کشادہ تھا۔[۴]

حکیم آغا جان عیشؔ کی سکونت کے مکان اور ان سے منسوب باؤلی کے تمام آثار مٹ چکے ہیں اور اب اس جگہ ایک پورا محلّہ آباد ہو گیا ہے، جو چھتّہ حکیم آغا جان عیشؔ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محلّہ کئی سو گز مربع قطعۂ زمین کو محیط ہے۔ دلّی کارپوریشن کے رجسٹر کے مطابق اس میں تیس مکانات ہیں (نمبر ۱۸۱۷ تا ۱۸۴۶)۔ ان میں مسجد بھی شامل ہے۔ چونکہ بعد کو بعض مکانات ایک دوسرے میں ضم ہو گئے، اس لیے اب مکانوں کی تعداد ۳۰ سے گھٹ کر ۲۰ رہ گئی ہے۔

جب حکیم صاحب کا مکان جس میں ان کے خاندان کے افراد مقیم تھے، کسی وجہ سے

۴۔ مکان کی یہ تفصیل مرزا فرحت اللہ بیگ نے عیشؔ کی پوتی کی روایت سے بیان کی ہے (مضامین فرحت ۲، ۱۹۷۱)

ان کے قبضے سے نکل گیا اور اس کی حالت مخدوش ہوگئی تو اسے گرا کر نئے آبادکاروں نے اس کے مختلف حصّوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت اس میں ایک باؤلی بھی تھی جس سے اہلِ محلّہ اپنی ضرورت کا پانی حاصل کرتے تھے۔ بعد کو اس باؤلی کو بند کرکے اس پر بھی مکان تعمیر کرالیا گیا[5]

اس صدی کے آغاز میں حکیم آغا جان کے مسکن کی یادگار صرف اس کا پھاٹک رہ گیا تھا۔ بعد کو اس لداوی دروازے کو بھی مخدوش قرار دے کر دلّی میونسپلٹی نے اسے منہدم کرادیا۔ البتہ دونوں طرف کی دیواریں چھوڑ دی گئیں تھیں۔ محلّے والوں نے ۱۹۷۴ء کے بعد ان آثار کو بھی ختم کرکے ان کی جگہ آہنی دروازہ لگا دیا۔

چھتّے کے لداوی پھاٹک کے انہدام کا واقعہ نہایت افسوسناک اور عبرت انگیز ہے۔ اس کی چھت اتنی سنگین اور مضبوط تھی کہ کدالوں کے منہ پھرے جاتے تھے، لیکن وہ ٹوٹتی نہ تھی۔ صاحبِ "واقعات دارالحکومت دلی" بشیر الدین احمد دہلوی کے ایک عزیز عبدالعزیز نامی صبح دس بجے ادھر سے گزر رہے تھے یہ منظر دیکھ کر مزدوروں کو مخاطب کرکے شیخی سے کہنے لگے:

"اسے میاں کیا تماشا بنا رکھا ہے! لاؤ مجھے کدال دو، میں آغا جان کا سر توڑ دوں"

یہ کہا اور مزدوروں سے کدال لے چھت پر چڑھ گئے۔ زور شور کے ساتھ دو تین ہی کدالیں لگائی ہونگی کہ چھت کا وہ حصّہ اس طرح ٹوٹا کہ خود عبدالعزیز اس کی لپیٹ میں آگئے۔ ان کا نچلا دھڑ اس میں اس بری طرح پھنسا کہ فوری طور پر انھیں اس سے نکالنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔ بیچارے کئی گھنٹے اسی عالم میں معلّق رہے۔ بہ ہزار خرابی جب اس شکنجے سے نکالے گئے تو دونوں ٹانگیں چور چور ہوچکی تھیں۔ انھیں طبّی امداد کے لیے دلی کے صدر اسپتال لے گئے، جہاں اسی شام ان کا انتقال ہوگیا[6]

اس وقت (۱۹۸۷ء) اس محلے کی سب سے قدیم ساکن شہزادی قمر سلطان صاحبہ

۵۔ بیان شہزادی قمر سلطان صاحبہ

۶۔ واقعات دارالحکومت دہلی، ۲ : ۱۷۲۔۱۷۳

دبنت شہزادہ فرخندہ جمال ابن فتح الملک میرزا غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو مرحوم) ہیں۔ میرزا فخرو بہادر شاہ ظفر کے فرزند اور آخری ولی عہد تھے۔

شہزادی قمر سلطان صاحبہ کا حافظہ بہت اچھا اور قابلِ رشک ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت وہ پچانوے کے پیٹے میں ہیں۔ لیکن وہ بھی یہ بتلانے سے قاصر ہیں کہ عیش کے خاندان نے اس مکان سے کب ہجرت کی اور کیوں۔ اس محلے میں ایک مسجد بھی حکیم آغاجان سے منسوب ہے۔ اس کے ذیل میں بشیر الدین احمد لکھتے ہیں؁

> یہ مسجد اہتمام علی خان کوتوال برادر فولاد خان کی بنوائی ہوئی ہے۔
>
> اس کا چبوترہ بھرتی میں آگیا ہے۔
>
> اہتمام خان شاہ جہان کے دربار کا امیر تھا پہلے وہ بارہ ہزاری منصب دار اور پانسو سواروں کا افسر تھا۔ بعد میں دو ہزار دو صدی اور آٹھ سو سوار اور دو دفعہ کوتوالی کی خدمت ملی۔ اس کا انتقال ۱۰۵۷ھ مطابق ۱۶۴۷ء میں ہوا۔

یہ مسجد حکیم آغاجان کے نام سے کیونکر منسوب ہوئی۔ اس کا ذکر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال یہ مسجد آج بھی حکیم آغاجان کے چھتے میں موجود ہے۔

یہ مسجد تقریباً ڈیڑھ سو مربع گز زمین پر بنی ہوئی ہے۔ پہلی منزل زمین دوز ہے۔ جس میں بڑے بڑے ہال ہیں۔ شہزادی قمر سلطان کے بیان کے مطابق اس صدی سے قبل اس میں مکتب قائم تھا۔ پھر نہ معلوم کیوں، اسے بند کر دیا گیا۔ اِدھر ایک عرصہ دراز کے بعد پہلی منزل کو کھول کر صفائی کرائی گئی ہے اور اس میں کچھ کرایہ دار بس گئے ہیں۔ دوسری یعنی درمیانی منزل گلی کی سطح سے بلند ہے اور کافی اچھی حالت میں ہے اس میں بیک وقت ۶۰۔۷۰ آدمی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

زندگی کے معمولات:

عیش کا معمول تھا کہ صبح ضروریاتِ زندگی اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر

۷۔ واقعات دار الحکومت دہلی، ۲ ۳۴۳

دیوانخانے کے دالان میں آگے بیٹھ جاتے۔ یہ حصہ عرفِ عام میں مطب کہلاتا تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق یہاں بیٹھنے کے لیے تخت کے چوکوں کا انتظام تھا۔ چوکوں پر سفید دودھ جیسی اجلی چاندنی بچھی رہتی۔ چوکے کے ایک حصے میں قالین اور اس پر گاؤ تکیہ ہوتا۔ حکیم صاحب گاؤ سے ٹیک لگائے، صدر نشین ہوا کرتے تھے۔

عیش صبح سے دوپہر دن تک آنے والے مریضوں کا معائنہ کرتے۔ مریض کا حال سنتے اور نسخہ لکھتے۔ اس کے بعد جب فرصت ہوتی تو وہیں مطالعے یا شعر و شاعری کے مشغلے میں مصروف ہو جاتے۔ کچھ وقت اس میں گزرتا۔ پھر تسبیح سنبھال کر شام تک وظائف میں گزارتے۔ کبھی کبھار شام کو بھی مریضوں کو دیکھ لیتے۔

اس اثنا میں دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کی تالیفِ قلوب کا فرض بھی انجام دیتے۔ یوں رات کے گیارہ بجے تک دیوانخانے کی رونق بڑھاتے۔ پھر محلسرا میں تشریف لے جاتے۔ کھانا کھاتے اور سو رہتے۔ کھانا چوبیس گھنٹے میں صرف ایک دفعہ نوش فرماتے تھے۔

معمولات میں پابندی کی بدولت آخری عمر تک جسمانی قویٰ میں کوئی فرق ظاہر نہ ہوا۔ نہ کبھی ضعفِ بینائی کی شکایت کی، نہ دانتوں کے ہلنے کی۔

سراپا اور لباس:

محمد حسین آزاد نے عیش کا حلیہ اپنے مخصوص انداز میں یوں تحریر کیا ہے[8]:

"میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں ملل کا کرتا جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔"

آزاد نے عیش کا جو سراپا پیش کیا ہے وہ غالباً اس زمانے کا ہے، جب وہ جوانی سے اتر چلے تھے۔ آخر عمر میں ان کی وضع کا اندازہ عیش کی پوتی (یعنی حکیم مرزا جان

۸۔ آبِ حیات : ۴۸۱

کی بیٹی) نے یوں بیان کیا ہے:[9]

بہت اونچا قد، نہایت سرخ و سفید رنگ، نیچی گول بھرواں ڈاڑھی، کتابی چہرہ، منڈا ہوا سر، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، شکل پر نور برستا تھا۔ ہمیشہ نیچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ آستینوں کے چاک کہنی تک کٹے ہوئے۔ کرتا تمام عمر انھوں نے کبھی نہیں پہنا۔ جاڑے میں فرغل یا دگلا استعمال کرتے تھے۔ فرغل تو عموماً مومی چھینٹ کی ہوتی تھی، مگر دگلا اکثر اونی کپڑے کا ہوتا تھا۔ ایک بر کا پیجامہ۔ پاؤں میں بھرواں چوڑے پنجے کی ریشم کے کام کی جوتی۔ ہاتھ میں سبز رنگ کی جریب۔

محمد حسین آزاد اور عیش کی پوتی کے بیانات میں بہت کم فرق ہے۔ بظاہر دو باتیں متضاد اور مختلف نظر آتی ہیں۔ ایک قد و قامت، دوسرے لباس۔

جہاں تک لباس کا تعلق ہے تو وہ عمر اور ضروریات کے مطابق بدل بھی جایا کرتا ہے، لیکن میانہ قد، دراز قامتی میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ آزاد کا بیان درست ہے یا عیش کی پوتی کا، یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی کے مسلم خاندانوں میں عورتوں کے پردے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور شرفا کے زنانخانوں تک انھیں افراد کی رسائی ہوتی تھی، جو خاص الخاص عزیز ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں عیش کی پوتی کے بیان کو اس روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ جو اعزۂ عیش کے اندرونِ خانہ مستورات کے سامنے آتے ہونگے، ان افراد کے مقابلے میں عیش کا قد دراز اور اونچا ہوگا، جسے انھوں نے "بہت اونچا قد" سے تعبیر کیا ہے

اسبابِ معیشت:

عیش کا تعلق ابتدا میں آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ کے فرزندِ دوم شاہ رخ مرزا

۹۔ مضامین فرحت، ۲ : ۲۰۰

سے تھا۔ وہ شاہزادے کے ذاتی معالج کی حیثیت سے ان کی ڈیوڑھی سے وابستہ تھے۔

بادشاہ کو اپنے ان بیٹے سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ جب وہ دیوانِ خاص میں دربار منعقد کرتے اور تخت پر جلوہ فرماتے، تو ولی عہدِ سلطنت کے پہلو بہ پہلو شاہ رُخ مرزا بھی دربار میں موجود رہتے تھے۔ اس کی تصدیق خود عیشؔ کے ایک قصیدے کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

ہیں آگے سب سے ولی عہدِ عصر تخت کے پاس
بزیرِ سایۂ ظلِّ خدائے باافضال
اور ان کے پاس کھڑے ہینگے شاہ رُخ مرزا
بصد متانت و تمکین و عزت و اجلال

ایک دوسرے قصیدے میں جو شاہ رُخ مرزا کی مدح ہی میں کہا ہے، اس میں شاہزادے کے جاہ و حشم کا نقشا بھی کھینچا ہے۔ شاعرانہ غلو سے قطعِ نظر، جو قصائد کا عمومی خاصّہ ہے، اس قصیدے سے شاہ رُخ مرزا کے شخصی اوصاف و رجحانات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً شہزادے کے مزاج کو فنونِ حرب سے ربطِ خاص تھا، اس لیے وہ تلوار کو عزیز رکھتے تھے۔ ان کو شہ سواری کا بہت شوق تھا، اور ان کے اسپِ خاص کا نام فلک سیر تھا۔ جس ہاتھی پر سوار ہو کر شاہزادہ برآمد ہوتا تھا، اس کے ہودے اور جھول میں جواہر ٹکے تھے۔

اگرچہ عیشؔ شاہ رُخ مرزا کی سرکار سے وابستہ تھے لیکن آمدنی کی صورت قابلِ اطمینان نہ تھی، شاہزادے کی سرکار میں تنخواہ کی ادائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ اور اِدھر عیشؔ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کی شکایت برملا ان کے سامنے پیش کر سکیں۔ اسی لیے انھوں نے قصیدہ پیش کر کے دبی زبان میں اس کا اظہار کیا:

ترے ہی ناخنِ تدبیر سے جہان میں آج
کھلے ہیں عقدۂ کارِ جہاں، خدا کی قسم!
اب آگے عرض مری تجھ پہ آپ روشن ہے
زبان پر نہیں لایا، اسی سے، ہے مبہم

پر اتنی عرض ضروری ہے، سب رہیں سر سبز
میں تشنہ کام رہوں اک، زہے سحابِ کرم

خدا معلوم، اس عرضِ مدّعا کے بعد عیشؔ کی تنخواہ کی ادائی کی کیا صورت نکلی۔ البتہ قصائد و قطعات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب عیشؔ کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی، تو کسی نہ کسی طرح انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں اپنا حالِ زار عرض کیا۔ بادشاہ کی جانب سے دادرسی ہوئی تو بطورِ شکریہ ایک طویل قطعۂ مدحیہ پیش کیا۔ اس میں اپنے گزشتہ حالات اور بادشاہ کے لُطف و عنایات کا تذکرہ بہت حُسن و خوبی سے کیا ہے:

ادائے شکر تو معلوم، سرگزشت اپنی
بیان کرتا ہے تھوڑی سی یہ غلامِ حضور
نہ ہوتی تیری عنایت، تو میرا شیشۂ دل
کیا تھا سنگِ حوادث نے صاف چکنا چور
ہجومِ غم سے، یہی بس فلک نے چاہا تھا
کہ میرے دل کو بنا دیوے خانۂ زنبور
مگر تفقّدِ عالی نے تیرے، ہی شاہا!
گزند اس کا رکھا میری جان و تن سے دور
بچا ہوں تیرے کرم سے، نہیں فلک کو، مرا
ہوا تھا سرمہ کی مانند پیسنا منظور
کیا تھا اس نے غرض اس جہاں کے عرصے کو
ترے غلام پہ بس تنگ مثلِ تنگیِ گور
بچا ہوں نیکیِ نیت سے میں تری، ورنہ
بدی میں اپنی تو اس نے نہیں کیا تھا قصور
یہ چرخِ شعبدہ گر میرے روزِ روشن کو
بنانا چاہتا تھا خسروا، شبِ دیجور

یہ، آفتابِ عنایت کے تیرے پرَ تو سے
بسانِ شب پرَہ کے، رہ گیا، بِسُور بِسُور
شہا ترے ہی شفا خانۂ عنایت سے
جہان جانے ہے، اچھا ہوا ہے یہ رنجور
اور ان عنایتوں کے ما سوا ہوا یہ کرم
نہ کیونکہ عرض رسا ہوں بحکمِ فیض نشور
ملا عُلوفہ ترے خانہ زاد کو، شاہا!
تصدّقِ سرِ اقدس، موافقِ دستور
علاوہ اس سے، عنایت ہوئی غلام پہ پھر
کہ جس کا حال ہے اس قطعہ میں ہوا مذکور
جنابِ میرزا فرخندہ شہ کی خدمت میں
کیا حضور نے جب خانہ زاد کو مامور

اس سے خیال ہوتا ہے کہ جس زمانے میں ابھی ان کا شفا خانۂ شاہی سے تعلق قائم نہیں ہوا تھا، اسی دوران کچھ ایسا پیچ پڑا کہ انھیں اپنی جان و آبرو دونوں خطرے میں نظر آئے۔ آخر یہ روح فرسا مرحلہ بادشاہ کی "مداخلت" سے سر ہوا اور وہ شفا خانۂ شاہی سے منسلک ہو کر بادشاہ کی جانب سے میرزا فرخندہ شاہ کے ذاتی معالج کی حیثیت سے مامور کر دیے گئے، اور ان کی گزر بسر کے لیے شاہی خزانہ سے "عُلوفہ" بھی مقرر ہو گیا۔

ان کی پوتی کا بیان ہے کہ جب طبیب شاہی مقرر ہوئے تو ایک دن بیچ کر کے عیش کے لینے کو قلعہ سے پالکی آنے لگی۔ یہ قلعہ جاتے، بادشاہ سلامت کی خدمت میں مجرا عرض کرتے۔ کبھی کوئی مریض ہوتا تو اس کا معاینہ کر کے نسخہ تجویز کرتے اور پھر مکان واپس آجاتے۔[10] بہادر شاہ کی پنشن کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ ماہانہ تھی۔ لیکن خاندانِ شاہی اتنا بڑا

۱۰۔ مضامین فرحت، ۲: ۱۹۹

تھا اور داد و دہش کا وہ اہتمام کہ یہ رقم بمشکل ان کے اخراجات کی کفالت کرتی تھی۔ مجبوراً باقی خرچ زرِ جواہر بیچ کر پورا کیا جاتا تھا۔ "ایک بادشاہ جس رکھ رکھاؤ سے رہتا ہے اس میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا۔" غرض ان کے اخراجات اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا اس کے باوجود بہادر شاہ نے اپنی بساط بھر تمام ملازموں کو اپنے گرد جمع رکھا۔ سب کی تنخواہ مقرر تھی جو ہر مہینے گھر بیٹھے مل جاتی۔ منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:[11]

جتنے اس کے ملازم تھے سب کی تنخواہ گھر بیٹھے پہنچتی تھی۔ فقط ان کی مُہر قلعہ میں جاتی تھی وہی ان کی تنخواہ لے آتی تھی۔ ساری عمر میں شاید ہی کسی نوکر کو موقوف کیا ہو۔

لیکن بادشاہ کے حسنِ نیت اور انتظام کے باوجود تنخواہ کی ادائی میں کبھی کبھی تاخیر ہو جاتی۔ جب ادائی کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی تو عمّال اس کی تقسیم میں جنبہ داری سے کام لیتے جس سے ملازموں اور مستحق افراد کو طرح طرح کی پریشانیاں لاحق ہو جاتیں۔

عیشؔ جب پہلے پہل اس مصیبت میں گرفتار ہوئے تو بہت گھبرائے۔ آخر کار خامۂ سخن سنبھال کر اس کی تدبیر میں مصروف ہوئے۔ ایک بہاریہ قصیدہ بادشاہ کی مدح میں کہا۔ اس میں دعائیہ اشعار کے بعد اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں:

خدا نے ذات بنائی ہے اس کی مستغنی
اسے بس اور کسی شے کی کچھ نہیں پروا
مناسبت ہو طبیعت کو تیری شعر سے گر
تو چند شعر دعائیہ کہہ کے تو لے جا
میں عرضِ حال کو اپنے سمجھ کے سوئے ادب
زباں پر نہیں لایا ہوں رُو برو شاہا!
مگر یہ عرض کہ بے اس کے زندگی ہے محال
رُکا ہے اگلے مہینے سے میرا درماہا

11- تاریخ ہند (ذکاء اللہ)، ۲ : ۱۴۶

خدا ہی جانے کہ یہ کس نے گُل کھلایا ہے
مجھے خبر نہیں، در یافت کر تو، دادرسا

معلوم ہوتا ہے کہ اس عرض معروض کی بدولت کچھ دن کام کاج ٹھیک طور پر چلتا رہا۔ لیکن دوبارہ پھر ایسی ہی صورت پیش آئی۔ مرتا کیا نہ کرتا، پھر آزمودہ نسخہ آزمانا پڑا۔ لیکن اب کے تیور کچھ اور ہیں۔ مدح و ثنا کے بعد اہلکارانِ شاہی کی بدعنوانیوں کا ذکر ذرا سخت لہجے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہر اک بشر کو تیرے عصر میں ہے آسایش
جو لیجے نام ستم، ہے یہ ننگ و عار اب کے
خلاصہ اس کا یہی ہے کہ گردشِ افلاک
ہے تیرے ڈر سے جہاں میں بیک قرار اب کے
پر اک کھڑ پنچ ہے مجھ سے کہ، دو مہینے سے
یہی کہے ہے کہ تو خرچ کر اُدھار اب کے
اور اس کے ساتھ فلانے کو ہاں میں ہاں دیکھو
ہوئے ہیں یک صد و ہفتاد و پنج بار اب کے
سو بانٹ لیتے ہیں سرکار سے تبرّک جو
ملے ہیں اس کو، مہینے ہوئے ہیں چار اب کے
نہ ڈر خدا کا، نہ دہشت تری، معاذ اللہ!
غرض بڑے متدیّن ہیں اہلِ کار اب کے
اگر ہیں ڈھنگ یہی اُن کے، اور یہی کوتک
تو دل میں اپنے وہ یہ کر رکھیں بچار اب کے
دُعا کا تیر ہے، واللہ نہیں یہ ڈوم کا تیر
ہوا ہی سمجھیں یہ جان و جگر کے پار اب کے

سو داد خواہ ہوں میں تجھ سے، اس کے کانوں کو
مروڑ دے تو ذرا شاہِ نامدار اب کے
نہ دیگا داد اگر تو، تو ہے امید قوی
کہ ان کو چھوڑ نہ دیو یگا کردگار اب کے

قصیدہ تو قصیدہ ہے۔ اس کے پیش کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش کرتے اور اس کے نظم کرنے کے لیے بھی کچھ وقت درکار ہوتا۔ لیکن "علوفہ" کی بیقاعدہ ادائی گویا روز کا معمول بن چکی تھی جس کے باعث وہ ہمیشہ پریشان رہتے۔ اس لیے بات بڑھتے بڑھتے قطعات اور غزل تک آگئی۔ وہ ان اصنافِ سخن میں بھی کبھی کنایے سے، کبھی کھلے لفظوں میں اپنا حالِ زار اور شاہی اہلکاروں کی کارگزاریوں کا کچا چٹھا بادشاہ کے گوش گزار کرنے لگے۔

تیرے دروازے پہ پھرتے ہیں پڑے ناکام ہم
اس طرف بھی دیکھنا، اے بندہ پرور چاہیے
تنگدستی کا نہ لا شکوہ زباں پر، زینہار
یوں بھی ہوتا ہے جہاں میں، دل تونگر چاہیے

تجھ کو، اے دل! ہوسِ زر، کبھی ایسی تو نہ تھی
اور جان اس لیے مضطر، کبھی ایسی تو نہ تھی
اس زمانے میں جو ہے اہلِ ہنر پر تکلیف
آگے عیش! اہلِ ہنر پر، کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ دیکھو کجروی، باوصفِ ارشادِ حضور اب تک
فلک کو کام میں میرے وہی امروز و فردا ہے
زباں رکھتا ہوں پر حضرت کے آگے اس لیے چپ ہوں
کہ روشن دل کے آگے خامشی عرضِ تمنا ہے

الغرض اسی طرح سے لشتم پشتم گزر اوقات ہوتی رہی ۔

ریاست جھجّر کی ملازمت :

فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے:[12]

نواب صاحب جھجّر کے ہاں ملازم تھے۔ بس نام کے ملازم تھے، کبھی ضرورت پڑی تو چلے گئے، نہیں تو گھر بیٹھے تنخواہ لیتے تھے۔

لیکن معاصر تاریخ جھجّر[13] میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا، حال آں کہ اس میں اور اطبّا کے نام صراحت سے دیے گئے ہیں۔ یوں بھی یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ دربارِ شاہی سے وابستہ رہتے ہوئے کسی دوسری ریاست (اور وہ بھی جھجّر) میں ملازم ہو گئے ہوں۔ ایسا اقدام بجا طور پر گستاخی اور بہادر شاہ کی ہتک تصوّر کیا جاتا۔

ہاں، یہ ممکن ہے کہ کسی خاص موقع پر وہ نواب جھجّر کے علاج کے لیے (بہادر شاہ کی اجازت سے) وہاں گئے ہوں۔ جھجّر کی مستقل باقاعدہ ملازمت کا امکان بہت کم ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے علاوہ اور کسی نے یہ لکھا بھی نہیں۔

بہر حال عیش کے معاشی مسایل کے یہ تذکرے بھی، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اور ایک عیش ہی کا کیا ذکر، اس تحریک کے عمل اور ردِّ عمل کے نتیجے میں سارے ملک کا معاشی نظام تہ و بالا ہو گیا۔ دلّی اور دلّی والوں پر بھی قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔

دِلّی کی تباہی (۱۸۵۷ء) :

دلّی کے برباد ہونے کا منظر عیش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک فارسی قطعہ میں

۱۲۔ مضامین فرحت، ۲: ۱۹۸

۱۳۔ تاریخ جھجّر مصنفہ ابوالاعجاز منشی غلام نبی میرٹھی تحصیلدار (مطبع فیض احمدی، مطبوعہ جولائی ۱۸۶۷ء)

جو بہادر شاہ کی وفات کی تاریخ میں کہا تھا، دہلی زبان سے اس بربادی کے اسباب کا ذکر بھی کیا ہے:

شاہ دہلی کاں بہادر شاہ بود	جانشینِ حضرتِ تیمور لنگ
ماجرائے طرفہ شد از فوجِ خویش	حاکماں را از قضا افتاد جنگ
رو بسوئے حضرتِ دہلی نہاد	جوق جوق از فوج با توپ و تفنگ
ماند کشت و خون باہم چند ماہ	خلق را زیں ماجرا شد عقل دنگ
شد چوں فتح حاکماں بر فوجِ خویش	شاہ را کردہ مقید بعد جنگ

اس تصادم کا نتیجہ ایسا ہولناک ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ ہو گا۔ شاہراہیں عوام کے خون سے رنگین ہو گئیں۔ بازار ویران ہو گئے۔ لاکھوں کروڑوں کا مال سامان تہس نہس ہو گیا۔ مکانوں کی بنیادیں کھد گئیں۔ بیشتر مکینوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ طوفان کی زد میں وہ علاقہ بھی آ گیا، جہاں عیش کا قیام تھا۔ چیلوں کے کوچے میں بھی ہر شخص نفسا نفسی میں مبتلا ہو گیا۔ جس کا جدھر منھ اٹھا، وہ ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ چیلوں کے کوچے پر جو قیامتیں ٹوٹیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ منشی ذکاء اللہ کے الفاظ میں راشد الخیری نے یوں نقل کیا ہے[۱۴]:

> نواب شبیر جنگ کے بیٹے محمد علی خان یا حکیم فتح اللہ خان نے کسی سپاہی (گورے) کو جو اُن کے زنانہ میں گھس گیا تھا، زخمی کیا، یا وہ مر گیا۔ اس جُرم کی سزا اس وقت جو کچھ ہوتی کم تھی۔ حکم ہوا کہ کوچۂ چیلان کے تمام مردوں کو مار ڈالو یا پکڑ لاؤ۔ چنانچہ کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں ایک آدھ مرد نہ مارا گیا ہو۔ کچھ زندہ گرفتار ہو کر پیش کیے گئے، جن کے واسطے یہ فیصلہ ہوا کہ قلعہ کے سامنے جمنا کی ریتی میں گولی سے مارے جائیں۔ چنانچہ شام کے وقت اُن کو گولی ماری گئی۔ ان میں دو آدمی زندہ رہے اور

۱۴۔ نوبت پنج روزہ : ۱۳۴

بھاگ کر جمنا میں کود ے۔ ایک مولوی وزیرالدین، مولانا صہبائی کے بھانجے اور خویش تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی جو گولی کی باڑھ سے مارے گئے، اسی گردہ میں تھے۔

ان کی موت پر نواب صدرالدین خان آزردہ فرماتے ہیں:

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بیجرم جو صہبائی ہو

ایک دوسرے چشم دید گواہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں:[15]

جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے ان میں کئی اشخاص باکمال، نام آور فردروزگار مارے گئے ہیں۔ جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ میاں محمد امیر پنجہ کش جن کا ثانی روے زمین پر نہیں۔ مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے، اور نیاز علی واقعہ خوان اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف لوگ۔ اس محلّے کے چودہ سو لوگوں کو راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پر لے جاکر بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں پھنکوادی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچّوں سمیت کنویں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ باقی اور اضلاعِ شہر کا یہ حال ہوا کہ عورات اور مردوں کو شہر سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازے سے باہر کیا۔ اور عورات کو کابلی دروازے کی راہ سے شہر بدر کیا گیا کہ باہمی مفارقت ہوگئی۔

خدا معلوم، عیش چیلوں کے کوچے کے اس طوفان سے کیونکر زندہ سلامت نکلا

۱۵۔ داستانِ غدر : ۱۲۸

سکے۔ اور یہاں سے نکل کر کہاں گئے، کس کی پناہ میں رہے، بیوی اور بچوں کے آذوقہ اور حفاظت کا کیا انتظام کیا، اس کا ذکر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن دلی، پھر دلی تھی، کہیں بھلانے سے بھلائی جا سکتی تھی! ان کے دیوانِ دوم میں دو ایک جگہ اس کا ذکر ملتا ہے:

بتاؤ آ کے وطن میں بھلا لگے دل کیا
جب عیشؔ، ہو گیا یاروں ہی سے وطن خالی

کہے ہیں سب احباب، دہلی کو چلیے
رہی ہے کہاں اب وہ جانے کے قابل

جب گلی میں ہو گزر بادِ صبا کا مشکل
کس طرح کوئی خبر جا کے وہاں سے لاوے

بسانِ نقشِ قدم اس گلی میں مر مٹیے
ارادہ دلِ ناکردہ کار ہے، تو یہ ہے

اس دربدری کے عالم میں اور اپنی بیگناہی کے یقین کے باوجود دوبارہ دلی واپس جانا موت کو دعوت دینے سے کم نہ تھا۔ عیشؔ دلی کے لیے موت قبول کرنے کے لیے بھی تیار تھے لیکن دلی سے جب کوئی تازہ خبر آتی تو ان کی ہمت ٹوٹ جاتی۔

ستم تو یہ کہ بنی عاشقوں کی جان پہ ہے
اور اس پہ ان کا مزاج اب تک امتحان پہ ہے

دوسری طرف نئے حکام کی خوشنودی حاصل کرنے والے مخبروں سے بھی دل ڈرتا تھا:

رات دن مجھ کو یہ ڈر ہے کہ مری جانب سے
کان بھر اس کے کوئی دیکھیے غماز نہ دے

ہوگئی غیرتِ بانگارِ منیٰ
اب وہ صد حیف سرائے دہلی

بارے، خدا خدا کرکے دلّی والوں کا زمانۂ بے خانمانی ختم ہوا۔ ملکۂ انگلستان کے حکم پر انگریز حکّام کی جانب سے امن و امان کے ساتھ سلامتیِ جان کا اعلان ہوا جس کے بعد وہ بدنصیب کوچہ گرد جو جان و آبرو کے خوف سے مختلف مقامات کو منتقل ہو گئے تھے، دلّی واپس آنے لگے۔ انھیں باز گشت کرنے والوں میں عیش بھی تھے۔

عیش دلّی آئے تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ محلّے کھیت ہو چکے تھے۔ بازار میدان بنے ہوئے تھے۔ امرا اور رؤسا کی جایدادوں میں سے بیشتر پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ دلّی کا دل اور دلّی شہر کی رونق جامع مسجد انگریزوں کے قبضے میں تھی۔ اور اس کے دروازوں پر تالے پڑے تھے۔ اس کشمکش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عمائدِ دہلی کوشاں تھے۔ آخر ان کی مساعی کامیابی سے ہم آغوش ہوئیں اور چند شرائط کے ساتھ جامع مسجد ۲۴ نومبر ۱۸۶۲ء (۱۲۷۹ھ) کو مسلمانوں کو واپس دے دی گئی۔ دلّی کے دوسرے باشندوں کی طرح عیش کو بھی اس سے مسرت ہوئی۔ انھوں نے مسجد کے واگزاشت ہونے کی تاریخ کہی۔ پوری تاریخ تدخلہ و تخرجہ کے بغیر نکلتی ہے:

زچندے مسجدِ جامع شدہ بود
بحکم حاکمانِ عصر مفروق
رہا کردند بازش، سالِ تاریخ
بجو یند از "عبادت گاہ مخلوق"

جامع مسجد کے واقعہ سے عیش کے قلبی تعلق کا عکس اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مسجد کے واگزار ہونے کی متعدد تاریخیں کہی ہیں جن میں سے ایک اردو قطعہ کا مصرعِ تاریخ ہے:

سالِ ظہور اس کا ہے "نورِ تبرّکات" (۱۲۷۹ھ)

اس سے ان کے معتقدات پر بھی روشنی پڑتی ہے

مذہبی رجحان:

روزی کی طرف سے بیفکری تھی۔ مطب کامیابی سے چل رہا تھا۔ لال قلعے کے تعلق نے دنیوی وقار اور جاہ و منزلت کے علاوہ، مزید "علوفہ" بھی مہیا کر دیا تھا۔ شاعری کا شوق ہوا، تو استاد تین تین پشت تک صوفی اور اہل اللہ۔ ایسے میں لابد تھا کہ عیشؔ کا بھی مذہب کی طرف رجحان ہو جاتا۔ مطب سے فرصت ملتی اور شعر گوئی کی خواہش نہ ہوتی، تو تسبیح ہاتھ میں لے، اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اللہ اللہ کرنے لگتے۔ اسی لیے وہ سب بزرگانِ دین کو ادب اور احترام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک جگہ اس کی توجیہہ کی ہے:

محبت اولیا اللہ کی، آتی ہے کام آخر
کہ ان کے نام میں، اللہ کا آتا ہے نام آخر

چنانچہ ذاتی طور پر وہ حضرت غلام محمد شاہ عرف مسکین شاہ صاحب کے مرید ہو گئے۔ انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو حال پہ میرے کر توجہ ، یا پیر! ‏ رہتا ہوں میں فکر سے نہایت دلگیر
کر حق میں دعا میرے کہ ہوں میں لاچار ‏ بن آتی نہیں ہے مجھ سے کوئی تدبیر

ان کی زندگی بھر ان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ۱۲۷۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کی تاریخِ وفات کہی۔ کس طرح اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں:

کرد رحلت زیں جہاں حضرتِ مسکین شاہ
خارِ غم در دل خلید، از رحلتِ آں نیک ذات
عیشؔ چوں سالِ وفاتش خواست از پیرِ خرد
"واصلِ ذاتِ الٰہی" گفت تاریخِ وفات

(۱۲۷۴ھ)

ان کا ایک مقطع ہے:

جنابِ شاہ غلام علی، ولی اللہ
خدا کے فضل و کرم سے ہے عیشؔ! پیر اپنا

خدا معلوم یہ غلام نبی اور غلام محمد ایک ہی شخص ہیں، یا دو الگ الگ بزرگ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت غلام محمد شاہ کی وفات کے بعد انھوں نے حضرت غلام علی کسی بزرگ سے رشتۂ ارادت استوار کر لیا ہو۔

اہل اللہ سے ارادت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ انسان خوش گمان اور تمام فقرا کا معتقد ہو جائے۔ عیشؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہوگا یا وہ کسی فقیر سے سختی اور گستاخی سے پیش آیا ہوگا۔ اسے کسی طرح فہمایش کرتے ہیں:

نہ کر فقیروں سے تو چھیڑ چھاڑ، دیوانے
نہ چھیڑ کر انھیں حق سے بگاڑ، دیوانے
تو اپنے حق میں نہ بو، ان کو چھیڑ کر کانٹے
یہ اپنے پیچھے نہ چمٹا تو جھاڑ، دیوانے
تو اپنی طرح سے، مردانِ حق کو مُردہ نہ جان
یہ مُردے وہ ہیں کہ ڈھادیں پہاڑ، دیوانے
جو ان کی کرتا ہے کوئی جہان میں توہین
حق اس کو دیتا ہے جڑ سے اکھاڑ، دیوانے
جو غیرِ حق انھیں سمجھے ہیں، عیشؔ! ان کو سمجھ
کہ حق نے اُن کو بنایا ہے آڑ، دیوانے

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ اس لیے کوئی اپنے پیر و مرشد سے محبّت کرتا ہوا بھی حُبِّ رسول و آلِ رسول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عیشؔ نے بھی جا بجا اس کا اظہار کیا ہے۔ دیوانِ اوّل کی پہلی غزل حمد میں اور دوسری نعت میں ہے۔ اس کا مقطع ہے:

رونقِ زباں ہے یہاں، اسمِ پاک اس شہ کا
عیشؔ! ہو سکے کیونکر کوئی مہرباں اپنا

اسی دیوان میں ایک غزل میں یہ قطعہ شامل کیا ہے:

وہ آپ جیسا شہنشاہ ہے کریم و رحیم
کیا ہے چھانٹ کے ویسا ہی بس وزیر اپنا
ہے اس کا اسمِ مبارک محمدؐ عربی
وہی شفیع ہے، بس، روزِ دار و گیر اپنا

دیوانِ دوم میں ایک نعتیہ قصیدے کے علاوہ مستقل نعت بھی موجود ہے۔ ایک

غزل کا مقطع ہے:

نہ کھاؤ تم غمِ دنیائے دوں مگر، ہاں، عیشؔ — جو کھاؤ غم، تو غمِ آلِ مصطفیٰ کھاؤ

مذہب سے لگاؤ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یہ اصحاب کثرت سے قرآن وحدیث اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے جب شعر کہتے ہیں، تو بے ساختہ قرآن کی آیات یا ان کے ٹکڑے اور احادیث کے تراجم ان کے کلام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ عیشؔ نے بھی بعض جگہ ایسا کیا ہے۔ قرآن میں ہے: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر ۳۹-۵۳) عیشؔ کہتے ہیں:

یہ جب "لاتقنطو من رحمت اللہ" نے فرمایا — تمسک عاصیوں کو ہو گیا مضمون اس آیت کا

عیشؔ کی ایک رباعی ہے:

یہ جیفۂ دنیوی ہے افسانہ و خواب — تو اس کی تلاش میں نہ ہو دیکھ، خراب
یہ بات تو ہو چکی نص سے ثابت — دنیا جیفہ ہے، طالب اس کا ہے کلاب

یہ کسی نصِ قرآنی یا حدیث کا مضمون نہیں ہے۔ بلکہ یہ ترجمہ ہے کسی بزرگ کے قول کا۔ ان کا ارشاد ہے:

الدنیا جیفۃ وطلابہا کلاب

ایک اور رباعی ہے:

اس عمرِ گراں بہا کو کیوں کھوتے ہو — غفلت میں پڑے ہوئے کیا سوتے ہو
یہ مزرعۂ آخرت ہے دنیا، اے عیشؔ! — کاٹو گے وہی، یہاں جو کچھ بوتے ہو

اگرچہ یہ قرآن کی ایک آیت پر مبنی ہے لیکن یہ بھی ترجمہ ہے کسی بزرگ کے ارشاد کا، جو یوں ہے: الدنیا مزرعۃ الآخرۃ

طبیعت کے اس رجحان نے جو سوز و گداز پیدا کر دیا تھا، اس کا اظہار اکثر ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ صرف ایک دعائیہ غزل دیکھیے۔ ایک ایک لفظ سے خلوص اور بےنفسی اور سپردگی ٹپکی پڑتی ہے:

جان پر میری کر کرم، یارب! — دور کر دل سے میرے غم، یارب!
بغض و کینہ کو، صفحۂ دل سے — دے مٹا میرے یک قلم، یارب!
ہم گنہ گار تیرے بندے ہیں — تجھ سوا کہویں کس سے ہم، یارب!
مونسِ جان و دل رہے میرا — ذکر تیرا، ہر ایک دم، یارب!
اور رہِ مستقیم پر تیرے — رہے ثابت میرا قدم، یارب!

عیشؔ تیرا ہے، دُور رکھ اس سے　　درد و رنج و غم و الم، یارب!

شریکِ حیات کا انتقال:

عیشؔ کے نظم کردہ قطعاتِ تاریخ میں ایک قطعے پر کوئی عنوان نہیں ہے، قطعہ ہے:

این عفیفہ چونکہ بگذشت از جہاں
سالِ تاریخش بجستم از پسش
ہاتفِ غیب از سر افسوس گفت
"خانہ خاک" ہست سالِ رحلتش
(۱۲۷۸ = ۱ + ۱۲۷۷)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ کسی خاتون کی تاریخِ وفات ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے کسی دوست کی بیوی کا انتقال ہوا، اور اس کی فرمایش پر اس کے لیے انھوں نے یہ تاریخ لکھ دی۔ لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ یہ تاریخ خود ان کی اپنی بیگم کی وفات پر کہی گئی ہو۔ اگر یہ دوسری بات صحیح ہو، تو کہنا چاہیے کہ ان کی بیگم کی ۱۲۷۸ھ میں رحلت ہوئی۔

احباب سے تعلقات:

عیشؔ کے اپنے ہمعصروں سے تعلّقات بہت خوشگوار تھے۔ غالبؔ جب اکبر آباد سے دلّی آئے ہیں، تو اُن کا طرزِ کلام بہت مشکل اور کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق تھا۔ بہت لوگ اس پر اعتراض بھی کرتے تھے، لیکن وہ اپنی روش پر اڑے رہے۔ انھی ایام میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں عیشؔ نے اپنی غزل میں ایک قطعہ کہا، جس کے مخاطب غالب تھے۔ کہتے ہیں:

زبانِ میرؔ سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے　　مگر اُن کی زباں، وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
اگر اپنا کہا، تم آپ ہی سمجھے، تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے، تم کہو اور دوسرا سمجھے

قیاس کیا جائے گا کہ اس کے بعد ان کے غالب سے تعلّقات خراب ہو گئے ہوں گے، یہ قیاس ٹھیک نہیں۔ عیشؔ نے ایک سخن گسترانہ بات کہی تھی، اور غالب نے بھی اسے

اسی رنگ میں لیا، اور اس سے کوئی مخالفانہ اور پایدار اثر قبول نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۸۶۴ء میں منشی جواہر سنگھ جوہر کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں عیش کے بارے میں لکھتے ہیں:[16]

میرے پچاس برس کے دوست ہیں، ان کو بھائی کے برابر جانتا ہوں۔

گویا وہ ۱۸۱۴ء کے زمانے سے ایک دوسرے کے دوست تھے اور جب ہی سے ان کے باہمی برادرانہ تعلقات تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب غالب نقلِ مکان کر کے آگرے سے مستقل طور پر دلّی چلے آئے تھے۔ اور اس کے بعد ہی وہ مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں عیش نے وہ غزل پڑھی، جس میں مندرجۂ صدر قطعہ تھا۔ غالب کے ان سے دوستانہ مراسم میں اس کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:[17]

زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت۔ جب دیکھو، یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف، اور لطیفہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں۔

اس طبیعت اور مزاج کا شخص لازماً مجلسی ہوگا، وہ کسی کا فطرتاً مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ محمد حسین آزاد ہی نے ایک لطیفہ لکھا ہے، جس سے عیش کے ذوق سے تعلقات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

دلّی میں کوئی صاحب تھے، جو ہر ایک ملنے والے کو گلوری پیش کرتے۔ اسی لیے میر گلوری کے عرف سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کے ختنہ کے بعد اس

۱۶۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مہر) ۲، ۳۴۴

۱۷۔ آبِ حیات، ۴۸۱ (حاشیہ)

کے غسلِ صحت کی تقریب میں احباب کی دعوت کی۔ ذوق اور عیش بھی مدعوین میں تھے۔ آزاد لکھتے ہیں[18]

حکیم آغا جان عیش، استاد (ذوق) سے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب سے گلوری لے کر کہا "آج تو دستِ مبارک سے گلوریاں کھلانی واجب تھیں" استاد نے کہا "ہاں ضیافت تو سنّت ہی تھی"۔ حکیم صاحب ہنسے اور کہا "حضرت! میر صاحب کی ظرافت کے نکتے کو کوئی کہاں تک پہلے۔ ختنہ کی دعوت کی۔ خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا"۔ استاد نے کہا "ظرافت پر ظرافت یہ کہ کھلایا بھی خصّی پلاؤ"۔[19]

غالب اور ذوق اس عہد کے مشاہیر میں سے ہیں۔ ان سے ایسے شگفتہ اور بے تکلفانہ تعلّقات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دوسرے احباب سے کیسے مراسم ہونگے۔

مفتی صدر الدین خان آزردہ بھی اس دور کے مشاہیر میں سے ہیں۔ کیا بحیثیت اپنے سماجی مقام کے اور کیا بلحاظ اپنے علم و فضل کے، وہ دلّی کے (بلکہ ملک کے) سر برآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ عیش کی ایک غزل میں ان سے متعلق یہ قطعہ ملتا ہے:

مفتیِ عصر، افصح الفصحا — وہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں
رو برو اس کے، لب بلاغت میں — کھولے سحباں، یہ اس کی تاب نہیں
ڈھونڈیے گر جہاں میں لے کے چراغ — اس سوا اور انتخاب نہیں
وہ محیطِ علوم ہے، اس سے — اور کو نسبتِ سراب نہیں
لیکن اس پر بھی وہ، بقولِ عیش — وہ ہے، جس کا کوئی جواب نہیں

ایک ایک لفظ سے ارادتمندی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ باہمی تعلّقات بہت خوشگوار ہونگے۔

۱۸۔ دیباچہ دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) : ۴۲

۱۹۔ خصّی پلاؤ اس پلاؤ کو کہتے ہیں جس میں گوشت کی جگہ چنے کی دال دم دیتے ہیں

آخری ایّام:

عیشؔ کے آخری ایّام سے متعلّق کوئی تفصیلی اطلاع دستیاب نہیں ہوتی۔ گمانِ غالب ہے کہ ذریعۂ معاش ان کا خاندانی پیشۂ طبابت تھا۔ مطب کرتے اور مریضوں سے جو یافت ہو جاتی، اسی پر بسر اوقات کرتے۔ ایک شعر میں اپنے مطب کی کامیابی کی طرف اشارہ کیا ہے کہتے ہیں:

پاکے صحت، تجھے دیتے ہیں دعا، عیشؔ بغریب
دیوے اللہ ترے ہاتھ میں تاثیر سوا!

لیکن ظاہر ہے کہ زندگی بہت دشوار ہوگی۔ ۱۸۵۷ء کی ناگہانی افتاد نے یہاں کے لوگوں کے، اور خاص طور پر اونچے طبقے کے شرفا کے جسم و جان پر جو زخم لگائے تھے، وہ آسانی سے مندمل ہونے والے نہیں تھے۔

زندگی محض دو وقت کے کھانے اور سر پر ایک چھت کے ہونے ہی کو نہیں کہتے۔ دل و دماغ کے اور بیسوں تقاضے بھی ہیں۔ جب تک یہ پورے نہیں ہوتے، نہ صرف زندگی نامکمّل رہے گی، بلکہ ایک مرحلے پر عذاب کی شکل اختیار کرے گی۔

عیشؔ کا شباب اور کہولت کا زمانہ جن علمی اور ادبی سرگرمیوں میں اہلے گہلے گذرا تھا، اور انھوں نے اپنے اِردگرد جو رنگ رلیوں کا ماحول دیکھا تھا، وہ "غدر" کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ وہ دنیا اور تھی، اب اس کی جگہ ایک دوسری دنیا نے لے لی تھی۔ ان کے بیشتر ہجولی اور دوست احباب عدم کو سدھار گئے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے، وہ کچھ ایسے بجھ کر رہ گئے کہ ان کا عدم اور وجود برابر تھا۔ ایسے میں بھلا زندگی کا کیا لُطف رہ گیا تھا۔ ان نئے حالات میں وہ یقیناً دل مسوس کر رہ جاتے ہونگے۔ لکھتے ہیں:

جز خداوندِ جہاں، حالِ دل اپنا، عیشؔ! اب
کس سے کہیے، دوستوں کے غم میں کیا تھا، کیا ہوا

ایک اور شعر میں اپنی بے بسی اور پریشانی کا اظہار یوں کیا ہے:

یاالٰہی ! یہ ہوا دنیا میں کیسا انقلاب
اک زمانہ گردشِ چرخِ کہن میں آگیا

اگرچہ ہمیں ان کے آخری ایام کے بارے میں کوئی قابلِ اعتماد اور لائقِ اطمینان معلومات حاصل نہیں ہیں، لیکن یقین ہے کہ یہ زمانہ بہت مشکل اور دل گرفتگی کا ہوگا۔

آخر وہ دن بھی آگیا، جو اٹل ہے۔ اور وہ اس سفر پر روانہ ہوگئے، جو بنی نوع انسان میں سے ہر ایک کو درپیش ہے۔ کوئی آگے، کوئی پیچھے، سب اسی منزلِ مقصود کی طرف جارہے ہیں۔

وفات :

مرزا فرحت اللہ بیگ نے عیش کی پوتی کی سند پر لکھا ہے[20] کہ وفات سے پہلے تپ محرقہ سے بیمار ہوئے اور اسی میں ہفتہ بھر بیمار رہ کر جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ انھیں نے مزید بتایا:[21]

جب وہ مرے اس وقت میرا سب سے چھوٹا بھائی تین سال کا تھا۔
آخر میرا نچی[22] کی ۱۱ تاریخ کو ختم ہوگئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے حساب لگاکر تاریخِ وفات بعمر ۹۸ برس ۱۱ ربیع الثانی، ۱۲۹۷ھ متعین کی ہے[23]

محمد حسین آزاد ٹھیک تاریخ نہیں دیتے، بلکہ مجموعی طور پر لکھتے ہیں:[24]

"۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز کے بعد دنیا سے انتقال کیا۔"

یہ دونوں بیان ٹھیک نہیں، خاص کر محمد حسین آزاد کی اطلاع بہت گمراہ کن ہے۔

۲۰۔ مضامین فرحت، ۲ : ۲۰۳ - ۲۰۴

۲۱۔ مضامین فرحت، ۲ : ۲۰۳ - ۲۰۴

۲۲۔ دلی کی مستورات کی زبان میں اس سے ربیع الثانی کا مہینا مراد ہے

۲۳۔ مضامین فرحت، ۲ : ۲۰۳ - ۲۰۴

۲۴۔ آبِ حیات : ۴۸۱ (حاشیہ)

"چند روز کے بعد" کے الفاظ سے یوں معلوم ہوتا ہے گویا ان کا ۱۸۵۷ء ہی میں یا ۱۸۵۸ء کے آغاز میں انتقال ہوا ہو، حال آں کہ یہ درست نہیں ہے، وہ اس کے بہت بعد تک زندہ رہے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم کے کتابخانے میں سر سید احمد خان کی تصنیف "آثار الصنادید" کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس کے چوتھے باب میں "دہلی اور اہلِ دہلی کے حال میں" کے عنوان کے تحت ایک فصل "علمائے کرام ذوی المجد والاحترام" میں دلی کے بعض اطبا اور حکما کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ سر سید نے ان میں حکیم آغا جان عیشؔ کو شامل نہیں کیا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے کتابخانے کی مشارٌ الیہ جلد محشّٰی ہے یعنی کسی نے اس فصل کے مندرجات پر بہت مفید اور کار آمد حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ اس نسخے میں اس فصل کے اختتام پر حاشیے میں لکھا ہے:[25]

حکیم آغا جان عیشؔ تخلص۔ تاریخِ وفات:

ع: جانِ عزیز داد حکیم آغا جان

اس تاریخ سے ۱۲۹۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق ایک اور جگہ سے بھی ہوتی ہے، بلکہ وہاں مہینا اور دن بھی متعیّن کر دیے گئے ہیں۔ یہ دوسری تاریخ نسّاخ کے تذکرہ "سخن شعرا" سے لی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ وہ بروز جمعہ ۱۱ جمادی الاول ۱۲۹۱ھ کو فوت ہوئے۔ تاریخ ہوئی: سرگروہِ ملکِ سخن[26]۔ اس سے بھی ۱۲۹۱ھ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے، یہ تاریخ خود نسّاخ کی کہی ہوئی ہو۔ نسّاخ کو تاریخ کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ بلکہ ان کا ایک مکمل دیوان (ارمغانی) سراسر تاریخوں ہی پر مشتمل ہے۔

غرض اس میں شبہہ نہیں کہ محمد حسین آزاد اور فرحت اللہ بیگ دونوں کے ہاں تاریخِ وفات ٹھیک نہیں ہے۔ صحیح تاریخ بروز جمعہ ۱۱ جمادی الاوّل ۱۲۹۱ھ (مطابق ۲۶ جون ۱۸۷۴ء) تھی۔

۲۵۔ آثار الصنادید: باب چوتھا دہلی اور اہلِ دہلی کے حال میں: ص ۳۹

۲۶۔ قومی زبان، کراچی (شمارہ ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء) ص ۲۳

اولاد :

مرزا فرحت اللہ بیگ (غالباً عیش کی پوتی کی سند پر) لکھتے ہیں:[27]

"اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں"

ایک لڑکے کی تائید غالب کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیلدار کو لکھتے ہیں:[28]

سنو صاحب! حکیم میرزا جان، خلف الصدق حکیم آغاجان صاحب کے، تمھارے علاقہ تحصیلداری میں بصیغۂ طبابت ملازم سرکارِ انگریزی ہیں۔ ان کے والدِ ماجد میرے پچاس برس کے دوست ہیں، ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم میرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے۔ لازم ہے کہ ان سے یکدل و یکرنگ رہو، اور ان کے مددگار بنے رہو۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغۂ دوام ہے۔ تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی نہیں ہوگی۔ صرف اسی امر میں کوشش رہے کہ صورت اچھی بنے رہے۔ سرکار کے خاطر نشان رہے کہ حکیم میرزا جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے۔ ۱۲ فروری ۱۸۶۴ء

غالب کے اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) عیش کے بیٹے کا نام میرزا جان تھا اور وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح طبیب تھے۔

(۲) وہ انگریزی سرکار میں مستقل ملازم تھے۔ اور ان دنوں بلب گڑھ میں تعینات تھے جہاں جواہر سنگھ جوہر (مکتوب الیہ) تحصیلدار تھے۔

(۳) ملازمت میں شامل ہونے سے پہلے انھوں نے ضرور کچھ دن ذاتی مطب کیا ہوگا۔ اور ملازمت مستقل ہونے میں بھی ضرور کچھ دن لگے ہونگے۔ لہٰذا قیاس کیا جاسکتا

۲۷۔ مضامین فرحت، ۲ : ۲۰۴

۲۸۔ خطوط غالب (مرتبہ مہر) ۲ : ۳۳۴

ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۳۵ - ۴۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اگر یوں ہو، توان کی ولادت ۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۹ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔

(۴) غالب انھیں اپنا بھتیجا اور ان کے والد حکیم آغا جان عیش کو پچاس برس سے اپنا دوست بلکہ اپنے بھائی کے برابر لکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی عیش ہیں، جنھوں نے برسرِ مشاعرہ ایک طرحی غزل میں غالب سے متعلق قطعہ کہا تھا۔

یہ خط ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگر "پچاس برس" محض طویل مدت کے اظہار کے لیے نہیں لکھا، اور اس سے واقعی نصف صدی کا زمانہ مراد ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عیش نے جو کچھ کہا تھا، وہ محض سخن گسترانہ بات تھی اور اس کے کوئی دیرپا ناخوشگوار نتائج نہیں نکلے۔

(۵) اور سب سے آخر ضمناً یہ ہے کہ ۱۸۱۴ء تک غالب آگرہ سے دلّی منتقل ہو چکے تھے۔

یہ انھیں حکیم میرزا جان کی بیٹی (یعنی عیش کی پوتی) ہی تھیں، جن سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی ملاقات ہوئی اور جن کی سند پر انھوں نے عیش کے حالات قلمبند کیے ہیں۔

عیش کی قبر:

مرزا فرحت اللہ بیگ نے عیش کی پوتی کی سند پر لکھا ہے:[۲۹]

انتقال کے بعد ترکمان دروازے کے باہر ناصر وزیر کی بارہ دری میں خواجہ میر درد کی پائنتی دفن ہوئے۔ پہلے مزار پختہ تھا، اب نشان مٹ کر مٹی کا ڈھیر رہ گیا ہے۔

اوّل تو ترکمان دروازے کے باہر کبھی کسی زمانے میں بھی "ناصر وزیر کی بارہ دری" نہیں رہی۔ ممکن ہے مرزا فرحت سہواً "ناصر عندلیب" کی جگہ "ناصر وزیر" لکھ گئے ہوں۔ لیکن ناصر عندلیب بھی غلط ہے، ان کے نام سے موسوم بھی یہاں کوئی بارہ دری نہیں رہی۔ البتہ ایک "خواجہ میر درد کی بارہ دری" ضرور تھی، جو بعد کو قبرستان میں تبدیل ہو گئی۔

۲۹- مضامین فرحت ۲ : ۲۰۴

خواجہ میر درد اور ان کے خاندان کی کچھ قبریں ترکمان دروازے کے باہر کے قبرستان میں آج بھی موجود ہیں۔ خواجہ میر درد کی بارہ دری امتدادِ زمانہ سے تبدیل ہوکر بستی خواجہ میر درد بن گئی ہے۔ اس بستی میں اب بہت بڑی آبادی ہے۔ لوگوں نے قبرستان کی اراضی پر مکان تعمیر کر لیے ہیں۔ اب بھی یہاں کئی شکستہ قبروں کے نشان دیکھے جاسکتے ہیں، جو اپنی خستہ حالی سے دنیا کی بے ثباتی کا نقشا پیش کرتی ہیں۔ یہاں صرف چند مکان پختہ ہیں۔ بیشتر رہائش گاہیں لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر یا خام دیواریں کھڑی کر کے بنالی گئی ہیں۔ اسی بستی کی ایک گلی کے قلب میں خواجہ میر درد سے منسوب ایک مسجد ہے، جسے بستی والوں نے قدیم بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرلیا ہے۔ مسجد کا ہال خاصا بڑا اور صحن بہت وسیع ہے۔ مسجد کی دہنی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو سماع خانے کے احاطے میں کھلتا ہے۔ یہاں خواجہ میر درد کے سالانہ عرس پر محفلِ سماع منعقد ہوتی ہے۔ مسجد کی حدود کے باہر بائیں طرف دو مکان ہیں، جن کے بعد تقریباً چار فٹ اونچی دیوار کا "دائرہ نما" حصار ہے۔ گلی کی طرف اس میں آہنی سیخچوں کا دروازہ ہے، جس سے اندر داخل ہونے پر دو صفوں میں تیرہ قبریں دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی صف میں چھ قبریں ہیں اور دوسری میں سات۔ دروازے کی جانب سے پہلی صف کی چوتھی قبر کے سرھانے خواجہ ناصر عندلیب کے نام کا پتھر لگا ہے۔ اس کے برابر کی (پانچویں) قبر پر خواجہ میر درد اور بعد کی (چھٹی) قبر پر خواجہ محمد میر اثر کے نام کے پتھر ہیں۔

دوسری صف میں میر اثر کی پائنتی ایک نامعلوم قبر ہے۔ اس کے بعد خواجہ میر درد کی قبر کے بائیں گوشے میں درد کے بیٹے میر الم محمد، کے نام کا پتھر قبر کے سرھانے آویزاں ہے۔ الم کے برابر خواجہ میر درد کی پائنتی والی قبر حکیم آغا جان عیش کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر ان کے نام کا کتبہ لگا دیا جائے تاکہ ان کا نام نیک ضائع ہونے سے محفوظ ہوجائے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

۳۔ عیشؔ بحیثیت شاعر

جس عہد میں عیشؔ پیدا ہوئے اور جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی، اُس کی طرف بلکہ سا اشارہ پہلی فصل میں ہو چکا ہے۔ زندگی بہت حد تک پُر امن تھی، ضرورتیں مختصر تھیں، سستا سماں تھا۔ لہٰذا تھوڑی آمدنی میں بھی عزت و آبرو کے ساتھ بسر اوقات ممکن تھی۔ اور لوگوں کے پاس اپنے شوق پورا کرنے کے لیے وقت کی فراوانی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس طرح کے موافق حالات میں فنونِ لطیفہ عموماً اور خاص کر شعر و شاعری اور رقص و سرود ترقی کرتے ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی دلّی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ جیسا کہ ذکر ہوا، یہاں کا ہر چھوٹا بڑا، امیر فقیر، پیشہ ور اور ملازم پیشہ شاعر نہیں، تو شعر کا رسیا ضرور تھا۔ ایسے ماحول میں عیشؔ کے لیے شاعری سے دامن بچا کے نکل جانا ممکن نہیں تھا۔

سلسلۂ تلمّذ:

عیشؔ نے شاعری کب شروع کی، اور اس کے کیا محرّکات تھے، اس کے بارے میں، ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں۔ لیکن اس کی ابتدا جب بھی ہوئی ہو، انھوں نے زمانے کے دستور کے مطابق رحمت اللہ محرم اکبرآبادی کا تلمّذ اختیار کیا۔ ایک شعر میں اپنے معنوی شجرہ نسب کا یوں ذکر کرتے ہیں:

مجرم کا میں شاگرد، وہ بیدار کے شاگرد

ہے، عیش ؛ سلسلہ مراتب درد و آثر تک

تو پہلے ان کے بزرگوں پر مختصر نظر ڈالنا مفید ہوگا تاکہ معلوم ہو کہ انھیں ورثے میں کیا ملا تھا؟ اور انھوں نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا؟ یا اس میں کیا حذف و اضافہ کیا؟

خواجہ میر درد دہلوی:

خواجہ میر درد ۱۱۳۱ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے، اپنے والد خواجہ میر ناصر عندلیب کے "طریقہ محمدیہ" کے پیرو اور مبلغ تھے، جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی کتاب "علم الکتاب" میں کیا ہے۔ عندلیب کے انتقال (۱۱۷۲ھ) کے بعد وہی ان کے جانشین بھی قرار پائے۔

درد کی تربیت اپنے والد میر ناصر عندلیب کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ نیکی و تقویٰ کے نمونہ، استغنا و سیر چشمی کے پیکر، علم و فضل کے دلدادہ، وہ عندلیب کے صحیح وارث ثابت ہوئے۔ دلّی کی سیاسی افراتفری اور آئے دن کے قتل و غارت کے باعث اکثر اہلِ قلم اور صاحبِ حیثیت لوگ دلّی چھوڑ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔ لیکن درد کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی اور توکل علی اللہ یہیں جمے رہے۔ میر کے سے صاحبِ بصیرت اور صائب الرائے انسان کی نظر میں بھی اُن کا مرتبۂ درویشی مسلّم تھا۔ وہ درد کو نہایت خوش خلق، متواضع انسان، بہترین دوست، وسیع المشرب اور جوان صالح مانتے ہیں۔ میر کی نگاہ میں درد کی سخن پرداز طبیعت شاعری کا دلکش چمن تھی، جس کا دامنِ خیال گلِ معنیٰ سے بھرا تھا۔ ریختہ کے زبردست شاعر کی حیثیت سے جو خراجِ تحسین میر نے درد کو پیش کیا ہے اس میں جانب داری یا عقیدت کو کوئی دخل نہیں۔ یہ ایک سخن شناس ناقد اور ماہرِ فن کا منصفانہ فیصلہ ہے۔ اور درد کا دیوان اس پر گواہ ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ دونوں دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

درد کا ۱۱۹۸ھ (۸۴-۱۷۸۵ء) دلّی میں انتقال ہوا اور یہیں دفن ہوئے۔ ترکمان دروازے کے باہر میر درد روڈ پر مزار موجود ہے۔

خواجہ میر محمد اثرؔ دہلوی:

خواجہ میر دردؔ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثرؔ ان کے جانشین ہوئے۔ اثرؔ کی جانشینی کا اعلان خود میر دردؔ نے اپنی زندگی ہی میں کر دیا تھا:

موت، کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے
موت سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں

محمد میر اثرؔ ۱۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اپنے برادرِ معظم خواجہ میر دردؔ کی نگرانی میں ہوئی اور شعر گوئی میں تلمذ بھی انھیں سے رہا۔ خود اثرؔ نے اپنی مثنوی "خواب و خیال" میں دردؔ کی مادّی اور معنوی سرپرستی کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

دردؔ ہی میرے جی پہ چھایا ہے — دردؔ کا میرے سر پہ سایا ہے
تو نے ایسی ہی دستگیری کی — پدری، مادری و پیری کی
دردؔ ہے ہادی و دلیلِ اثرؔ — دردؔ ہے حامی و وکیلِ اثرؔ
جو کہا، سب اسے سنایا ہے — دستِ اصلاح نے بنایا ہے
میں بھی اس کا، کلام بھی اس کا — بعض کیا ہے، تمام بھی اس کا

قدرت اللہ قاسمؔ اور غلام ہمدانی مصحفیؔ نے اثرؔ کے علم و حلم اور تقویٰ کی گواہی دی ہے۔ سید عبدالحیٔ کے بقول اثرؔ نے "علوم و فنون اساتذۂ دہلی سے حاصل کیے تھے۔ تصوّف، موسیقی، حساب، اور دیگر فنونِ ریاضیہ میں ان کا جواب نہ تھا۔ فنونِ ریاضیہ کی تعلیم خواجہ احمد دہلوی سے پائی تھی۔" دیوان اردو کے علاوہ مثنوی "خواب و خیال" ان سے یادگار ہے۔

۱۔ مجموعۂ نغز (مرتبہ محمود شیرانی): ۴۳

۲۔ تذکرہ ہندی (مرتبہ مولوی عبدالحق): ۹ — ۳۔ گلِ رعنا: ۲۰۸

اثرؔ صحیح معنوں میں دردؔ کے جانشین ثابت ہوئے۔ ان کی خانقاہ دردؔ کے عہد ہی میں علم و فضل اور فکر و فن اور اشغال و افکار کا مرکز بن چکی تھی۔ اثرؔ کے زمانے میں بھی اس کی رونق بدستور قائم رہی۔ صفر ۱۲۰۹ھ میں اثرؔ بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر اپنے برادرِ معظم اور استاد اور پیر و مرشد کے پہلو میں آسودۂ خوابِ ابدی ہو گئے۔

میر محمدی بیدارؔ دہلوی:

بیدارؔ کا دردؔ اور اثرؔ کے ارشد تلامذہ کی فہرست میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام میر محمد علی اور عرف میر محمدی تھا۔ بیرونِ دلّی کے مشہور محلّے عرب سرائے میں قیام تھا۔ (جو اب بستی حضرت نظام الدین کا ایک حصّہ بن گیا ہے) خوش سیرت، صوفی مزاج، اور صاحبِ بصیرت درویش تھے۔ مسلکِ چشتیہ کے پابند اور مولانا فخر الدینؒ دہلوی کے ہم صحبت اور مرید تھے۔ اور انھیں سے اجازت اور خلافت پائی۔ اخیر عمر میں ترکِ وطن کر کے اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ محلّہ دندانِ فیل میں سکونت رہی[۴] اور وہیں ۱۷۹۴ء (۱۲۰۹ھ) میں انتقال کیا۔ محلّہ سبزی منڈی (موجودہ سیب کا بازار) میں دفن ہوئے[۵]۔

بیدارؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ ان کا اردو دیوان الٰہ آباد اور مدراس دو جگہ سے طبع ہوا ہے۔

میرؔ نے انھیں از یارانِ مرزا مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ[۶] اور میر حسن نے واضح الفاظ[۷] میں ان کو "شاگردانِ فراقؔ" میں شمار کیا ہے۔ اس کے برخلاف میرزا علی لطف انھیں خواجہ میر دردؔ کا شاگرد بتلاتے ہیں[۸]۔ اس کی تصدیق بعض اور اصحاب نے بھی کی ہے۔ عیشؔ بھی یہی کہتے ہیں۔ ان تمام بیانات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ

۴۔ گلِ رعنا: ۲۰۰
۵۔ نہالستانِ نثار: ۱۱
۶۔ نکات الشعراء: ۱۳۲
۷۔ شعرائے اردو: ۳۱
۸۔ گلشنِ ہند: ۵۹

سے اور اردو میں خواجہ میر درؔد سے مشورہ کرتے رہے۔ عیشؔ کے مندرجۂ صدر شعر کے مطابق بیدار کو درؔد اور آثرؔ دونوں سے شرفِ تلمذ تھا۔ بیدؔار کے میر محمدی کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ خواجہ ناصر عندلیب کے طریقۂ محمدیہ میں شامل تھے۔ ناصر نذیر فراقؔ[9] اور قطب الدین باطنؔ[10] کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

مجرمؔ اکبر آبادی:

میر محمدی بیدؔار کے واسطے سے اس سلسلۂ سخن کا جو درؔد سے شروع ہوا، آخری حلقہ مجرؔم ہیں۔ ان کا نام رحمت اللہ اور وطن اکبر آباد (آگرہ) تھا، اور وہاں کے طبقۂ اہلِ حرفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ باطن کی وضاحت کے مطابق کندہ کشی اُن کا ذریعۂ معاش تھا[11] فطرتاً نہایت شریف الطبع اور ذہین وظریف انسان تھے۔ جب میر محمدی بیدؔار دلّی سے ترکِ وطن کرکے اکبر آباد پہنچے، تو مجرؔم بھی ان کی شہرت سُن کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ بیدؔار کے فیضِ صحبت سے مجرؔم کی چشمِ بصیرت میں کاروبارِ دنیا ہیچ نظر آنے لگا تصوّف نے دستگیری کی، اور انھوں نے علائقِ دنیوی سے آزاد ہوکر لباسِ فقیری زیبِ تن کرلیا۔

بیدؔار نے مذاقِ تصوّف کے ساتھ مجرؔم کے مذاقِ سخن کی بھی تربیت کی۔ مجرؔم کو ان اسباب کی بنا پر بیدؔار سے اس درجہ تعلقِ خاطر پیدا ہوگیا کہ جب ۱۷۹۴ء میں بیدؔار کا انتقال ہوگیا، تو مجرؔم نے اکبر آباد کا قیام ترک کرکے بادیہ پیمائی اختیار کی۔ اسی عالمِ جذب وجنوں میں بریلی پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات ظفر یاب خان راسخؔ سے ہوئی۔ راسخؔ کو اپنی سخنوری کا غرّہ تھا۔ دونوں میں فکر آزمائی تک نوبت پہنچی۔ اس معرکے میں مجرؔم سرخرو ہوکر بریلی سے دلّی روانہ ہوگئے۔

دِلّی پہنچنے کے بعد مجرم سیدھے میر سیّد کی خدمت میں پہنچے۔ میر سیّد دلّی کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ اور اہلِ فضل وکمال کے حلقوں میں عزّت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے

۹۔ میخانۂ درد: ۱۵۶ ۱۰۔ گلستانِ بیخزاں: ۲۰۵ - ۲۰۶

۱۱۔ گلستانِ بیخزاں: ۲۰۵ - ۲۰۶

تھے۔

میر سیّد کے بیٹے میر سیّد علی غمگین نہ صرف صاحبِ علم و کمال بزرگ صوفی تھے، بلکہ فنِ شاعری میں بھی استادی کا پایہ رکھتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے[۱۲] کہ نواب الٰہی بخش خان معروف نے بھی غمگینؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لی تھی۔

میر سیّد اور غمگینؔ ہی کی وساطت سے مجرّم کی رسائی معروفؔ تک ہوئی۔ مجرّم اگرچہ پیدا اکبر آباد میں ہوئے تھے، لیکن بیدارؔ کی شاگردی اور تعلیم و تربیت نے انھیں اہلِ زبان کے درجے پر فائز کر دیا۔ جو کور کسر رہ گئی تھی، وہ دلّی کے طویل قیام نے پوری کر دی، اور ان کا دہلی کے اساتذہ میں شمار ہونے لگا۔ دارالخلافہ کی علمی اور ادبی مجالس میں ان کا درجہ کسی سے کم نہیں تھا۔ معروف کا ذکر ہو ہی چکا ہے۔ اُن کے علاوہ مفتی صدرالدّین خان آزردہ اور حکیم آغا جان عیشؔ نے بھی انھیں سے رشتۂ تلمّذ قائم کیا۔ ایسے مسلّمہ شعرا کے استاد کے پایۂ استناد میں کسے شبہہ ہو سکتا ہے!

مشاعروں میں شرکت:

ہر طرف شعر گوئی کا یہ غلغلہ ہو، تو ناگزیر تھا کہ شاعر حضرات باہم مل بیٹھنے کا موقع تلاش کرتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف حضرات وقتاً فوقتاً اپنے ہاں سخنگو احباب کو جمع کر کے شعر و سخن کی محفلیں برپا کرتے رہتے تھے۔ تذکروں میں ایسے کئی شعرا کے نام ملتے ہیں، جن کے وہاں باقاعدہ ایسے اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ سلامت خود شاعر تھے۔ ان کی یا کسی شاہزادے کی سرپرستی میں لال قلعے میں بھی مشاعرے ہوتے تھے جن میں شہر کے مختلف شعرا اور عمائد شریک ہوتے۔ مہمان شعرا کو پہلے سے اطلاع دے دی جاتی اور اس کے ساتھ ہی بالعموم مصرعِ طرح بھی بھیج دیا جاتا جس پر انھیں فکرِ سخن کی دعوت دی جاتی تھی۔

۱۲۔ آبِ حیات : ۴۴۴

ان طرحی مشاعروں نے ہماری زبان کی ترقی اور اسے معیاری مقام اور حیثیت دینے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اس کا پہلا فائدہ تو خود مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کو پہنچا۔ انھیں معلوم تھا کہ مقابلہ کن حضرات سے ہے "طرح" مقرر ہو جانے کے باعث گویا میدان مقرر اور محدود ہو گیا۔ اب قافیے، ہر ایک کے علم اور دسترس میں تھے۔ لہٰذا ہر ایک شاعر کی سر توڑ کوشش رہتی کہ وہ ان گنتی کے مضامین کو اپنی طرزِ ادا اور اسلوب بیان سے ایسی جدّت بخشے اور ایسا رُخ دے دے کہ اپنے حریف سے بازی لے جائے۔ اس سے جہاں ہچشموں میں خود اس کی برتری اور قدرت کلام کا سکّہ بیٹھا، وہیں رفتہ رفتہ زبان بھی صاف ہوتی گئی۔ لفظوں کی تراش خراش، ان کے معانی کی تہداری، روزمرّہ اور محاورے کے استعمال اور موقع و محل کا تعیّن بہت حد تک ان مشاعروں ہی کا رہین مِنّت ہے۔

ایک طرف یہ مشاعرے کہنہ مشق شاعروں کو اپنی استادی اور فضیلت اور مہارت کے اظہار کا موقع مہیّا کرتے تھے، تو دوسری طرف مبتدیوں اور نومشقوں کے لیے یہ درسگاہ اور ترقی و تکمیل کا زینہ تھے۔ یہاں انھیں تربیت ملتی تھی کہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے کیا آداب ہیں۔ ان کی موجودگی میں بات چیت کب اور کس انداز سے کرنا چاہیے۔ بزرگ شعرا کا کلام سُن سُن کر وہ زبان سیکھتے، اس میں مہارت حاصل کرتے، اور بتدریج فنِ شعر پر حاوی ہو جاتے۔ غرض ان مشاعروں کے لسانی، سماجی اور ثقافتی اثرات بہت دُوررس اور وسیع تھے، اور ساتھ ہی بہت دیرپا بھی ثابت ہوئے۔

عیشؔ نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا، تو وہ بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ افسوس کہ اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات ہماری دسترس میں نہیں، البتہ مولانا محمد حسین آزاد نے ایسے دو مشاعروں کا ذکر کیا ہے، جن میں عیشؔ موجود تھے۔ پہلے مشاعرے کی زمین میں ان کا ذوقؔ سے توارد ہو گیا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں:[۱۳]

ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیشؔ بھی کہ کہن سال مشاق

۱۳۔ آبِ حیات: ۴۸۱ - ۴۸۲

اور نہایت زندہ دل شاعر تھے۔ استاد (ذوق) کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ زمینِ غزل تھی: یار دے، بہار دے، روزگار دے۔ حکیم آغا جان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا:

اے شمع، صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اسے بھی گزار دے

ان کے (یعنی ذوق کے) ہاں بھی اسی مضمون کا ایک شعر تھا۔ باوجود اس رتبہ کے لحاظ اور پاسِ ادب حد سے زیادہ تھا۔ میرے والد مرحوم (یعنی مولوی محمد باقر) پہلو میں بیٹھے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا، اب میں وہ شعر نہ پڑھوں۔ انھوں نے (یعنی مولوی محمد باقر نے) کہا: کیوں نہ پڑھو! نہ پہلے انھوں نے (یعنی عیش نے) آپ کا مضمون سنا تھا نہ آپ نے ان کا، ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سے بھی طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منزل پر دونوں فکر پہنچے مگر کس کس انداز سے پہنچے۔ چنانچہ حکیم صاحب کے بعد ہی ان کے آگے شمع آئی۔ انھوں نے پڑھا:

اے شمع! تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار، یا اسے ہنس کر گزار دے

دوسرے مشاعرے میں مدِ مقابل غالب تھے۔ غالب نے شعر گوئی دِلّی آنے سے پہلے آگرے ہی میں شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں ان پر طرزِ بیدل کا بہت اثر، بلکہ غلبہ رہا تھا۔ اسی لیے ان کا یہ کلام بہت مشکل اور بعید الفہم تھا، لوگ جز بز ہوتے اور اعتراض کرتے۔ غالب کو ان معترضوں کے جواب میں رباعی کہنا پڑی:

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل! سُن سُن کے اسے، سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل، وگر نگویم، مشکل

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:[14]

۱۴۔ آبِ حیات: ۵۱۶ - ۵۱۷

اہلِ ظرافت بھی اپنی نونک جھونک سے چُوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا غالب، بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغاجان عیش ایک خوش طبع، شگفتہ مزاج شخص تھے۔ انھوں نے غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا:[۱۵]

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر اُن کی زباں وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے، تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، تم کہو اور دوسرا سمجھے

ان دونوں واقعات سے جہاں عیش کے شعری مقام کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان سے ان کے سماجی مرتبے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ذوق اور غالب اس عہد کے سربرآوردہ شاعر تھے۔ کسی معمولی یا غیر معروف شاعر کے لیے ناممکن تھا کہ ان کا حریف بن سکے۔

پہلا مشاعرہ قلعہ میں ہوا تھا اس لیے ظاہر ہے کہ وہاں شعرا بھی برگزیدہ ہوں گے، اور سامعین کا مجمع بھی اعلیٰ طبقے کے لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ کیونکہ ہر کسی کو قلعے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

عیش کا شعر سننے کے بعد ذوق کا اپنے شعر سے دست برداری پہ آمادگی ظاہر کرنا معمولی بات نہیں ہے اگرچہ آزاد نے اسے ذوق کے "لحاظ اور حد سے زیادہ پاسِ ادب" پر محمول کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں نفسِ مضمون، زبان اور محاورے کے لحاظ سے کسی شعر کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ عیش کا شعر ذوق سے کسی طرح کمتر نہیں ہے۔ دونوں کا موضوع بھی ایک ہے کہ جیسی خوش و ناخوش اب تک گزری ہے، باقی بھی صبر و شکر سے اسی طرح گزار دے۔ زبان کے لحاظ سے بھی دونوں شعر ہم پلّہ ہیں۔

دوسرے مشاعرے کی روداد سے عیش کی تصویر اور بھی روشن ہوجاتی ہے۔ یوں برسرِ مشاعرہ غالب کو چیلنج کرنا کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں تھی، اور یہ اُس عہد کے آدابِ مجلس

۱۵۔ یہاں قطعہ دیوانِ عیش کے مطابق ہے۔ آب حیات میں کچھ لفظی اختلاف ہے۔

کے بھی خلاف ہوتا۔ حاضرین میں سے کسی کا اس پر احتجاج نہ کرنا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ سب نے اپنی خموشی سے اسے جائز قرار دیا۔ خود غالب نے اسے سخن گسترانہ بات سے زیادہ وقعت نہ دی۔ اس واقعے کے بعد بھی ان کے عیش سے تعلقات دوستانہ بلکہ، ان کے قول کے مطابق، برادرانہ قائم رہے۔

خود عیش نے بھی اس واقعے کو سخن گسترانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ خیال نہیں کیا۔ اس کا ثبوت ان دو تاریخوں سے ملتا ہے، جو انھوں نے غالب کی وفات پر کہی تھیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، غالب کی وفات عیش کی زندگی ہی میں ۱۲۸۵ھ میں ہوگئی تھی۔ عیش نے اس موقع پر دو تاریخیں کہی تھیں، یہ ان کے دیوانِ دوم میں شامل ہیں۔ افسوس کہ کسی حادثے کے باعث دیوان کے قلمی نسخے میں ان کا کچھ حصہ ضائع ہوگیا۔ پہلی تاریخ کے شروع کے تین شعروں کے صرف دوسرے مصرعے بچے ہیں، پہلے مصرعے ضائع ہوگئے۔ آخری تین شعر تاریخ سمیت یوں ہیں :

جب تلک وہ یہاں مقیم رہے — اور بڑے چین سے گزاری عمر
اب جو یہاں سے وہاں گئے، تو وہ، عیش! — موردِ بخششِ کریم ہوئے
رکھتے دل خوش تھے وہ، سو بادلِ خوش — "داخلِ جنّتِ نعیم ہوئے"

(۱۲۸۵ = ۱۲۷۹ + ۶)

افسوس کہ دوسری تاریخ کے صرف پہلے دو شعر محفوظ رہ گئے۔ بہر حال ان تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ غالب سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے اور وہ ان کے دوست اور دعا گو تھے۔

یہ غزل کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شاعروں نے منھ کا ذائقہ بدلنے کو دوسری اصنافِ سخن میں بھی کچھ نہ کچھ کہا۔ لیکن ان کی اصلی اور زیادہ توجہ غزل ہی پر مرکوز رہی۔ جن شعرا کا دربارِ شاہی سے تعلق تھا، انھوں نے کبھی کبھی قصیدے سے بھی شوق کیا۔ لیکن ایک ذوق کے سوا اور کسی کو نہ اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، نہ آج کسی کا نام ہی اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے۔ عیش کے دیوان میں بھی چند قصیدے ملتے ہیں۔ ان کے تیرہ قصیدے ہیں۔

ان میں سے گیارہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ صرف ایک قصیدہ ان کے شاہزادے شاہ رخ کے لیے کہا گیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ قصیدہ کی امتیازی خصوصیات ان میں سے کسی میں نہیں۔ بیشک، زبان ٹھیک ہے، تسلسل بھی موجود ہے۔ لیکن اسلوب کا طنطنہ اور جوش و خروش، صنائع و بدائع کی فراوانی جو قصیدے کے ضروری لوازمات تصور کیے جاتے ہیں، ان سے مفقود ہیں۔ بہر حال، ان پر تفصیلی گفتگو بعد میں کی جائیگی۔

دوسری اصناف کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ ان کی بعض رباعیات قابلِ ذکر اور توجہ طلب ہیں۔ بہر حال بحیثیتِ مجموعی اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عیش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اور اس میدان میں وہ بیشک، ہر طرح کامیاب ہیں۔

لکھنؤ اسکول:

غزل کا میدان اب تو بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ایک زمانے تک یہ اپنے لغوی معنوں کے مطابق صرف حسن و عشق کے معاملات تک محدود رہی۔ بعد میں اس میں مذہب کی چاشنی کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے شاعروں نے تصوف اور اخلاق کے مضامین بھی غزل میں داخل کر دیے۔ لیکن اب بھی شاعروں کی بھاری اکثریت کے موضوعِ سخن حسن و عشق اور ان کے متعلقہ مضامین ہی رہے۔

جب تک دلّی اردو زبان کا مرکز رہی، یہاں کے شاعروں نے اس تنگ میدان میں بھی خوب خوب اپنے جوہر دکھلائے۔ حسن و عشق کی مناسبت سے گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے افسانے لکھے۔ قفس و آشیاں کے پردے میں عشق کی پابندیوں اور دل کی اسیری کا بیان کیا۔ صوفی شعرا نے روح کے ہجر و وصال پر نئے انداز سے خامہ فرسائی کی۔ ولی اور سراج، میر اور سودا، مظہر جانِ جاناں اور درد یہ سب اسی ارتقائی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد مغل حکومت کے بتدریج کمزور ہو جانے اور اس پر بیرونی حملوں کے باعث دلّی کا امن و امان درہم برہم ہو گیا۔ سلطنت کے دور دست علاقوں نے بھی مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اگر اپنی پوری آزادی کا اعلان نہیں کیا، تو بھی دلّی سے ان کا رشتہ رفتہ رفتہ برائے نام رہ گیا۔ اب ان کے دربار الگ تھے۔ ان کے مصاحب اور حاشیہ بردار الگ

تھے اور ان کی دیکھ بھال اور روزگار و معاش کی ذمہ داری بھی، ان صوبائی حکمرانوں کے ذمے تھی۔ اسی طرح کے کئی چھوٹے چھوٹے دربار فرخ آباد، مرشد آباد وغیرہ میں نمایاں ہو گئے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور مضبوط مرکز لکھنؤ یعنی اودھ تھا۔ وہاں کا حاکمِ اعلیٰ یعنی صوبیدار ہمیشہ سے مغلیہ سلطنت کا وزیرِ اعلیٰ رہا تھا۔ ان نئے حالات میں یہاں کے نواب وزیر نے بھی اپنی آزادی اور بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

جب دلّی کی رہائش مخدوش ہو گئی، تو یہاں کے بیشتر اہلِ علم و قلم، خاص کر شعرا نے، ان نئے ٹھکانوں میں پناہ ڈھونڈنے کی ٹھانی۔ ان میں سے اکثر لوگ لکھنؤ گئے۔ ریاست بڑی تھی۔ روپے کی ریل پیل تھی۔ خود حکمران اور اس کے دربار کے امرا علم و فن کے قدردان اور شعر و سخن کے سرپرست تھے۔ لہٰذا دلّی کے اکثر عالموں اور شاعروں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ میر و سودا، انشا و مصحفی، حسرت و جرأت انھیں لوگوں میں سے تھے۔ یوں تو لکھنؤ اردو کا اہم مرکز پہلے ہی سے بن چکا تھا۔ ان مشاہیر کے وہاں پہنچ جانے نے گویا سونے میں سہاگے کا کام کیا۔

اب لکھنؤ نے دوسرا قدم اٹھایا۔ وہ دلّی کی سیاسی برتری کا جوا اتار ہی چکا تھا۔ اور اس کی آزاد سیاسی حیثیت بھی تسلیم کی جا چکی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے مقامی اور مہاجر شاعروں اور ادیبوں کے اجتماع نے اسے ادبی مرکزیت بھی عطا کر دی۔ چنانچہ اس کے بعد دلّی کے مقابلے میں محاورے اور تذکیر و تانیث وغیرہ میں بہت سی تبدیلیاں نمودار ہو گئیں اور یوں سیاسی آزادی کے ساتھ لکھنؤ کی آزاد ادبی حیثیت بھی تسلیم کر لی گئی۔

اس کا شاعری پر بھی اثر پڑا۔ دلّی میں دروں بینی اور مسائلِ حیات کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ بات حسن و عشق کی ہو یا زندگی کے کسی دوسرے رُخ کا بیان ہو، یہاں کے شعرا اس پر زیادہ گہرائی سے سوچنے کے عادی تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دلّی میں ہمیشہ علمی سطح پر مذہب (یا مذہبیت) اور تصوّف کا خاصا اثر رہا۔ اس سے شعرا حضرات ان موضوعات پر بہت حد تک سنجیدگی سے غور و فکر کرنے پر مجبور تھے۔ لکھنؤ کی فضا اس سے بہت مختلف تھی۔ وہاں نہ تصوّف کو کوئی خاص مقبولیت حاصل ہوئی، نہ اس کا زیادہ پرچار ہی تھا۔ دولت کی فراوانی کے باعث لوگوں کی زندگی بھی نسبتاً نہ صرف آسان تھی، بلکہ عیش و عشرت کے بہت قریب

تھی۔ اس سے ان میں گہرائی کی جگہ سطحیت کا رجحان پیدا ہو گیا۔ جب لوگوں کا یہ عام رویّہ ہو، تو ادب اس سے کہاں بچ سکتا تھا!

یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں زبان پر خاص توجہ دی۔ شاعر کا نصب العین معنوی سے زیادہ صوری ہو گیا۔ اس کے نزدیک "کیا کہنے" سے "کس طرح کہنے" کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔ اصطلاحاً اسے یوں کہا گیا کہ دِلّی کی شاعری میں "داخلیت" ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں "خارجیت"۔

عیشؔ کی غزل:

لیکن دوسرے تمام قاعدوں کی طرح یہاں بھی مستثنیات تھیں۔ یعنی دِلّی میں کئی ایسے شاعر ہوئے، جن کے ہاں داخلیت برائے نام ہے، یا بہت کم۔ اس کے مقابلے میں ان کا کلام خارجیت کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ ادھر لکھنؤ کے بعض شعرا کے ہاں داخلیت کا خاصا عمل دخل ہے۔ پس اس اصول کا اطلاق صرف اکثریت ہی پر ہو سکتا ہے، نہ کہ مجموعی طور پر۔

عیشؔ بھی انھیں مستثنیات میں شامل ہیں۔ یعنی اگرچہ وہ دہلوی ہیں اور ان کی ساری عمر دِلّی ہی میں گزری، لیکن ان کے کلام میں داخلیت بہت کم ہے۔ زیادہ تر ان کا میلان محاورہ بندی، رعایتِ لفظی، جدّتِ قافیہ، ٹھیٹ زبان وغیرہ پر ہے، مضمون میں وہ گہرائی نہیں، جسے تغزّل کہتے ہیں، اس رنگ کے سارے دیوان میں بہت کم شعر ہیں، اور وہ بھی کچھ ایسے بلند پایہ نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہے ہے عشق میں ناصح کہ ہے ضرر دل کا — جو واقعی ہے ضرر یہ ہی، تو ضرر کیا ہے
تو راہِ عشق کے صدموں سے مت ڈرا، واعظ! — جو سر فروش ہیں اس رہ میں ان کو ڈر کیا ہے

ضبطِ فغاں میں ڈر ہے مجھے، عیشؔ! دل کہیں — سینے کے باہر آ نہ پڑے، اضطراب میں
افشائے رازِ عشق کے باعث تمھیں تو ہو — سو بے حجابیاں ہیں، تمھارے حجاب میں

سینہ میں اک کھٹک سی ہے، اور بس — ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل
طبیعت آپ کی رہتی ہے کچھ اداس اداس — خدا کے واسطے بہلاؤ، عیشؔ! چل پھر کے

یہ صبا کوئے یار کی سی ہے　　اِس میں بُو گلعذار کی سی ہے
مثلِ سیماب دل کی سینے میں　　حالت اک اضطرار کی سی ہے
رات دن دل کی جائے سینے میں　　چھیڑ اک نوکِ خار کی سی ہے
عیشؔ ملتی ہوئی فلک میں بھی　　طرفہ کچھ خوئے یار کی سی ہے

اٹھایا ہاتھ جو عشقِ بتاں سے تم نے، تو پھر
بسر کروگے بھلا عیشؔ، عمر کیا کرکے

عیشؔ کا یہ دعویٰ کہ ان کے کلام میں "طرزِ سخنِ میرؔ کی بُو" ہے، ٹھیک نہیں۔ نہ اسلوبِ بیان کے لحاظ سے، نہ کیفیت کے پہلو سے، وہ کسی طرح میرؔ کے متبع نہیں کہے جاسکتے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ان کی زبان بہت صاف ہے۔ اس میں بالعموم وہ ثقالت بھی نہیں جو اس عہد کے بیشتر شعرا کا طرّۂ امتیاز ہے اور تو اور زبان کے معاملے میں انھوں نے شاہ نصیرؔ کی بھی پیروی نہیں کی، حال آں کہ وہ نصیرؔ کو سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ بیشتر عیشؔ کی زبان ٹھیٹ اردو زبان ہے، فارسی، عربی کی بوجھل ترکیبوں سے پاک، جیسی وہ بولی جاتی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

کیا جس کو ترک، اس سے پھر کام کیا　　کہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا
گیا تھا میں تو انھیں دردِ دل سنانے کو　　لگے سنانے وہ الٹی مجھے ہی، لو، باتیں

بس آب و دانہ کی یہ خوبیاں ہیں سب، ورنہ
کہاں میں، اور کہاں دام، اور کہاں صیّاد
میں نے کچھ اور کہا، اس نے سنا اور سے اور
تھا سوال اور، جواب اس نے دیا، اور سے اور
ایسا بہروپ بدلتے نہیں دیکھا ہم نے
بن گیا آئینہ پانی ہے صفا، اور سے اور

کھینچ لائیگی مرے گھر اسے، اے ہم نفسو — آہ کی آج وہ پلٹی ہے ہوا اور سے اور
یہ غزل جس نے سنی، اس نے کہا: واہ، جی واہ — عیشؔ کیا خوب بٹھایا ہے بجا اور سے اور

کیوں چھپائیں، کیا اجارہ ہے کسی کا ہمنشیں — دے دیا ہے اپنا دل اُس بُت کو، ہاں ہاں دیکھ کر

توبہ تو کی ہے ہاتھ پہ واعظ کے، ہاں مگر — ساقی پلادے مے، تو کچھ انکار بھی نہیں
کس منھ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ — ہم کو تو عیشؔ! شکوۂ اغیار بھی نہیں

سب عشق میں کہتے ترے، کیا کیا نہیں ہم کو — کہتے ہیں، کہیں، اس کی بھی پروا نہیں ہم کو

عیشؔ! جو ہو، سو ہو، اب حالِ دلِ زار اپنا — وہ سنے یا نہ سنے، تم تو بلا سے کہہ دو

واعظِ بیہودہ گو بکتا ہے، بکنے دو اسے — وہ تو دیوانہ ہے، تم اپنے رکھو کام سے کام

کہیں حضرتِ دل کا کیا حال تم سے — نہیں حال ان کا سنانے کے قابل
غرض ساتھ اپنے، انھوں نے ہمیں بھی — نہ رکھا کہیں آنے جانے کے قابل

آنکھوں نے تو کی لڑکے آفت برپا — مارا گیا مفت دلِ بیچارا اس میں

کہیں ہم تم سے اے احباب! کیا کیا — جہاں میں آکے دیکھے خواب کیا کیا
رہا تجھ بِن، یہ دل بیتاب کیا کیا — ہوا ہے منفعل سیماب کیا کیا
صبا لائی جو اُس کی نکہتِ زلف — چھپا نافہ میں مُشکِ ناب کیا کیا
شبِ فرقت میں تجھ بِن، اے پریوش! — یہ تڑپا ہے، دلِ بیتاب کیا کیا
خزاں میں رو کے یہ کہتی تھی بلبل — چمن میں تھے گلِ شاداب کیا کیا
فلک نے زخمِ دل پر عاشقوں کے — لگایا ہے، اجی، تیزاب کیا کیا

ترے آرام کو اللہ نے عیشؔ!
مہیا کر دیے اسباب کیا کیا

بدلتا ہے یہ ہر دم رنگ کیا کیا — دکھاتا ہے فلک نیرنگ کیا کیا
دلِ عاشق پہ ڈھاتا ہے بت اندھیر — خیالِ کاکلِ شب رنگ کیا کیا
تصوّر میں ترے تیرِ مژہ کے — رہی سینہ میں دل سے جنگ کیا کیا

دل اس غنچہ دہن کی یاد میں عیشؔ!
کیا کرتا ہے مجھ کو تنگ کیا کیا

ان اشعار میں نہ صرف زبان سلیس اور اپنی اصل کے قریب ہے، بلکہ اس کی نمایاں خصوصیت مکالمے کا انداز ہے، جیسے کوئی شخص کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ ان کا عمومی رنگ یہی ہے۔ عیشؔ کے عہد میں یہ اسلوب کسی اور کے ہاں نہیں ملتا۔ ایک اور غزل دیکھیے، جو سہلِ ممتنع زبان میں کہی ہے۔

ساتھ غیروں کو نہ لاؤ حضرت
دل جلوں کو نہ جلاؤ، حضرت!

ہم بھلی طرح سے کہے ہیں تمھیں
باز ان باتوں سے آؤ، حضرت!

کہہ دو پھر حضرتِ واعظ سے کہ تم
کام اپنا کرو، جاؤ، حضرت!

باتیں ہم آپ کی سب جانتے ہیں
جھوٹی باتیں نہ بناؤ، حضرت!

بھولے بسرے تو کبھی عیشؔ کو بھی
بزم میں اپنی بلاؤ، حضرت!

روزمرّہ اور محاورے پر قدرت:

بیشک، ان کے کلام میں "طرزِ سخنِ میر کی بُو" تو دُور دُور نہیں ملتی، لیکن ان کی قادر الکلامی اور قدرتِ کلام میں کوئی شبہہ نہیں۔ عیشؔ کے دونوں دیوان محاوروں اور کہاوتوں کا مخزن ہیں۔ بلا مبالغہ سیکڑوں محاوروں کو اس خوبی اور لطافت سے، جوں کا توں شعر کا جامہ پہنا دیا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ تمام محاوروں کا احاطہ تو ممکن نہیں۔ صرف ردیف الف کا سرسری انتخاب نمونہ کے طور پر کافی ہوگا:

مثل ہے جو کہ چھوٹا منہ، بڑی بات، اس جگہ سچ ہے
یہ منھ پایا ہے کس نے، نام لے جو تیری عظمت کا

تفتہ جانوں کو کوئی ٹھنڈا ابھی کر سکتا ہے؟ آہ
شمع کے شعلے سے بس کیا چل سکا کافور کا

عیشؔ! زلف اس رخ پہ چھٹتی ہے تو ہو جاتی ہے شام
اور اٹھتی ہے، تو ہو جاتا ہے تڑکا نور کا

ابرِ تر ہوگیا بس سنتے ہی پانی پانی — کچھ فسانہ جو مرے دیدۂ تر کا نکلا

پھر رہا ذر تجھے کس بات کا، اے عیشؔ! بتا — دل سے دھڑکا جو ترے نفع و ضرر کا نکلا

دے بیٹھے ہو دل عیشؔ! تم ان لوگوں کو، جن کی

بیداد کا وہاں بھی کوئی شنوا نہیں ہوتا

محبت میں تری، اے بحرِ خوبی — کہیں اس دل کا تھل بیڑا نہ پایا

شیخ رکھتا نہیں کچھ حلت و حرمت پہ نظر — وہ تو چٹ کرتا ہے مل جائے کہیں کا ٹکڑا

ہم نے تو سدا شمع صفت سر ہی چڑھایا — جو آہ کا شعلہ دلِ مضطر سے نکالا

عاشق کا کہیو، پہلے ہی وہاں کام ہوگیا — تیرا ہنوز تیر، پری رُو! کماں میں تھا

شب خواب میں معاملہ اس مہ جبیں سے عیشؔ — وہ پٹ گیا، جو اپنے نہ وہم و گماں میں تھا

ہمنشیں! خاک کہوں تجھ سے، مرے سینے میں — کاٹکے اس دلِ پُر درد سے کانٹا ہوتا

یہ بھی کچھ خیر ہوئی، وہ نہ ہوئے جلوہ فروز — ورنہ چاہت کا ہر اک شخص کو دعوا ہوتا

ے دیدۂ تر! خوبی تو یہ تھی کہ وہ آتا — اتنا بھی نہ جب تجھ سے بن آیا، تو ہوا کیا

حل، تو ہی بتا دے، ترے کوچے میں مرا دل — لے شوخ! اگر کام نہ آیا، تو ہوا کیا

ایک پوری غزل ملاحظہ ہو، جس میں محاوروں کی بھرمار ہے:

کہا جو، رحم مرے حال پر ذرا کھاؤ — تو ہنس کے بولے کہ چلتے بنو، ہوا کھاؤ

کہو یہ حضرتِ ناصح سے: قبلہ و کعبہ — خدا کے واسطے، جاؤ، نہ سر مرا کھاؤ

جو اپنی شدّتِ غم اُن سے ہم لگے کہنے — تو بولے ہو کے خفا: جاؤ، سنکھیا کھاؤ

حصول ان کی ملاقات سے نہیں کچھ اور — مگر یہ بات کہ وہاں گالیاں سدا کھاؤ

بتاؤ تو سہی، دبتے ہو اس سے کیوں اتنا — بلا دبے ہے، کسی کا نہ جب دیا کھاؤ

ہندی الفاظ کا استعمال:

ہم سب جانتے ہیں کہ اردو نہ صرف ہندستان میں پیدا ہوئی، بلکہ اس کے الفاظ کا تین چوتھائی حصّہ ہندی اور دوسری مقامی زبانوں پر مشتمل ہے۔ مدّتوں ہندی الفاظ

عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ بول چال اور تحریر و تقریر میں بے تکلف استعمال ہوتے رہے ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں لکھنؤ کے بعض اساتذہ کے دل میں زبان کی اصلاح اور اسے خالص بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے ان کا نزلہ ہندی الفاظ پر گرا چُن چُن کے ہندی کے وہ ہلکے پھلکے آسان الفاظ ''زبان بدر'' کر دیے گئے، جو عوام و خواص کی زبان پر تھے، اور جن کے ذریعے وہ ہمیشہ اپنی سناتے اور دوسرے کی سنتے آئے تھے۔ اس اقدام کے جو افسوسناک نتائج نکلے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج برملا کہا جا رہا ہے کہ اردو بدیسی زبان ہے۔

بعض شاعروں اور ادیبوں نے ہندی الفاظ کے زبان سے خارج کیے جانے کا فیصلہ قبول نہیں کیا۔ وہ بدستور انھیں اپنے کلامِ نظم و نثر میں استعمال کرتے رہے لیکن افسوس کہ ایسے اصحاب کی تعداد بہت کم تھی۔ ان کا احتجاج نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا، اور اکثریت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ عیشؔ بھی اس قابلِ رشک اقلیت میں سے تھے۔

عیشؔ کے ہاں ہندی کے ایسے الفاظ کی بھرمار ہے، جو ان کے بیشتر معاصر اصلاحِ زبان کے خبط میں ترک کر چکے تھے، حال آں کہ روزمرّہ کی بول چال میں سب انھیں بولتے تھے۔ چند شعر دیکھیے:

یہ جلا بھلتا ہی وہ دل ہے، جو پاوے آفتاب — کرے بس سرمہ ہی اپنے دیدۂ پُر نور کا

محبّت میں مری، اے بحرِ خوبی — کہیں اس دل کا تھل بیڑا نہ پایا

رہ گئی آئینہ کی طرح بھچک ساری بزم — اس نے جب بندِ نقاب آ کر سرِ محفل کھولا

سوزِ غم میں یہ ہی ثابت قدمی ہے، اے دل! — جل کے ہو خاک، و لیکن نہ او کس شمع نمط

اس کی ہر بات میں اعجاز ہیں، وہاں ٹرّوں ٹوں — حضرتِ عیسیٰ مریم کا بس اعجاز ہے ایک

یہاں کی دولت پہ نہ گھمنڈائیو، تو اے دل! کیوں — اک دریرہ پہ نہیں، عالمِ اسباب کے ڈھنگ

اے عندلیب! دعویِ بیہودہ پر کہیں — اک آدھ گُل کا منھ نہ مسل دیں چمن میں ہم

ڈرو خدا سے، نہیں خوب اتنی لاف زنی — کہوگے کس کو، رہے جب نہ کہنے جوگے تم

دم میں اس کے کہیں نہ آجا نا
کیوں، وہ دل لے کے پھر دواں نہیں

نیر نگیِ عشق، آہ نہ پوچھو کہ یہ کافر
دل لینے کو پھرتا ہے پڑا لاکھ برن میں

ان کے پھلا سروں میں نہ آنا، وہ ہیں بلا
دل لے کے رہتے باپ کے بھی آشنا نہیں

کان میں غیروں نے پھونکے اُن کے اچھر اور ہیں
آج کیوں بدلے ہوتے کچھ ان کے تیور اور ہیں

ترے فراق میں آنکھوں نے خون برسایا
کہ خلق اوپیچ کے چھینٹے ہے رنگزرسے خون

کیا چیز تھا دل، اس نے جلایا، تو کیا ہوا
عاشق ہوئے، تو اس کا پر یکھا نہ کیجیے

جب یگانوں کا یہ ہو حال کہ ہوں دشمنِ جاں
دوش دیوے کوئی پھر کیا بیگانوں کو

جو ہیں دھر سے گرفتارِ محبّت
اٹھاتے ہیں وہی بارِ محبّت

اداو عشوہ و ناز و کرشمہ و انداز
مقابلے میں جب اس دل کے یہ گہار آئی

ایک پوری غزل دیکھیے کہ اگر اسے دیوناگری رسم الخط میں لکھیں، تو اردو اور ہندی کی تمیز نہ ہو سکے:

نہ رہا ایک یہاں کسی کا رُوپ
کبھی ہے چھاؤں اور کبھی ہے دھوپ

فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
یہ بدلتا ہے نت نیا اک رُوپ

ہندوی بھکتیا[1] میں حق کا نام
ہے نرنکار اور جوتی سرُوپ

عیشؔ! اس چرخِ شعبدہ گر کا
ایک ہو، تو کہوں میں رنگ انوپ

غرض کہاں تک! صرف پانچ شعر اور دیکھ لیجیے، کیسے کیسے قافیے باندھے ہیں۔

جہاں میں کیسی ہے بیقدریِ گُنی، دیکھو
کبھی سنی نہ تھی، سواب وہ ان سُنی دیکھو

تھے آگے نوبت و نقارہ جن کے ہاں، سواب
لیے پھرے ہیں وہ ہاتھوں میں تُنتُنی دیکھو

رقیب، بزم میں اس شعلہ خو کی، لو ہم سے
یہ باتیں کرتے ہیں کیسی جلی بھُنی دیکھو

تمھارے سوختہ جانوں کو، کیا تماشا ہے
دوا بھی دے ہیں، تو کر کرکے گُنگُنی دیکھو

بڑے غرور تھے جن کو، عیشؔ! اب ان کو
کہیں بھی نام کو باقی ہے بھُن بھُنی دیکھو

---

[1] یعنی "ہندی بھاشا"

ہندی کے یہ الفاظ عیشؔ کے عہد کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔ لکھنؤ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہیں کے شعرا نے تو انھیں اصلاحِ زبان کی آڑ میں زبان سے خارج کیا تھا۔ دہلوی شعرا نے بھی انھیں بالعموم استعمال نہیں کیا۔ عیشؔ کا انھیں لکھنا ثابت کرتا ہے کہ یہ نہ صرف دلّی کے عوام کی زبان پر تھے بلکہ ان کی فصاحت بھی شک و شبہہ سے بالاتر ہے، ورنہ عیشؔ غیر فصیح زبان لکھنے کے قصور وار گردانے جاتے۔ یہ ان کی زبان کی بہت وقیع اور قابلِ قدر خدمت ہے کہ انھوں نے جرأت کر کے انھیں اپنے کلام میں شامل کر کے محفوظ کر دیا، ورنہ اردو والے انھیں کب کے فراموش کر چکے ہوتے۔

قصائد :

عیشؔ کے کلام میں تیرہ قصیدے ہیں، جن میں ایک نعتیہ قصیدہ بھی شامل ہے۔ ان میں (۸۰۲) اشعار ہیں۔ اور اگر وہ دس شعری قطعہ بھی شامل کر لیا جائے جو انھوں نے کسی انگریز فورٹ صاحب کے لیے کہا تھا، تو چودہ۔ ان میں سب سے طویل قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں (۱۳۶) شعر کا ہے (قصیدۂ چہارم)۔ اور سب سے چھوٹا بھی جو انھیں کی سالگرہ کے موقع پر کہا گیا تھا، اس میں (۲۱) شعر ہیں (قصیدۂ ہشتم)گویا فورٹ صاحب والے قطعے کے علاوہ ان تیرہ قصیدوں میں (۸۰۲) شعر ہیں۔

بظاہر قصیدے کی بنیاد انسانی فطرت کی دو خصوصیات پر رکھی گئی۔ اوّل، اس کی خودستائی، یعنی وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ اور دوم، اپنی غرض اور ضرورت پورا کرنے کے لیے کسی صاحبِ اقتدار کی مدح سرائی اور خوشامد۔ دنیا میں نشیب و فراز اور حاکم و محکوم کا فرق ازل سے موجود رہا ہے۔ جب بھی کوئی شخص بااختیار ہو گیا اور اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو گئی کہ وہ دوسروں کی حاجت روائی کر سکے، تو لازم تھا کہ اس کے اِرد گِرد کے لوگ اپنی مطلب برآری اور اس کی سرپرستی اور عطایا کے حصول کی توقع میں اس کی طرف رجوع کرتے۔ اس پر قدرتاً اس شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ لوگ جہاں اپنی مشکلات بیان کر رہے ہیں، وہیں میرے شکر گزار بھی ہوں کہ میں ان کی مشکلات

حل کر رہا ہوں اور انھیں تکلیف سے نجات دلا رہا ہوں۔ جب تک شاعری وجود میں نہیں آئی تھی، یہ سب کچھ نثر میں ہوتا رہا۔ اور اس کے مواقع بھی غالباً کم ہی رہے ہونگے۔ شاعروں نے اسے وسعت دی کیونکہ وہ خود کسی اور کام کی گوں تھے ہی نہیں۔ بالعموم ان کی زندگی غیر عملی تھی۔ بسر اوقات کے لیے وہ کسی حکمران یا امیر وزیر کے دامن سے وابستہ ہو جاتے، اور پھر اسی کے رحم و کرم پر پڑے رہتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں انھیں قدم قدم پر "قصیدہ" کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو گی۔

عیش کے قصیدے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ اسی حیثیت سے وہ دربار میں بھی پہنچے۔ بہادر شاہ ظفر نے انھیں یکے بعد دیگرے اپنے دو شاہزادوں، شاہ رخ مرزا اور فرخندہ شاہ کی سرکار میں مقرر کر دیا۔ پھر وہ شاہی اطبا میں شامل ہو گئے۔ لیکن اگر وہ قلعہ کے ملازم نہ بھی ہو گئے ہوتے، جب بھی ضرور تھا کہ وہ قلعہ سے تعلق پیدا کرتے۔ بہادر شاہ حکمرانِ وقت تھے۔ لازماً عمائدِ شہر ان کے دربار میں جگہ پانے کے آرزومند رہتے تھے۔ عیش کا بھی دِلّی کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار تھا۔ قدرتاً یہ بھی اس کی کوشش کرتے۔

عیش طبیب کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے جہاں اپنی طبی معلومات اور صلاحیت سے بہادر شاہ کی جسمانی صحت کی دیکھ بھال کی، وہیں شعر سے اور قصیدے کہ کر اس کی ذہنی تسکین کا سامان بھی مہیا کر دیا۔

فنی لحاظ سے عیش کے قصیدوں اور روایتی قصیدوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تشبیب، گریز، مدح اور دعا۔ ان کے بھی اجزاے ترکیبی ہیں۔ ان کی تشبیب زیادہ تر بہاریہ ہے۔ پہلے قصیدے کا آغاز ہوتا ہے:

نسیمِ صبح ہوئی آج یہ نوید رسا — کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسا
جلوسِ شاہدِ گل کے لیے بچھایا ہے — صبا نے باغ میں فرشِ زمرّدی ہر جا
یہ کہ رہے ہیں جوانانِ بادہ نوشِ چمن — کہ، اے بہار کے ساقی! چل اٹھ، نہ دیر لگا

اس کے بعد ستر شعروں میں بہار کے کرشموں اور اس کی بدولت ہر طرف رونق اور

سرسبزی اور تر و تازگی کا تفصیلی بیان ہے ۔ یہ لطف وطرب اور مسرّت وانبساط کا عالم دیکھ کر شاعر تعجّب کرتا ہے ۔ بالآخر

غرض کہ دیکھ کے یہ عالمِ غرورِ بہار   مثالِ آئینہ حیرت سے رہ کے بس چپ کا
دبیرِ عقل سے میں نے کہا کہ عالم میں   نسیمِ فیض سے کس کی ہوا ہے یہ جلوا
شمیمِ لطف یہ کس کی ہوئی ہے راحت بخش   کہ یوں ہے جوشِ بہار اور اعتدالِ ہوا

دبیرِ عقل اس کے جواب میں چند شعر کی تمہید کے بعد کہتا ہے :

تجھے خبر نہیں، اے بےخبر! کہ وہ، وہ ہے   خدا نے ذات بنائی ہے جس کی عقدہ کشا
یہ عہد، عہد ہے اُس کا کہ عہد میں جس کے   کِھلا ہوا ہی نکلتا ہے شاخ سے غنچا
وہ، وہ ہے نکہتِ الطاف نے سُنا جس کی   جہاں میں غنچۂ تصویر تک کِھلا گیا
وہ کون، سایۂ حق، نائبِ رسولِ خدا   سراج الدّین بہادر شہنشہِ والا
یہ اُس کے جُود سے، ہے انبساط عالم میں   اسی کے ابرِ کرم سے ہیں سب تر و تازا
نسیمِ فیض سے اُس کی ہی لہلہاتا ہے   جہاں کے باغ میں ہر سمت، ہر طرف سبزا

اب اصلی مطلب کی بات زبان پر آتی ہے :

میں عرضِ حال کو اپنے سمجھ کے ترکِ ادب   زبان پر نہیں لایا ہوں رُو برو، شاہا!
مگر یہ عرض کہ بے اس کے زندگی ہے محال   رُکا ہے اگلے مہینے سے میرا درماہا

اور آخر میں دعائیں دیتے ہوئے قصیدہ ختم کر دیتے ہیں :

دعائیں عیش کی یہ سب قبول ہوں یارب !
بحقِ سورۂ یٰسین و سورۂ طاہا

دوسرا قصیدہ جشنِ عید الفطر کی تہنیت میں کہا گیا ہے ۔ کہتے ہیں :

ہلالِ عید کو ہوتا کبھی نہ شرفِ کمال   رکاب سے تری دیتے اگر نہ اس کی مثال
اسی سے خلق میں ہے احترام اس کا شہا!   کہ آئے ہے ترے پابوس کے لیے ہر سال

یہ قصیدہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے اُن تقاریب اور رسوم کی تفصیل

معلوم ہو جاتی ہے، جو اس موقع پر سلطنتِ مغلیہ کے آخری ایام میں لال قلعے میں منائی جاتی تھی۔ اگرچہ بعض اور مصنفین نے بھی ان کا ذکر کیا ہے، لیکن ایک تو ان میں سے کوئی ہمعصر نہیں کہ اس نے آنکھوں دیکھی بیان کی ہو اور اس پر کامل یقین کیا جا سکے۔ دوسرے، یہ بیانات نثر میں ہیں۔ عیش نے اپنے چشم دید حالات نظم میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

اب دیکھیے کہ اس موقع پر کیا اہتمام کیا جاتا تھا:

یہ عیدِ جشن میں اس کے مقدمہ ہے، سُنا
اب اس کے جشن کا بھی حال سُن لے بالاجمال

یہ پہلے جشن سے ہوتی ہے تورہ بندی وہاں
جہاں میں پہنچے ہے ہر اک کو اس کا خوانِ نوال

اور ایک رسم مقرر ہے پیشتر دو دن
جلوسِ جشنِ مبارک سے بھیگتی ہے دال

اور اس کے دوسرے دن اس کی پیس کر بیٹھی
بڑا اکڑا ہی میں ڈالے ہیں مل کے خیر سگال

مگر ہوئی نہیں اس رسم کی مجھے صحت
سُنے ہیں میں نے بہت اس میں مختلف اقوال

وے خیال میں میرے یہ بات آئی ہے
کہ ہے تیمناً اس ملک میں یہ رسمِ کمال

کہ پہلے شادی سے ہوتا ہے رتجگا بھی ضرور
ہوئی اسی سے مروّج ہو یہ جہان میں چال

اور اس کا تیسرا دن عین دن ہے شادی کا
کہ جمع ہوتے ہیں سب، آکے دیکھنے کو جمال

وہ حکم ہوتا ہے دربارِ عام کا اُس دن
جو چاہے روکے کسی کو، کوئی نہیں ہے مجال

ہے اس مکان کا دیوانِ خاص نام، سُنا
کہ جس میں ہوتا ہے یہ جلوۂ ظہورِ جلال

رکھے ہیں پہلے وہاں لا کے تختِ طاؤسی
وہ تخت، چرخ ہے بس جس کا پایۂ اجلال

حضور آ کے بس، اُس تختِ عرشِ عظمت پر
جلوس کرتے ہیں باصد شکوہ و عزّ و جلال

پھر اس کے بعد مقرر ہیں جو قرینے وہاں
کھڑے ہوئے ہیں اُسی طرح سب قرین دفصال

ہیں آگے سب سے ولیعہدِ عصر تخت کے پاس
بزیرِ سایۂ ظلِّ خدائے با افضال

کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح شاہ رُخ مرزا
بصد متانت و تمکیں و عزّت و اجلال

اور اُن کے پاس کھڑے ہیں گے فخرِ دیں مرزا
بہ پیشِ تختِ شہنشاہِ دیں بریں منوال

جنابِ میرزا فرخندہ شاہ عالی قدر
کہ اُن پہ چشمِ عنایت حضور کی ہے کمال

سو اُن کی جا دلِ حضرت میں ہے، کہوں کیا بس
کہ اُن کے واسطے کس طرح کا ہے عزّ و جلال

کھڑے ہوئے ہیں وزیر الممالک اور بخشی
ہر ایک اپنی جگہ، شاد و غم سے فارغ بال

حکیم اور ارکینِ سلطنت سارے
کھڑے ہوئے ہیں قرینے سے سب یمین و شمال

کھڑے ہوئے ہیں مودب، کہیں نظارت خان
کہیں ہیں شیدی زمرد، کہیں ہیں شیدی بلال

خواص اپنے قرینے سے سب، کھڑے ہیں لیے
آگالدان، کوئی مورچھل، کوئی رومال

ہیں ایک سمت کھڑے خوشنویس اور شاعر
کھڑے ہوئے ہیں نجومی کہیں، کہیں رمّال

نجومیوں میں جو ہندو ہیں، ان کا حال ہے یہ
بڑھا بڑھا قدم، اور ہاتھ کو نکال نکال

وہ اپنی بولی میں آشیرباد دیتے ہیں
کہ رکھے جلوہ یہ قائم سدا، سری گوپال

اسی طرح سے غلامی میں اس کی حاضر ہیں
کہاں تلک کہوں ہر ایک فن کے اہلِ کمال

بجے ہے ایک طرف بین، ایک طرف قانون
کوئی رباب بجاتا ہے، اور کوئی گھنٹال

وہ اپنی اپنی جگہ گاتے ناچتے ہیں کھڑے
چمک چمک کے خوشی سے طوائف و قوّال

عجب طرح کا سماں بندھ رہا ہے کیا کہیے
کہیں ہیں بھانڈ، کہیں بھگتیے، کہیں نقّال

ہر ایک روپ میں بہروپیے دکھاتے ہیں
کمال اپنا وہاں، بس بدل بدل اشکال

جھنگڑ جھنگڑ بڑی نوبت خوشی کی بجتی ہے
خوشی سے بھر کے ہے ہاتھوں میں جھانجھ دے دے تال

اِدھر کو گاتے ہیں شہنا نواز شہنا میں
کہ ہووے سب شادیاں مبارک پھلا پھلا کر گال

یہاں تلک کہ جو ہیں تخت پہ بنے طاؤس
خوشی سے ناچے ہیں وہ بھی کھول کر پر و بال

قلار اپنی جگہ اس ہجومِ خلقت میں
لیے کھڑے ہیں پئے اہتمام چھڑیاں لال

ہر اک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مجرا
بہ پیش گاہِ شہنشاہِ صاحبِ اقبال

وہاں کھڑے ہوئے بس چوبدار اور نقیب
خوشی سے اپنی جریب اور چھڑی سنبھال

ـــہ کھڑتال؛ کھٹتال

پکارتے ہیں کہ آداب سے کرو مجرا — جہاں پناہ سلامت کا ہو فزوں اقبال
ادھر سے گزرے ہے ملکوں سے پیشکش اور نذر — اُدھر سے ہوتے ہیں خلعت عطا فراخورِ حال
کہیں کھڑی ہیں سلامی کے واسطے توپیں — کہیں کھڑے ہیں شتر نال اور کہیں گھڑ نال
اور اُس کے صحن میں بس فیلِ کوہ پیکر بھی — ہوئے ہیں مجرے کو حاضر لگا لگا کر ڈھال
اور اسی طرح سے جو حاضر ہیں اسپِ خوش رفتار — بھری ہوئی ہیں، سُنا موتیوں سے ان کی ایال
ہرت پھرت میں وہ محبوبیاں ہیں ان کی کہ بس — سمندِ ناز بھی دیکھے تو بھول جاوے چال

چوتھے قصیدے میں ایک جدّت کی ہے۔ یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفرؔ کے سالانہ جشنِ جلوس کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ اس میں بھی تشبیب بہاریہ ہے لیکن بہار، اُس کی قوّتِ نامیہ اور ہوا کی لطافت کا ذکر کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں:

بہارِ حسن کا عالم یہ ہے کہ عالم میں — نظر پڑیں ہیں وہ پریوں کے ہر طرف جھومر
جو دیکھ لیوے کبھی ماہ ان کی پیشانی — تو رگڑے اپنی جبیں ان کے در پہ شام و سحر

اور اس کے بعد ۴۰ سے ۵۰ شعروں میں مزے لے لے کر ان حسینوں (پریوں) کا سراپا بیان کر دیا ہے جس میں پیشانی اور ابرو سے لے کر پشتِ پا تک کے تمام اعضا کے حسن و خوبی کا ذکر ہے۔ یہاں سے دوسرا گریز کیا ہے:

اسی طرح سے ہے سارے جہاں میں جوشِ نشاط
اسی طرح سے ہیں سب مستِ بادہ و ساغر

اس عالمگیر خوشی کے بارے میں چند شعر لکھ کے نسیمِ سحر سے پوچھتے ہیں، یہ تیسرا گریز ہے۔

وہ کیا نوید ہے، یہ جس سے ہے خوشی ہر جا — وہ مژدہ کیا ہے کہ خوش جس سے ہے ہر ایک بشر
ہوا ہے ناخنِ الطاف کس کا عُقدہ کُشا — کہ ہو گیا ہے سراپا یہ آب عقدِ گہر
نسیمِ لطف و عنایت نے کس کی عالم میں — دیا ہے جامۂ گُل عطر سے بہار کے بھر
خوشی ایسا کون ہوا ہے جہاں میں، کہہ تو سہی — خوشی سے جس کی یہ عالم میں ہے خوشی گھر گھر

ہوا ہے کیا سبب انبساط عالم میں | خدا کے واسطے کہہ مجھ سے تو، دریغ نہ کر
یہ سن کے مجھ سے نسیم سحر لگی کہنے | سبب جو پوچھے ہے تو، کیا نہیں ہے تجھ کو خبر
جلوسِ جشن مبارک ہے اس کا آج، جسے | خراج دیتے ہیں خاقانِ چیں سے تا قیصر

یہاں آٹھ شعر "اس کا" کی توضیح میں لکھ کے بالآخر بیتِ اسم کہتے ہیں:

وہ کون یعنی شہِ بوظفر سراج الدین
کہ ہے وہ سایۂ حق، جانشینِ پیغمبر

اور یہاں ایک اور جدّت کی ہے:

چل، اس کی مدح میں لکھ، عیشؔ اک کے بسم اللہ | تو چند شعر بطرزِ نو و بنوعِ دگر
یہ سن کے اس سے اٹھا میں نے خامۂ رنگیں | لکھے یہ شعر تری مدح میں شہا، یکسر
مری زباں پہ نہ ہوں کیونکہ بلبلیں عاشق | نہ ہو کلام مرا کیونکہ رشکِ صد گلِ تر
مرا مدیح ہے تو، اور میں ترا مدّاح | کہ تیرے در کی غلامی ہے فخرِ صد سنجر

اور اس کے بعد انیس شعر فارسی میں لکھ دیے ہیں۔ اسی کے لیے انھوں نے اوپر "بطرزِ نو و بنوعِ دگر" کا اشارہ کیا تھا۔ یعنی اردو قصیدے میں فارسی اشعار "بطرزِ نو و بنوعِ دگر" کلام تھا۔ لیکن اچانک چونکتے ہیں اور فرماتے ہیں:

کُمیتِ خامہ ترا ہند سے سُوے فارس | ہوا ہے گرمِ عناں، روک، جائے ہے یہ کدھر

اور اس پر پانچ چھ دعائیہ شعر کہہ کر قصیدہ ختم کر دیا ہے۔ ان جدّتوں کے باعث یہ مجموعے کا طویل تریں قصیدہ ہو گیا ہے، اس میں (۱۳۶) شعر ہیں۔ یہ ان کا کامیاب ترین قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا، قصیدہ گوئی عیشؔ کے بس کی بات نہیں۔ سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدوں سے جو فضا پیدا ہوتی ہے، اور ان کی زبان کے جوش و خروش اور شان و شکوہ اور مضمون آفرینی سے قاری کے دل میں جو انبساط اور ولولہ پیدا ہوتا ہے، وہ عیشؔ کے قصائد کے پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے قصیدوں کی زبان اور اس کا دروبست ان کی غزل سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے، گویا ہم ذرا طویل

قطعات پڑھ رہے ہیں، جن کے شروع میں خانہ پری کے لیے بہار یہ تمہید (تشبیب) کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

رباعیات:

رباعیات (اور قطعات) کا حصّہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن بہت جاندار ہے۔ ان کی تعداد (۱۳) ہے، اور وہ ان میں کامیاب رہے ہیں۔ آغاز حمد و نعت اور دعا سے کیا ہے۔ اس کے بعد بعض اولیاء اللہ سے استمداد کی ہے۔ ان میں حضرت شیخ محی الدّین عبدالقادر جیلانیؒ، سلطان الاولیا، نظام الدّینؒ، طوطیِ بوستانِ محبوبِ الٰہ (حضرت امیر خسرو) کے نام خاص طور پر لیے ہیں۔ اس سے ان کے مزاج کی کیفیت اور معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔ حضرت محی الدّینؒ والی رباعی میں کہتے ہیں:

جنابِ غوثِ اعظم، حضرتِ محبوبِ سبحانی تمھارا اسمِ اقدس ہے محی الدّین جیلانی
غلامِ بے بضاعت، عیشؔ، موروثی تمھارا ہے نظر فرما تو اس کے حال پر، اے قطبِ ربّانی

تیسرے مصرع (غلامِ بے بضاعت، عیشؔ، موروثی تمھارا ہے) سے معلوم ہوا کہ عیشؔ کے عقائد موروثی تھے، یعنی ان کے آبا و اجداد بھی حضرت غوثِ اعظمؒ کے مرید اور معتقد تھے۔

کس تضرّع سے اپنے پیر کو خطاب کیا ہے:

تو حال پہ میرے کر توجہ، یا پیر! رہتا ہوں میں فکر سے نہایت دلگیر
کر حق میں دعا میرے کہ ہوں میں لاچار بن آتی نہیں ہے مجھ سے کوئی تدبیر

دوسری اصناف کے مقابلے میں رباعی مشکل صنفِ سخن ہے۔ غزل کا ہر ایک شعر آزاد اکائی ہے۔ آپ جو مضمون چاہیں، اس میں بیان کیجیے، تسلسل کی ضرورت نہیں ہے۔ قطعے کی طوالت شاعر کے منشا اور قادر الکلامی پر منحصر ہے۔ اس میں وزن کی بھی کوئی قید نہیں۔ اس کے مقابلے میں رباعی پر کئی پابندیاں ہیں۔ اگرچہ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں لیکن ایک رباعی میں ایک ہی مضمون ہوگا۔ اور یہ پورا مضمون بھی چار مصرعوں میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کے اوزان مقرر ہیں، رباعی صرف انھیں میں کہی جا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کامیاب رباعی گو بہت

کم ہوئے ہیں۔

عیشؔ کا میلان جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مذہب کی طرف تھا۔ اس لیے ان کی رباعیوں میں بھی زیادہ تر اخلاقیات کے مضمون ملتے ہیں۔ مثلاً یہ دو تین رباعیاں دیکھیے:

عیشؔ! اپنے عہود تم نہ توڑو، سوچو
عہدوں سے تم اپنے منھ نہ موڑو، سوچو
بدعہد تھی جہاں میں ہو گئے مشہور
یہ بات بُری ہے، اس کو چھوڑو، سوچو

باتوں میں جو باغِ سبز دکھلاتے ہیں
اس عہد میں، ہاں، وہی تو پھل کھاتے ہیں
ہیں راست سرشت جو کہ اس گلشن میں
وہ سرو کی طرح بے ثمر جاتے ہیں

پہچاننا آدمی کا آسان نہیں
انسان کی یہاں کسی کو پہچان نہیں
اب زعم میں اپنے سب یہی جانتے ہیں
جو چرب زبان نہیں، وہ انسان نہیں

ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

دیکھ کر ان کی دورنگی، دل ہے سینے میں خموش
اس منافق پیشگی سے اپنے بس اُڑتے ہیں ہوش
لاکھ کی یہ ایک ہے، ان سے نہ مل تو، عیشؔ! کیوں
ہیں یہ ابنائے جہاں، گندم نما و جَو فروش

عیشؔ نے بہت کم رباعیاں کہی ہیں۔ دراصل ان کا میدان غزل کا ہے۔ لیکن جتنی رباعیاں بھی انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں، وہ قابلِ قدر ہیں۔ آخر میں دو رِندانہ رباعیاں سُنیے:

آنکھوں نے نہ دیکھی کج ادائی ایسی
کانوں نے سنی نہ بے وفائی ایسی
کیا ظلم کیا، بُتوں سے مُنھ پھیر لیا
کس کام کی، عیشؔ! پارسائی ایسی

کل بزم میں بھر کے ایک پیالی مے کی
کرنے لگے یہ صفت گلابی مے کی
اس دور میں سب کے وعدے جھوٹے ہیں سُنا
ثابت ہے فقط نمک حلالی مے کی

اخلاقیات:

مذہب اور تصوّف سے دلچسپی انسان کو نیک و بد اور بھلے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ وہ خود ہی نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر نہیں کرتا، بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اسی راہ پر چلیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے، وہ اپنے دوست احباب کو، اور سارد گرد رہنے والوں کو بھی تلقین کرتا ہے۔ عیشؔ چونکہ شاعر ہیں، اسی لیے وہ یہ کام شعر سے لیتے ہیں۔ ان کے کلام میں انگنت شعروں میں اخلاقی تعلیم و نصیحت دی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

توڑ سکتا ہے، تو بس نفس کو دے اپنے شکست　　اور بنانا ہے، تو قصرِ دلِ احباب بنا

یہ عیشؔ جلے غور ہے، شکوہ ہو اُس کا کیا　　انسانیت سے اپنی جو انساں نکل گیا

عیشؔ سب اپنی برائی ہے، نہیں کوئی برا　　سب بھلے ہیں یہ، اگر آپ ہے انساں اچھا

آدمی کو شکل و صورت سے نہ کہیے آدمی　　آدمی، جب آدمی میں آدمیّت ہو، تو ہو

مروّت جس کو کہتے ہیں، وہ شرطِ آدمیّت ہے　　جہاں میں چاہیے ہے پاس ہو انساں کو انساں کا

جانور ہے، نہ ہو انسان میں گر شرم و حیا　　کیوں، ہے انساں میں فقط شرم و حیا کی خوبی
خوبیِ اہلِ دُوَل، دولت و حشمت سے نہیں　　متواضع ہو، یہی ہے امراء کی خوبی

نہ ہوگا مال کبھی طیّب و حلال خراب　　خراب ہوگا وہی، ہوگا جو کہ مال خراب
نکال اپنے نہ تو منھ سے، دیکھ، فال خراب　　یہ کیونکہ کرتی ہے فالِ خراب، حال خراب
یہ واقعی ہے کہ بد کام کا ہے بد انجام　　نہ کیونکہ ہوئے برے کام کا مآل خراب

اس واسطے ہے صحبتِ تیر و کماں میں فرق | بھاگے ہیں کج سرشتوں سے جو راست باز ہیں

رکھا جہان میں انسان کی زبان پر ہے | مدارِ دوستی و دشمنی کا، اللہ نے

غرض بیشمار شعروں میں اسی طرح کے اخلاقی مضامین بیان کیے ہیں جنھیں اپنا کر انسان اپنی زندگی سنوار سکتا ہے۔

اخلاقی تعلیم بعض اوقات بالواسطہ طور پر اس طرح بھی دی جاتی ہے کہ اس دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہو، اور یہاں کے مال و منال اور عزّ و جاہ کی عارضی حیثیت کا بیان ہو، تاکہ سننے والے کے یہ دلنشین کیا جائے کہ جس چیز کے حصول کے لیے تم جائز اور ناجائز وسائل استعمال کر رہے ہو، اور ناحق گوئی اور مردم آزادی کے مرتکب ہو رہے ہو، اسے دوام نہیں۔ پس جب نہ تمھاری زندگی دائمی ہے، نہ اس دنیا اور ما فیہا کو دوام، تو اس کے لیے اپنی مساعی کیوں ضائع کر رہے ہو! اس کی جگہ کیوں نا، اپنی بساط بھر، اُس زندگی کے لیے کچھ سامان کر لو، جو ہمیشہ رہنے والی ہے جسے زوال نہیں، نہ اسے ہم سے کوئی چھین سکے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

آئیگی اجل! نہیں ہے چارا اس میں | بچ رہوے، نہیں کسی کو یارا اس میں
کھوتے ہو جو عمر فکرِ دنیا میں تم | تم مانو، ہے سربسر خسارا اس میں
دنیا نہیں جائے استقامت، سمجھو | اک آن کی آن، ہے گزارا اس میں
جو ہو سکے خیر! اس میں تم بھی کر لو | آنا نہیں جا کے پھر دوبارا اس میں
ہو گزرے ہیں بادشاہ کیسے کیسے! ق | جمشید و سکندر و دارا اس میں
پھر آخرِ کار، اجل نے، دیکھو | کس کس حسرت سے ان کو مارا اس میں

تم سوچو، بقولِ عیشؔ، سچ ہے یہ بات
اک آن کی آن، ہے گزارا اس میں

غدریہ شاعری:

۱۸۵۷ء میں ہندستانیوں نے غیر ملکی تسلّط کا جوآ گردن سے اتار پھینکنے کی

کوشش کی اور انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ فتح وشکست تو قسمت کے ہاتھ میں ہے۔
لیکن دلِ ناتواں نے مقابلہ خوب کیا۔ اس شکست کے بعد دلّی پر اور دلّی کے رہنے والوں پر جو
گزری، آج سوا سو برس گزر جانے کے بعد بھی اس کا حال پڑھ کر کلیجا منھ کو آتا ہے۔ دیسی
سپاہ نے اپنے چند ماہ کے اقتدار کے زمانے میں ضرور انگریزوں پر ظلم کیا تھا۔ لیکن اس کا
خمیازہ بھی دلّی والوں کو ایسا بھگتنا پڑا کہ توبہ ہی بھلی! محلّے کے محلّے زمین کے برابر کر دیے گئے۔
عالیشان مکان اور حویلیاں مسمار ہو گئیں اور ان کی جگہ چٹیل میدان نے لے لی۔ شہر ویران
ہو گیا۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو خانہ بدر ہو کر مدّتوں دشت و بیابان کی خاک چھاننا پڑی۔
عیشؔ بھی انھیں بدقسمتوں میں سے تھے۔ خدا معلوم، مصیبت کے یہ ایام انھوں نے کس جگہ کاٹے۔
اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔
لیکن ان کی بقیہ عمر اسی کا رونا روتے گزری۔ ان کی شاعری پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ
دیوانِ دوم انھیں زار نالیوں سے بھرا پڑا ہے۔

جب حالات قدرے معمول پر آئے اور امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی تو دوسرے
بے خانماں بدنصیبوں کی طرح عیشؔ کو بھی وطن واپس آنے کی جرأت ہوئی۔ آنے کو تو آگئے،
لیکن اب یہ وہ دلّی نہیں تھی جسے وہ بھرا پُرا اور آباد و شاداب چھوڑ گئے تھے:

مل گئی خاک میں شانِ دہلی　　نہ رہا نام و نشانِ دہلی
نہیں برباد ہوا کوئی مکاں　　آہ، دنیا میں بسانِ دہلی
ہو گیا، کیا کہوں، پامالِ ستم　　ہائے، ہر ایک مکانِ دہلی

انھیں احباب اور ان کے جلسے اور محفلیں اور شہر کی چہل پہل یاد آتی، تو دل مسوس
کے رہ جاتے۔ اور حیرت سے پوچھتے کہ یا الٰہی! یہ کس جرم کی سزا ہے، جو اس شہر
کو ملی:

کیا جانے اہلِ دہلی سے کیا بات ہو گئی　　جو دہلی ایسی موردِ آفات ہو گئی
تھی رات واں کی دن سے بھی روشن زیادہ تر　　یا وہ ہی ہے کہ دن کی وہاں رات ہو گئی
ہر شب، شبِ برات تھی، ہر روز روزِ عید　　یا اب، وہ جا محلِّ مخافات ہو گئی

زندگی بیفکری اور امن چین سے بسر ہو رہی تھی۔ لال قلعہ تھا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر لاکھ کمزور اور بے اختیار سہی، اپنے صاحبِ جبروت و سطوت بزرگوں کا نام لیوا مقیم تھا۔ لوگوں کو اس پر فخر تھا۔ وہ اُسے اپنے وقار و عزّت کا نشان، اور مصیبت میں محافظ اور پشت پناہ خیال کرتے تھے۔ عیشؔ نے تمام ہموطنوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے:

اس گئے گزرے زمانے میں بھی یہ گھر وہ ہے　　سب دیا کھاتے ہیں اب تک بھی یہیں کا ٹکڑا
بو ظفر نام ہے اُس زینتِ اورنگ کا آج　　پھیلتا سب میں ہے جس تخت نشیں کا ٹکڑا

عیشؔ! آباد رکھے خالقِ اکبر اس کو
کیونکہ ہے وہ دلِ تیمورؒ کے نگیں کا ٹکڑا

لیکن یکایک ہوا پلٹ گئی۔ قلعے پر یونین جیک لہرانے لگا اور بہادر شاہ قید ہو کر رنگون بھیج دیا گیا۔

عیشؔ ہی کو کچھ نہیں صدمہ جدائی کا تری
مبتلائے غم ہے اک عالم، ظفرؔ! تیرے لیے

ظفر نے نظر بندی ہی کی حالت میں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ ان کی رحلت کی خبر سُن کر اُن کے اور دلّی والوں کے دل پر کیا گزری، اس کے لیے کہتے ہیں:

رونقِ حضرتِ دہلی تھی اُسی کے دم سے
بعد مرنے کے کُھلی سب پہ ظفرؔ کی خوبی

ظفرؔ کی تاریخ وفات (فارسی میں) کہی تھی، جو دیوانِ دوم کے آخر میں موجود ہے۔ افسوس کہ اس کے آخری شعر جن میں تاریخ تھی، ضائع ہو گئے ہیں۔

جب دلّی واپس آئے اور یہاں کی ویرانی نظر سے گزری، تو کس درد و غم اور یاس والم کے عالم میں یہ شعر کہے ہونگے:

حالِ عالم آہ، کیف و کم میں، کیا تھا، کیا ہوا
یا اولی الابصار! دیکھو دم میں، کیا تھا، کیا ہوا

جائے عبرت ہے، کہوں کیا تم سے، اے اہلِ نظر
دفعتہً دیکھو تو رنگ عالم میں، کیا تھا کیا ہوا
فصلِ خوردی وجوانی تو، وہ گذری چین سے
اب رہی پیری، سو اس موسم میں، کیا تھا کیا ہوا

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلّی اور احباب اور یہاں کے صاحبانِ کمال وجمال کو یاد کرتے ہیں، تو خون کے آنسو رونے لگتے ہیں۔ کس حسرت سے انھیں یاد کرتے ہیں:

وہاں کا مجمعِ اہلِ کمال و اہلِ ہنر — وحیدِ عصر تھا وہاں کا ہر ایک فردِ بشر
رکھے تھا ہمّتِ عالی ہر اک بلند اختر — کسی کو فیض ہو، تھا ان کو یہ ہی مدِّ نظر
ہر اک طرح کا وہاں فیض اُن سے جاری تھا
ہر ایک شخص پہ القصہ فضلِ باری تھا

وحیدِ عصر تھے جو اہلِ علم و فضل و کمال — جہاں میں دولتِ جوہر سے تھے وہ مالا مال
ہر ایک عقدے کو ناخن تھا ان کا بس حلّال — اور ان کمالوں کے تھے ساتھ صاحبِ اقبال
زمیں کی سطح پہ فیض اُن سے اک جہان کو تھا
زمیں پہ، ان کے سبب، رشک آسمان کو تھا

یا یہ فیض کا چشمہ جاری تھا، یا ویرانی ہوئی، تو ایسی کہ

اب دل کو ہے مثلِ آئینہ کے حیرانی — بسانِ زلف کے خاطر کو ہے پریشانی
کہ اس طرح کی لطافت جہاں تھی ارزانی — یہ دل میں کہتا ہوں بس دیکھ کے واں کی ویرانی
الٰہی! خواب تھا، یا وہ خیال تھا، کیا تھا؟
وہ واقعی تھا کہ، یا احتمال تھا، کیا تھا؟

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی — نہ تھی مجال صبا کی، جو واں تلک جاتی
خدا نے دی تھی انھیں ایسی عصمتِ ذاتی — کہ نام غیر جو سنتیں، تو اُن کو شرم آتی
فلک نے بخشا ہے ان لو لباسِ عُریانی
ہے ستر ان کے لیے، ان کی پاک دامانی

غرض بیتے دنوں کو یاد کرکے آہیں بھرتے ہیں۔ اور موجودہ تباہی اور ویرانی کو دیکھ دیکھ کر خود روتے اور دوسروں کو رُلاتے ہیں۔ اور بالآخر قادرِ مطلق کی بارگاہ میں دستِ دُعا اٹھاتے ہیں:

الٰہی! کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو
مئے نشاط سے بھر دے ایاغِ دہلی کو
دلوں سے خلق کے تو دھوئے داغِ دہلی کو

دُعا ہے تجھ سے یہی، اے مسبّب الاسباب
کر اپنے ابرِ کرم سے وہ باغ پھر شاداب

لکھنؤ کا مرثیہ:

تعجّب کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ ان کا اپنا رنگِ سخن لکھنوی ہی تھا، وہ لکھنوی شعرا اور ان کے طرزِ کلام کے خلاف تھے۔ اور اس کے اظہار میں کسی لگی لپٹی رکھنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ کہتے ہیں:

صبا، گزر ہو اگر تیرا لکھنؤ کی طرف
تو اتنا کہیو تو، واں کے زباندانوں کو
کہ گر ہزار برس، اتنی بات یاد رکھو،
اس آرزو میں کھپاؤ گے اپنی جانوں کو
کہ اہلِ دہلی کی تقلید ہم زباں میں کریں
تو تم نہ پہنچو گے ان کی کبھی زبانوں کو

اس عام یلغار کے بعد شخصی حملہ کرتے اور دُو بدو مقابلے کی دعوت دیتے ہیں:

ناسخ و آتش سے یہ کہہ دو کوئی، تم نے بھلا
طرزِ عیش و حضرتِ ذوق و ظفر پائی کہاں!

لیکن لکھنؤ کے شعرا اور ان کی طرزِ سخن کی مخالفت اپنی جگہ! جب غدر کے بعد دلّی کی طرح لکھنؤ پر بھی کوہِ الم ٹوٹا، تو بیتاب ہو گئے۔ جس طرح ایک مصیبت زدہ کسی دوسرے مظلوم و مغموم کو دیکھ کر بےچین ہو جاتا ہے اور اس سے ہمدردی کرنے لگتا ہے کیونکہ اس طرح خود اس کی اپنی مصیبت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، انھوں نے لکھنؤ کی ویرانی کا حال سُنا، تو اس سے ان کے ذہن میں دلّی کی ویرانی کا غم تازہ ہو گیا، اور

پھر دونوں کا مشترک مرثیہ کہہ ڈالا:

ہوگیا ویران دہلی و دیارِ لکھنؤ! — اب کہاں وہ لطفِ دہلی و بہارِ لکھنؤ
باغِ دہلی تو ہوا یوں یک قلم برباد، اور — مل گیا سب خاک میں نقش و نگارِ لکھنؤ
اہلِ جوہر تو ملائے خاک میں دہلی کے واں — رہ گئے یاں بے سروپا وضعدارِ لکھنؤ
جو تھے دہلی میں عمائد، وہ کیے یکسر خراب — اور تبہ سارے کیے صاحب وقارِ لکھنؤ
تھا خس و خاشاکِ دہلی غیرتِ صد لالہ زار — رشکِ صد گلزار تھا ایک ایک خارِ لکھنؤ
سو فلک نے یوں کیا دہلی کو تو پامالِ جور — اور کیا وقفِ جفا ہر برگ و بارِ لکھنؤ
رشکِ صد خورشید تھا، ہر ذرّۂ دہلی، سُنا — مارتا چشمک صفا پر تھا غبارِ لکھنؤ
غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں — اور سوسن ہے چمن میں سوگوارِ لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے، عیشؔ!
اور دل پھٹتا ہے سن کر حالِ زارِ لکھنؤ

کلامِ عیشؔ کے بعض خصوصیات اور عیوب:

رعایتِ لفظی

عیشؔ کے کلام میں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو موجودہ دَور میں بنظرِ استحسان نہیں دیکھی جاتیں۔ محاورہ کا کلام میں آنا خوبی ہے۔ لیکن لکھنؤ نے اس کی بیجا توسیع کر کے رعایتِ لفظی اس کے ساتھ ملا دی۔ دلّی کے بعض شعرا بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے، اگرچہ دو ایک کے سوائے کسی کے ہاں اس نے بدنما شکل اختیار نہیں کی۔ عیشؔ نے بھی اسے دیوان دوم میں استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ صرف گنتی کے چند اشعار ہیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ تجربے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

اس نے زخموں پہ کی نمک پاشی — ہم سے حقِ نمک ادا نہ ہوا

خدا کے واسطے دیکھو تو یہ کیا کج ادائی ہے — سوالِ بوسہ پر کہتے ہو میں سیدھی سناؤں گا

ہاتھ کو پہلے تو اپنے کھینچ لے پھر جدھر چاہے تو لے پیر کر

قافلے والوں سے کہہ دو: تم چلو ہم بھی آتے ہیں کوئی دم ٹھیر کر

آئینہ صاف دھوکے کی ٹٹی ہے، دیکھنا باطن میں کوئی اس سے کدورت بھرا نہیں

قصۂ بے سر و پائی کو مرے سن کے کہا بات وہ کہیے کہ جس بات کا ہو کچھ سر پاؤں

یاد میں اس بتِ نجار پسر کے شب و روز ٹکڑے کرتے ہیں پڑے غم کے بسولے دل کے

ہے جس کا در سجدہ گاہِ عالم، بتا دے، واعظ! وہ قاعدہ تو
کہ جس کے باعث ہو اس کے جلسے میں اپنی صورت قیام کی بھی

ان سب شعروں میں رعایتِ لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن دو ایک جگہ کے علاوہ کہیں آورد کا گمان نہیں گزرتا، بلکہ بے ساختگی کی فضا قائم رہی ہے۔

جمع الجمع انھوں نے بعض شعروں میں جمع الجمع کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو آج تو کیا، خود ان کے زمانے میں بھی کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔ جمع الجمع کے بعض الفاظ جمع کی جگہ آج بھی زبان میں مستعمل ہیں اور وہ غیر فصیح تصور نہیں کیے جاتے مثلاً وجوہات، ادویات، دیہاتوں وغیرہ لیکن عیش کے ہاں ایسے الفاظ کی موجودگی سے یہی خیال ہوتا ہے کہ یا تو وہ ان الفاظ کو ٹھیک سمجھتے تھے، یا پھر انھوں نے توجہ نہیں کی۔ لکھتے ہیں:

استخواں ریزہ پہ کرتا ہے قناعت جو وہ اس سے ہے سارے طیوروں میں ہما کی خوبی

ساتھ اغیاروں کو لے لے کے پھرا کون بھلا یہ سرِ اپلے، کدھر سے کھو شہر کا نکلا

وہ نگاہیں کہ جو دل چھنتے تھے زہّادوں کے　　اور پابند وہ دل کرتے تھے آزادوں کے

اور وہ کر لیتے تھے قابو میں دل عبّادوں کے　　بید کی طرح سے دل کانپتے تھے جلّادوں کے

ان شعروں میں جمع الجمع کا استعمال ناگوار گزرتا ہے۔

واوِ عاطفہ کا استعمال

شعر ہے:

وہ ناتوان تھا دلِ عاشق کہ جس کا، آہ　　نالہ کبھی زمین و کبھی آسماں میں تھا

اس طرح بعض جگہ کسرۂ اضافت لکھا ہے:

ڈالا اوقات میں ان اہلِ کمالوں کے خلل
عقدے حل ہوتے تھے جن پاس کہ مالا ینحل

جہاں میں کیسی ہے بیقدریِ گُنی دیکھو　　کبھی سُنی نہ تھی سو اب وہ اَن سُنی دیکھو

ایسی عاطفہ یا اضافت کسی زمانے میں بھی جائز نہیں رہی۔

تذکیر و تانیث ان کے کلام میں بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی موجودہ مسلّمات کے خلاف ہے:

دیکھنا چاہیے لیلیٰ کو بچشمِ مجنوں　　پوچھنا چاہیے بلبل سے پھبن غنچے کا

میں تو کہتا تھا: وہ آوینگے، وہ کہتا تھا: نہیں　　مجھ میں اور دل میں یہی رات کو تکرار رہا

تصوّر میں ترے تیرِ مژہ کے　　رہا سینہ میں دل سے جنگ کیا کیا

اب یہ سب الفاظ۔ پھبن، تکرار، جنگ۔ مونث بولے جاتے ہیں۔ معاصرینِ عیش میں سے بھی کسی کے ہاں یہ مذکر نہیں لکھے گئے۔

تکیۂ کلام

عیش نے بعض الفاظ اس تواتر سے استعمال کیے ہیں کہ یوں خیال ہوتا ہے جیسے یہ ان کے تکیہ کلام تھے ۔ چند شعر دیکھیے :

اجی :

فلک نے زخمِ دل پر عاشقوں کے — لگایا ہے، اجی، تیزاب کیا کیا

میرا کیا مقدور، جو میں وہ تک آتا آپ کے — وہ رقیبوں کی، اجی، آواز پا تھی میں نہ تھا

دہلی کی سرزمیں پہ ہے، ہر ایک دردناک — ارزاں ہے کس قدر، اجی، دہلی نگر میں درد

اور کی کیا حقیقت ہے، اجی، شیطان بھی — سیکھ جائے شیخ جی صاحب سے، مکّاری کی طرز

ملتا ہے دل بھی کہ بہم ہوں صفائیاں — کیونکر ملے جب آوے، اجی، درمیاں میں فرق

سُنا :

آب جو اُس لبِ تر میں ہے سُنا، اے بُلبل! — وہ کہاں پایئے، تیرے گلِ شاداب میں آب

بحر میں عالمِ فانی کے، دل اتنا نہ اُبھر — بُلبلا کیونکہ ہے انسان، سُنا، پانی کا

جو دیکھ لیوے، سُنا، اس کو تو پری کیا ہے — بجا نہ رہویں کبھی حور کے بھی ہوش و حواس

خدا نے عیش! دیے جن کو ہیں دلِ روشن — نظر میں اُن کی ہیں یکساں، سنا، حریر و پلاس

پھولتا پھلتا وہی ہے، باغِ دنیا میں سُنا — عیش! جس سے جان ہے آرام پاتی خلق کی

ہاں :

شوق سے لیجے، یہ حاضر دل و جان دونوں ہیں — کر چکے نذر یہ ہم آپ کی، ہاں، دونوں میں

نہ پوچھا جائیگا عاصی کوئی، ہاں سب سے گر پہلے
کھلے گا حشر کے دیواں میں دفتر میرے عصیاں کا

گر نصیب اچھے ہوں، تو ہاں، خاک بھی ہو جائے زر
اور بُرے ہو ویں، تو حلوہ بھی ہو گا را ہاتھ میں

ہاں، ہاں :

جو سخن ہے باغ میں مذکور، ہاں ہاں قدِ جاناں کا
تو ہر گز بھی نہ ہووے نام قمری سروِ بستاں کا

ہاں، جی ہاں :

کام کیا ہے ناصح کو، کیوں وہ آیا سمجھانے
دے دیا جسے چاہا، دل تھا ہاں جی ہاں اپنا

الفاظ کی تکرار بعض اوقات ضروری ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جس انداز سے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان سے نہ کلام میں زور پیدا ہوا ہے، نہ حسن۔ بلکہ یوں گمان ہوتا ہے کہ لفظ محض شعر کا وزن پورا کرنے کی خاطر مصرع میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ عیب ہے اور شاعر کے عجز کی دلیل۔

اساتذہ کا ادب :

اردو شاعری کا ایک اپنا خدا ہے، جس کا نام میر تقی میر ہے۔ دلّی ہو کہ لکھنؤ، سب جگہ کے بڑے بڑے اساتذۂ فن نے بالاتفاق انھیں خدائے سخن تسلیم کیا ہے۔ عیشؔ بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ معلوم نہیں رکھتے۔ شعروں میں کس کس پہلو سے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے :

ہے سچ تو یہ، شعرائے جہاں میں، عیشؔ، فقط
کلامِ میر ہے البتہ دل پذیر اپنا

تھے کل اشعار سنے ہم نے سبھوں کے، لیکن
سب سے انداز انوکھا غزلِ میر میں تھا

یوں تو سب مصری کی ڈلیاں ہیں، مگر عیشؔ، ہمنا
دل پسند اپنے ہیں ایک میر کے اشعار فقط

کیا زباں پائی تھی اس نے، اور وہ کیا شخص تھا
حق تعالیٰ شاد رکھے، عیشؔ، روحِ میر کو

یوں تو سب اچھے ہیں، پر مجھ سے جو تم پوچھتے ہو
دل پسند اپنے ہے طرزِ سخنِ میرؔ فقط

چونکہ انھوں نے کبھی "زبانِ میرؔ" اور "کلامِ میرزا" سمجھنے کا دعویٰ کیا تھا، اس لیے چلتے چلتے ایک جگہ میرزا سوداؔ کو بھی میرؔ کے ساتھ شریک کر لیا ہے:

اے عیشؔ آشنا جہاں میں اب شخص | پیدا نہیں میرؔ و میرزا سے

دردؔ و اثرؔ تو ان کے پردادا استاد تھے۔ اپنے بزرگوں کی کون تعریف نہیں کرتا۔ ایک شعر میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے:

آگاہ اس سے عیشؔ! دلِ اہلِ درد ہیں | جو ہے کلامِ حضرتِ دردؔ و اثرؔ میں درد

اپنے معاصرین میں سے انھوں نے صرف تین کا نام لیا ہے۔ ظفرؔ، ذوقؔ اور شاہ نصیرؔ ظفرؔ اور ذوقؔ کی برتری وہ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اپنے آپ کو ان کے برابر شاید مدِ مقابل خیال کرتے ہوں۔ شعر ہے:

طرزِ عیشؔ و حضرتِ ذوقؔ و ظفرؔ پائی کہاں | ناسخؔ و آتشؔ سے یہ کہہ دو کوئی، تم نے بھلا

اپنے ہمعصروں میں سے صرف شاہ نصیرؔ کو مانتے ہیں۔ مانتے ہی نہیں، انھیں متقدمین اور متاخرین سب سے افضل اور ان کا استاد گردانتے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ تک کو ان کا حلقہ بگوش بنا دیا ہے:

ہے نصیرؔ! آج تو وہ ملکِ سخن کا دریا | پانی بھرتا ہی تیرے آگے جو مرزا ہوتا
زندہ ہوتے وہ اگر میرؔ علیہ الرحمۃ | ان کو بھی تیری ہی شاگردی کا دعوا ہوتا
اور جو اپنے کو سمجھیں ہیں کہ ہم شاعر ہیں | ان کا مذکور یہی، اے سخن آرا! ہوتا
نام لیتا نہ کوئی شعر و سخن میں اُن کا | تیری شاگردی کا گر اُن پہ نہ چھاپا ہوتا

جہاں نصیرؔ سے عقیدت اس حد تک ہو، ان کا نصیرؔ کی تقلید سے بچنا کیسے ممکن تھا۔ ان کی چند زمینیں ملاحظہ ہوں: جگر کا نکلا، گلِ تر کا نکلا؛ بر سے نکالا، مجمر سے نکالا؛ عرشِ بریں کا ٹکڑا، پتھر کے نگیں کا ٹکڑا؛ دل آیا تو ہوا کیا، خون بہایا تو ہوا کیا؛ وطن غنچے کا، بدن غنچے کا؛ آب ٹھنڈا، سیماب ٹھنڈا؛ پیکاں نکل گیا، مہماں نکل گیا۔ یہ

صرف ردیف الف سے لی گئی ہیں۔ اس سے پورے دیوان کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔
مثال میں صرف ایک غزل کافی ہوگی:

کڑھے ہوئے ہیں وہ اوپر ترے نقاب کے پیڑ
کہ خار کھائیں جسے دیکھ کر، گلاب کے پیڑ

نہ کیوں اُگے مرے ضبطِ فغاں سے نخلِ مراد
کہ سب بناتے ہیں ٹہنی زمیں میں دلب کے پیڑ

یہ کہو شیخ جی صاحب سے: "بے ثمر نکلے
لگائے میں نے جو بھیجے ہوئے جناب کے پیڑ"

یہ برگِ پاں کی طرح دل کی آرزوؤں کے
تمام پھینک دیے غم نے چاب چاب کے پیڑ

غمِ فراقِ بتاں میں، سُنا، اے دل!
نہیں ہیں آہیں، یہ ہیں تیرے اضطراب کے پیڑ

پڑا حباب میں ہے سروِ جوئبار کا عکس
اُگا ہے سرو کا یاں درمیاں حباب کے پیڑ

یہ ہیں خطوطِ شعاعی، کوئی بتاؤ تو
اُگے ہیں یا کہیں چشمے سے آفتاب کے پیڑ

دلِ برشتۂ عُشاق دیکھ لیں جا کر
نہ دیکھے ہووے کسی نے اگر کباب کے پیڑ

لگائے ہیں یہ ترے نخل بندِ فکر نے کیا
زمینِ شور میں، اے عیش! آب و تاب کے پیڑ

اس صورت میں کوئی ان کا یہ دعویٰ کیسے تسلیم کرے گا!

سچ تو یہ ہے، اے عیش! کہ پاتے ہیں یہاں
مرے اشعار میں طرزِ سخن میر کی بو

تعلّی:

آگے بڑھنے کی خواہش انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ اس میں قدرتاً اسے دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں فریقین میں سے ایک ہی کامیاب ہوگا اور دوسرا ناکام رہیگا۔ عام طور پر شکست خوردہ شخص اس کے بعد خاموش ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں وہ مرتبہ پانے کے لائق نہیں تھا۔ لیکن اگر وہ خیال کرے کہ وہ واقعی کامیابی کا مستحق تھا، اور کسی ناانصافی یا غلطی یا کسی اور باعث وہ پیچھے رہ گیا ہے، تو اس کے لیے خاموش رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اب وہ برملا اپنی برتری کا اعلان کرکے دنیا کی ناانصافی کی شکایت کرنے لگتا ہے۔

عیش کے زمانے میں اساتذۂ فن کی کمی نہیں تھی۔ عیش کے لیے بہادر شاہ ظفر اور

ان کے استاد ذوق کے منھ آنا تو ممکن نہیں تھا۔ باقی ہمعصروں میں سے غالب اور مومن پر جو کہ صفِ اوّل کے سخنور تھے، انھوں نے پردے پردے میں وار کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظفر اور ذوق سے بھی کم نہیں سمجھتے تھے۔ ذکر ہو چکا ہے کہ ناسخ اور آتش کو جو لکھنوی طرزِ سخن کے نمایندہ اور سربرآوردہ شاعر تھے، مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ناسخ و آتش سے کہ دو کوئی، تم نے بھلا
طرزِ عیشؔ وحضرتِ ذوقؔ و ظفرؔ پائی کہاں!

اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ تم دونوں لکھنؤ کے چوٹی کے شاعر ہو گے، تو ہوتے رہو۔ دلّی کے چوٹی کے شاعر ہم تینوں ہیں۔ کیا تم ہمارا مقابلہ کر سکتے ہو؟

انھوں نے بارہا میرؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ میرے کلام میں "طرزِ سخن میرؔ کی بو" ہے، اپنے "میرِ عصر" ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔

غرض ناکامی کا نتیجہ ہو یا اپنی قابلیت کا غیر معمولی احساس، بیشتر اصحابِ فن تعلّی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عیشؔ کا بھی یہی حال ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بہت جگہ تعلّی کی لی ہے۔ اور اس میں بالعموم میرؔ کو اپنی تائید میں کھڑا کر دیا ہے۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں:

عیشؔ! سن یہ شعر روحِ میرؔ بولی قبر میں
اے جزاک اللہ، زباں سحر آفریں اتنی تو ہو

ایک اور مقطع ہے:

نہیں سخن فہم اب کوئی، عیشؔ! جو میرؔ ہوتا، تو داد دیتا
وہی سمجھتا کہ اس غزل میں بندھا ہے کس کس ادا سے پہلو

ایک غزل کہی تھی جس کی زمین ہے خواب میں خواب، سراب میں خواب، اس کے مقطع میں اپنے سب معاصروں کو چیلنج کیا ہے:

کہی ہے تو نے غزل جس ردیف و قافیہ میں
کہے تو عیشؔ! کوئی اس کے اب جواب میں خواب

ایک اور مقطع میں پھر یہ چیلنج دوہرایا ہے:

یہ جس زمین میں تو نے غزل کہی، اے عیش!
کسی نے طرح کی ایسی کہی زمین تو ہو

رفتہ رفتہ ایک شعر میں میرؔ و میرزاؔ کی خصوصیات گنوا کر اپنے آپ کو دونوں سے برتر کر دیا:

محاورات و مضامینِ شستہ و رفتہ
وہ طرزِ میرؔ ہے، اور طرزِ میرزاؔ یہ ہے
سو، عیشؔ! پاتے ہیں تیرے کلام میں دونوں
تری زبان میں اعجاز اک نیا یہ ہے

اور بالآخر اس مقام پر پہنچ گئے کہ اپنے "بلبل" ہونے کا دعویٰ کرکے اور سب کو "کوّا" کا خطاب دے دیا:

کلامِ غیر ملے تیرے کب کلام سے، عیشؔ!
ہو ہم صفیر بھلا کیونکہ زاغ بلبل کا

خیر، یہ تو کھسیانی بلّی کھمبا نوچے کا مضمون ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ استادِ زبان اور ماہرِ فن شاعر ہیں۔ ان کے کامیاب شاعر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

عیشؔ نے اردو زبان کے قدیم اور جدید رنگ کے سنگم پر دادِ سخن دی۔ ان کی شاعری اور زبان بہت حد تک قدیم رنگ کی نمایندہ ہے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے کہ انھوں نے زبان کو وسعت دی۔ نہ صرف ہندی کے وہ الفاظ محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی، جو اصلاحِ زبان کی کوتاہ نظر کوشش کے تحت زبان سے خارج کیے جا رہے تھے، بلکہ انھوں نے روزمرّہ کے ان متعدد محاوروں کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی جنھیں بعض فارسی اور عربی کے عالم فصاحت سے فروتر خیال کرتے اور اسی لیے ان کے استعمال سے اجتناب کرتے تھے۔ ان محاوروں کو اپنے کلام میں جگہ دے کر انھوں نے ان کے صحیح اور برمحل استعمال میں ہماری رہنمائی کی۔ ہر ایک زبان ہزاروں لاکھوں الفاظ کا مجموعہ ہے۔ لیکن اگر اس کے بولنے اور لکھنے والے یہ نہیں جانتے کہ کس موقع پر کون سا لفظ مناسب اور موزوں ہے، تو محض زبان کا جان لینا کافی اور مفید نہیں ہو سکتا۔ اصلی چیز ان کا برمحل استعمال ہے۔ اور یہ صاحبانِ زبان اور اساتذۂ فن کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ کسی لفظ کے معانی کی کیا حدود ہیں۔ عیشؔ نے بھی اس

میدان میں قابلِ قدر اور وقیع خدمت سرانجام دی ہے، جس کا اعتراف ضروری ہے:

بیشک، ہم انھیں تغزّل اور معاملاتِ حسن و عشق کے پہلو سے کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دے سکتے۔ لیکن زبان کے ارتقائی سفر میں اسے بیانیہ صلاحیت اور وسعت عطا کرنے میں، ان کی خدمات بھولنے کی چیز نہیں۔ افسوس کہ ان کے متعدد دوسرے معاصروں کی طرح ان کا دیوان بھی آج تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ غدر کے باعث ملک کی سیاسی حالت میں عظیم انقلاب آگیا۔ اور اس کے فوراً بعد یہاں غیر ملکی تسلّط مستقل طور پر قائم ہو گیا۔ انگریزی تعلیم کے زیر اثر رنگِ سخن بھی بدل گیا، اور ہم پرانے سخنوروں کی طرف سے کچھ غافل اور بیگانہ سے ہو گئے۔ شکر ہے کہ حالات نے پھر پلٹا کھایا ہے، اور ہم اپنے مدفون خزانوں کو کھود نکالنے اور انھیں دنیا کے سامنے رکھنے کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہوئے، بلکہ ان پر فخر بھی کرنے لگے ہیں۔

۴۔ دیوان کے مخطوطات

عیشؔ سے دو دیوان یادگار ہیں، جن میں ان کا مختلف اصنافِ سخن میں اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ رہ گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات یا کسی اور وجہ سے، وہ اپنا کلام مرتب نہیں کر سکے تھے۔ اور یوں یہ مدّتوں پریشان حالت میں پڑا رہا۔ بالآخر اسے ان کے دوست غمگیںؔ نے مرتب کیا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

سعیِ غمگیں سے فراہم ہوا دیواں، ورنہ
تھا پڑا یوں ہی کلام، عیشؔ! پریشاں اپنا

غمگین کے بارے میں میرزا فرحت اللہ بیگ کا خیال ہے[1] کہ وہ عیشؔ کے شاگرد تھے۔ لیکن قرائن سے ان کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کسی تذکرہ نگار نے بھی ایسے کسی غمگینؔ شاعر کا ذکر نہیں کیا، جو عیشؔ کا شاگرد رہا ہو۔ تلاش سے تذکروں میں اس تخلص کے صرف دو شاعروں کا نام ملتا ہے:

۱۔ میر سیّد علی خلف میر سیّد محمد (برادر شاہ نظام الدّین احمد قادری)[2]
۲۔ میر سیّد عبداللہ خلف میر حسین تسکین[3]

۱۔ مضامینِ فرحت، ۲ : ۲۱۴
۲۔ گلشنِ بیخار (شیفتہ) : ۱۴۴؛ گلشنِ بیخزاں : ۱۷۵ - ۱۷۶
۳۔ گلشنِ بیخزاں : ۱۷۷

ان میں سے پہلے سید علی غمگین وہی ہیں جن کا محمد حسین آزاد نے نواب الٰہی بخش خاں معروف کے استاد کی حیثیت سے ذکر کیا ہے[4]۔ یہ یقیناً عیشؔ سے بڑے ہوں گے اور ان کا عیشؔ کا شاگرد ہونا بہت مشکل ہے، دوسری بات یہ کہ یہی وہ صاحب ہیں، جن کے پاس مجرم اکبرآبادی دلّی آنے کے بعد ٹھہرے تھے۔ اس سے بھی عیشؔ کے ان سے تعلقات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے صاحب میر سید عبداللہ کے عیشؔ کا شاگرد ہونے کا امکان اور بھی کم ہے۔ وہ میر حسین تسکین کے بیٹے تھے اور تسکینؔ خود مومنؔ کے شاگرد تھے۔ مومنؔ اور عیشؔ کے تعلقات میں کشیدگی کے ثبوت موجود ہیں۔ اس صورت میں تسکینؔ کے بیٹے کا عیشؔ کی شاگردی اختیار کرنا قرینِ قیاس نہیں۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔ گمانِ غالب ہے کہ جن غمگینؔ نے عیشؔ کا دیوان مرتّب کیا، وہ سید علی ہی تھے۔ یہ بعد کو گوالیار چلے گئے تھے[5]۔ وہیں ان کا مدفن ہے۔ گوالیار کا مشہور "حضرت جی" خاندان انھیں کا نام لیوا ہے۔

دیوان اوّل:

عیشؔ کے دیوانِ اوّل کے دو خطّی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کا ایک انتخاب بھی ملا ہے۔ دونوں نسخوں میں سے پہلا (اور قدیمتر) انڈیا آفس لائبریری، لندن میں ہے۔ دوسرا نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتابخانے میں ہے۔ انتخاب میوزیم کراچی میں ہے۔ ان تینوں کی ضروری تفصیلات حسبِ ذیل ہیں:

نسخہ لندن یہ مخطوطہ ۱۸×۱۱ سم سائز کے ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابخانے میں اس کا نمبر (ہندوستانی مخطوطات: بی ۱۷۵) ہے۔ نسخہ مکمل اور بہت اچھی حالت میں ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کا اس پر بہت کم اثر ہوا ہے۔ سوائے اس کے کہ

۴۔ آبِ حیات: ۴۴۴

۵۔ گلشنِ بیخزاں (نغمۂ عندلیب): ۱۷۵ - ۱۷۶

چند مقامات کی تحریر مغشوش ہو گئی ہے، آب زدگی یا کرم خوردگی کا کہیں نشان نہیں۔

اس زمانے میں قلمی کتابوں پر صفحوں کے نمبر نہیں دیے جاتے تھے۔ تسلسل واضح کرنے کو ہر جفت صفحے کے پائیں بائیں کونے میں اگلے صفحے کا پہلا لفظ لکھ دیتے تھے۔ پوری کتاب کا تسلسل اسی ترک سے متعین ہوتا تھا۔ مخطوطے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ مکمل ہے۔

اس کی کتابت خوشخط نستعلیق میں کی گئی ہے۔ املا میں اس عہد کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ مثلاً "د" اور "ڈ" اور "ر" "ڑ" میں، "س" اور "ش" میں، یاے معروف اور یاے مجہول میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا، ایک کی جگہ دوسرا حرف بالعموم استعمال ہوا ہے۔ یہی حال نون غنّہ کا ہے۔ ہر جگہ نقطہ لکھا گیا ہے۔ اعراب بالحروف کے اصول کے مطابق ضمّہ کی جگہ "واو" یعنی اوس، اون لکھا گیا ہے۔ دوچشمی (ھ) کی جگہ عام طور پر ہاے ہوز ملتی ہے۔ لفظوں کو ملا کر لکھنے کی مثالیں بھی کم نہیں۔

پورے دیوان میں پورا شعر ایک سطر میں لکھا گیا ہے۔ صرف مقطع کی صورت مختلف ہے۔ اس کے دونوں مصرعے اوپر نیچے ملتے ہیں۔ چھوٹی بحر کے شعر کا ایک سطر میں لکھنا تو آسان تھا، لیکن بعض لمبی بحر کی غزلوں میں شعر کو ایک سطر میں پورا کرنے کے لیے الفاظ بہت گنجان اور اوپر نیچے لکھے گئے ہیں۔ اس سے ان کے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

سرورق کا صفحہ حسب معمول خالی ہے۔ دیوان کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے۔ اس میں جملہ گیارہ قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ ص (۲) سے "یا فتّاح" اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے دو عنوانوں کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پہلے قصیدے کا مطلع ہے:

نسیم صبح ہوئی آج یہ نوید رسا
کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسا

کسی قصیدے پر عنوان نہیں ملتا۔ جہاں ایک قصیدہ ختم ہوتا ہے، اس کے بعد ایک سطر خالی چھوڑ کر دوسرا قصیدہ شروع کر دیا گیا ہے۔

قصائد (۵۴) صفحہ تک چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو صفحوں کی بیاض ہے۔ ص (۵۷) سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے تازہ عنوان کے بعد غزلیں شروع ہو جاتی ہیں۔

پہلی غزل حمد میں ہے۔اس کا مطلع ہے:

عیاں ہے ہر طرف کثرت میں جلوہ تیری وحدت کا
ترے صدقے! دکھایا کیا تماشا اپنی قدرت کا

بعض ردیفوں کے اختتام کے بعد دو دو تین تین صفحوں کی بیاض ملتی ہے۔اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ نسخہ خود عیش نے لکھوایا ہو۔ اور یہ بیاض بعد کی کہی ہوئی غزلیں اضافہ کرنے کے لیے چھوڑی گئی ہو۔

غزلیں ص (۲۲۸) پر ختم ہو جاتی ہیں۔آخری شعر ہے:

نہ ڈر تو کثرتِ عصیاں سے، عیش! توبہ کر
نہیں بگاڑتا اللہ عذر خواہوں کو

دیوان میں غزلوں کے بعد کسی اور صنفِ سخن میں کلام نہیں ملتا۔

آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔لیکن مخطوطے میں شامل کلام کا زمانہ متعین کرنے کے لیے اندرونی شہادت موجود ہے۔

نسخۂ لندن میں گیارہ قصیدے ہیں۔ اور یہ سب کے سب بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔نسخۂ بنارس میں (آگے دیکھیے) بہادر شاہ کی مدح میں صرف ایک قصیدہ ملتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نسخۂ لندن بہادر شاہ کی حکومت کے دوران میں مرتب ہو چکا تھا۔

نسخۂ لندن میں غدر، اور اس کے اثرات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، حال آں کہ دیوان دوم اس طرح کے کلام سے بھرا پڑا ہے۔اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

البتہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس لندن کے نسخے کی کتابت کب ہوئی۔

نسخۂ بنارس یہ مخطوطہ کتاب خانۂ بنارس ہندو یونیورسٹی کے "ذخیرۂ لالہ سری رام" میں ہے۔کتاب خانے میں اس کا نمبر $\frac{3\ .XI\ \ U}{2}$ ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، لالہ سری رام دہلوی (مؤلفِ خمخانۂ جاوید) کے پاس قلمی اور مطبوعہ

کتابوں اور تصویروں اور دستاویزوں کا بینظیر ذخیرہ تھا۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے اور انھیں مرضِ لاحقہ کی پیچیدگی کا احساس ہوا، تو وقتِ موعود کا خیال کرکے وصیت کی کہ میرے بعد میرا علمی اور ادبی کتابخانہ، قلمی تصویروں سمیت بنارس ہندو یونیورسٹی کو دے دیا جائے[6]۔ چنانچہ ان کی وفات کے چند سال بعد یہ "بیش بہا علمی اور فنی خزانہ" بنارس چلا گیا۔ یہ قلمی نسخہ بھی اسی ذخیرے میں ہے۔

لالہ سری رام کو یہ قلمی دیوان خود عیش کے خاندان سے ملا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ عیش کے پرپوتے وحید جان کی زبانی روایت کرتے ہیں[7]:

"حکیم (عیش) صاحب کا دیوان لالہ سری رام رئیسِ دہلی مصنفِ خمخانۂ جاوید کے پاس ہے۔ انھوں نے (یعنی وحید جان نے) یہ بھی بتایا کہ کس طرح یہ دیوان ان کے خاندان سے نکل کر لالہ صاحب کے پاس پہنچا۔"

جیسا کہ عیش نے کہا، ان کا کلام ان کے دوست غمگین نے مرتب کیا تھا۔ غالباً یہ کلام صرف قصائد اور غزلیات پر مشتمل تھا، جو مخطوطۂ لندن کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اسی پر اضافے کرکے خود عیش نے بعد کو یہ دیوان (نسخۂ بنارس) تیار کیا۔ اس میں ان کا بعد کا کلام بھی شامل ہے۔ انھوں نے نظرِ ثانی کرتے وقت اس میں جو حذف و اضافہ کیا، وہ بھی اس مخطوطے سے واضح ہے۔ انھوں نے بعض اشعار میں لفظی ردّ و بدل کیا ہے۔ بعض جگہ شعر کے متعلقہ لفظ یا ٹکڑے پر نشان کرکے اس کی اصلاح حاشیے میں لکھ دی ہے۔ ایک آدھ جگہ پورا مصرع بدل دیا ہے۔ مثلاً ردیف الف کی غزل (۱۱) کے مقطع کا مصرعِ اولیٰ تھا:

یک قلم، عیش، تڑپ جائیگی محلس ساری

اسے قلمزد کرکے حاشیے میں یہ نیا مصرع تحریر کیا ہے:

عیش، جائیگی تڑپ سنتے ہی محلس ساری

۶۔ خمخانۂ جاوید، ۵: ۷ (دیباچہ)

۷۔ مضامینِ فرحت، ۲: ۱۹۴

ردیف الف ہی کی غزل (۵۴) کے مقطع سے پہلے یہ ایک نیا شعر کہہ کر حاشیے میں لکھ دیا ہے:

شکوۂ غیر کیا کرے کوئی — اپنا جب تجھ سا آشنا نہ ہوا

غرض ان تحریروں سے ثابت ہے کہ یہ سب تبدیلیاں خود عیش نے کی تھیں اور یہ نسخہ بھی انھیں کا تھا، جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔

ان تحریروں کے باعث یہ مخطوطہ بہت قیمتی ہے کیونکہ اس پر عیش کے ہاتھ کی تحریریں ہیں۔

اس نسخے میں دو نئے قصیدوں اور غزلوں کے علاوہ قطعاتِ تاریخ بھی ہیں۔ ان میں مرزا جوان بخت کی شادی کا سہرا (۱۸۵۲ء) اور تاریخِ وفاتِ ذوق (نومبر ۱۸۵۴ء)، تاریخِ وفاتِ ممنون وغیرہ شامل ہیں۔

موجودہ ترتیب اس کی اصلی اور ابتدائی ترتیب نہیں۔ اس وقت شروع میں غزلیں، ان کے بعد قطعاتِ تاریخ وغیرہ اور آخر میں قصیدے ہیں۔ ابتدائی ترتیب میں قصیدے اوّل تھے اور بقیہ کلام ان کے بعد تھا۔ یہ ردّ و بدل غالباً لالہ سری رام کے ہاں ہوا کیونکہ انھوں نے جو انتخاب مرزا فرحت اللہ بیگ کے لیے تیار کیا تھا، وہ بھی موجودہ ترتیب کے مطابق ہے۔ دیوان میں سے کچھ صفحات ساقط بھی ہو گئے ہیں۔ ان سے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ یہ کس مرحلے پر ضائع ہوئے

یہ نسخہ ۱۲ × ۱۹ سم سائز کے (۲۰۴) صفحات (۱۰۲ ورق) پر مشتمل ہے۔ کتاب تیرہ سطری مسطر پر لکھی گئی ہے۔ املا کی وہ تمام خصوصیات جو لندن کے نسخے کی تفصیل میں بیان ہوئی ہیں یہاں بھی موجود ہیں۔ موجودہ نسخے سے شروع کی دو غزلیں ساقط ہو گئی ہیں جو نسخۂ لندن میں موجود ہیں۔ نسخہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

بوجہل کعبے میں، ابراہیم بتخانے میں تھے — کیوں جی کیوں، نزدیک ہوجاتا ہے یوں بھی دور کا

اور آخری شعر ہے؛

غرض دعا ہے یہی عیش کی شہا کہ مدام
قدم سے تیرے رہے زیب و زینتِ اورنگ

نسخے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ملتا۔ لیکن قصیدوں کے آخر میں تاریخ ۱۲۵۹ھ کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدے اس تاریخ تک لکھے جا چکے تھے۔

نسخۂ کراچی یہ دراصل نسخۂ بنارس کا انتخاب ہے۔ نسخۂ بنارس میں غزلوں کے متعدد اشعار پر نشان ملتے ہیں۔ نسخۂ کراچی میں یہی نشان زدہ کلام شامل ہے۔ کراچی میوزیم میں پہنچنے سے پہلے یہ نسخہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق (سکریٹری انجمن ترقی اردو) کے کتبخانۂ خاص" میں تھا، جس کی مہر اس نسخے پر اب بھی موجود ہے۔ خیالِ غالب ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم کی وفات کے بعد ان کے کتبخانے کے ساتھ یہ نسخہ بھی میوزیم میں داخل ہوگیا میوزیم میں اس کا نمبر الف $\frac{۷}{۱۹}$ / ۹۹ - $\frac{۳}{۱۲۵}$ ہے

یہ نسخہ مکمل ہے۔ ۱۲ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے اور کاغذ کے دونوں طرف لکھا ملتا ہے۔ کلام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

صفحہ ۱ - تا ۵۸ غزلیات (ص ۵۸ خالی ہے)
صفحہ ۵۹ تا ۶۳ (وسط تک) رباعیات (ان میں دو قطعات بھی شامل ہیں)
صفحہ ۶۳ (وسط) تا ۶۵ (نیچے کی پانچ سطریں چھوڑ کر): تاریخہاے وفات
صفحہ ۶۵ (پانچ سطر) تا ۶۶ (وسط): تضمین
صفحہ ۶۶ (وسط) تا ۷۱ : پہیلیاں
صفحہ ۷۲ تا ۷۵ (وسط): مخمّسات
صفحہ ۷۵ (وسط) تا ۷۶ (وسط): قصیدۂ نعت
صفحہ ۷۷ تا ۱۱۴ : قصائد

نسخے کا پہلا شعر یہ ہے:

صبح دم گھر سے جو ٹکڑا وہ قمر کا نکلا | کانپتا شرق سے خورشید سحر کا نکلا

آخری شعر یہ ہے:

غرض دعا ہے یہی عیش کی شہا کہ مدام
قدم سے تیرے رہے زیب و زینتِ اورنگ

دیوانِ اوّل میں شامل کلام کی تفصیل یہ ہے ۔

غــزلیں :

ردیف	شمار غزلیات	تعداد اشعار
الف	۶۱	۵۷۳
ب	۵	۳۳
پ	۱	۴
ت	۴	۳۰
ٹ	۱	۶
ث	۱	۵
ج	۵	۴۵
ح	۱	۲
خ	۱	۲
د	۶	۴۲
ذ	۲	۱۷
ر	۱۰	۷۴
ڑ	۱	۹
ز	۲	۱۷
س	۲	۱۲
ش	۳	۱۷
ص	۲	۱۴
ض	۱	۷
ط	۲	۱۹
ظ	۱	۷

ردیف	شمار غزلیات	تعداد اشعار
ع	۲	۱۴
غ	۱	۷
ف	۱	۷
ق	۱	۹
ک	۴	۴۱
گ	۱	۷
ل	۸	۷۷
م	۶	۵۳
ن	۴۷	۴۴۰
و	۲۲	۲۰۰
ہ	۱۱	۸۶
ی	۱۱۵	۱۱۰۹
میزان	۳۳۱	۲۹۸۵
قصائد	۱۴	۸۰۲
سہرا	۱	۱۵
رباعیات وقطعات	۳۱	۶۲
مخمس	۲	۲۳ بند
قطعات تاریخ	۱۳	۳۸
پہیلیاں	۴۱	۷۴
میزان	۴۳۳	۳۹۹۹

دیوان دوم

اس کا صرف ایک نسخہ لاہور میوزیم، لاہور میں ملا ہے۔ اس کے کسی دوسرے نسخے کی موجودگی کا علم نہیں۔ اس کے سرِ ورق پر یہ عبارت لکھی ہے:

"دیوان حکیم آغا جان عیشؔ دہلوی
اس دیوان کا اصلی نسخہ حکیم آغا جان عیشؔ کے خاندان میں موجود ہے۔ اس کی یہ نقل ہے"

افسوس کہ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ حکیم آغا جان عیشؔ کے پسماندگان اب کہاں ہیں، اور نہ یہ کہ اس دیوان کے اصلی نسخے کا کیا حشر ہوا۔

میوزیم میں اس نسخے کے اندراج کا نمبر 708 (اُردو) ہے۔ اس میں ۵ء۱۹×۳۳ سم کے (۹۷) صفحات ہیں۔ مسطر ۱۶ سطری ہے۔ اشعار کاغذ کے دونوں طرف لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق اور گوارا ہے، اس کے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ البتہ آخیر کے چند ورق پھٹ جانے سے کچھ کلام ضائع ہو گیا ہے۔ دیوان اچانک اس شعر سے شروع ہو جاتا ہے:

قدرت سے اپنی مُردوں کو زندہ کریگا تو
مالک ہے، خالقا! تو ہی یوم النشور کا

اور اس کے بعد مقطع ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کا پہلا حصّہ ساقط ہو گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یوں کتنا کلام ضائع ہوا۔

اس دیوان میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ یوں بھی جب غدر کے بعد یہ مرتّب ہوا، اس وقت کون رہ گیا تھا، جس کی مدح میں عیشؔ قصیدہ لکھتے۔ انھوں نے تو غدر سے پہلے بھی بہادر شاہ ظفرؔ کے علاوہ کسی اور کی مدح نہیں کی، بعد کو کس کی کرتے۔

دوسری خصوصیت اس دیوان کی یہ ہے کہ "فغانِ دہلی" (مرتبہ تفضّل حسین خاں کوکبؔ) میں جو کلام عیشؔ کا مسدّس اور غزل کی صورت میں شامل ہے، وہ سب اس دیوانِ دوم میں بھی ہے۔ یہ کتاب ان منظومات پر مشتمل ہے جو غدر کے

کے بعد وقت کے مختلف شعرا نے دلی کی تباہی اور یہاں کے باشندوں کی مصیبت کے بارے میں لکھی تھیں۔ اس میں عیش کا کلام بھی ہے۔ عیش نے اس کے علاوہ بھی اپنے رنج و غم کا اظہار بہت جگہ کیا تھا، وہ اس دیوان میں موجود ہے۔

غزلیات کے حصے میں کلام اگرچہ ردیف وار لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر بے ترتیبی کے آثار بھی ملتے ہیں یعنی ایک ردیف کی غزلیں دوسری میں آگے پیچھے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

دیوانِ دوم کے اس مخطوطے کا آخری شعر ہے:

دی یہ ہاتف نے ندا از سرِ حوضِ کوثر ‏ ‏ ‏ ‏ ان کی تاریخ کہو "خانۂ جنت مسکن"

(اس میں "سرِ حوض" (ح) کا تعمیہ ہے۔ تاریخِ وفات (۱۲۸۰) ہے۔ یہ کسی قاضی مبارک علی کی وفات پر کہی گئی تھی)

اس دیوان میں شاملِ کلام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

غزلیات:

ردیف	شمار غزلیات	تعداد اشعار	ردیف	شمار غزلیات	تعداد اشعار
الف	۲۲	۱۴۸	ر	۳	۲۰
ب	۴	۳۰	ڑ	۱	۷
ت	۲	۱۲	ز	۲	۱۴
ث	۱	۸	س	۱	۹
ج	۱	۵	ص	۱	۸
ح	۱	۷	ض	۱	۷
خ	۲	۱۲	ط	۳	۱۹
د	۱	۷	ظ	۱	۱۴
ذ	۱	۳	ع	۱	۹

غ	۱	۵
ف	۲	۱۰
ق	۲	۱۲
ک	۲	۱۵
ل	۵	۵۳
م	۲	۱۴
ن	۷	۵۹
و	۱۶	۱۱۵
ہ	۷	۵۹
ی	۴۹	۴۰۰
	(۱۴۲)	(۱۰۷۳)
مسدّس	۴۰ بند	۱۲۰
رباعیات	۹	۱۸
متفرّقات		

میزان ۱۲۱۱

۵۔ تلامذۂ عیش

تذکروں میں عیش کے شاگردوں کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ جہاں خود عیش کے حالات قابلِ توجہ نہ سمجھے گئے۔ وہاں ان کے شاگردوں کی کون پرواکرتا! مختلف تذکروں میں جو چند نام ملے ہیں، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

۱۔ آزاد دہلوی، مولانا محمد حسین

محمد حسین آزاد کی شاگردی مبہم ہے۔ اور اس کے لیے خود آزاد ذمہ دار ہیں۔ حکیم آغا جان عیش سے متعلق حاشیے میں وہ لکھتے ہیں:[۱]

میں نے دو دفعہ استاد کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ ہائے افسوس، اس وقت تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔

میں اُن دنوں دہلی کالج میں پڑھتا تھا۔ استاد مرحوم کے بعد

۱۔ آب حیات: ۴۸۱ (حاشیہ ۲)

ذوقِ سخن اور ان کے کمال کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں پہنچایا۔
اب اُن صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں، اور نہیں پاتیں۔

اس اقتباس میں "استاد" اور "استاد مرحوم" سے شیخ محمد ابراہیم ذوق مراد ہیں۔

آزاد نے حسبِ معمول صراحت سے کچھ نہیں بتایا "ذوقِ سخن اور ان کے کمال کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں پہنچایا" سے کیا مراد ہے؟ محض علمی استفادہ یا کلام پر اصلاح؟ میرا خیال ہے کہ انھوں نے عیش سے مشورۂ سخن کیا اور اُن سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ "ذوقِ سخن" کے الفاظ اسی پر دال ہیں۔ لیکن انھوں نے اس کا برملا صراحت سے اس لیے اعتراف نہ کیا کیونکہ وہ ذوق کے حالات اس تفصیل سے لکھ رہے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنے دوسرے استاد (عیش) کو ان کا مدِمقابل بنا کر کھڑا کر دیں (اور انھیں استاد لکھنے کے بعد یہ ناگزیر تھا) اس لیے نہ ان کو استاد لکھا، نہ ان کے حالات ہی مستقل باب میں بیان کیے۔

اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں:[۲]

> استاد ذوق کی وفات کے بعد آزاد دلی کے ایک اور شاعر حکیم آغا جان عیش کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ مگر جو لگاؤ آزاد کو استاد ذوق سے ہو گیا تھا، اسی کی وجہ سے انھیں ہمیشہ ذوق ہی کا شاگرد سمجھا جائیگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آزاد نے بھی ذوق کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ خدا ایسے قابل شاگرد سب استادوں کو دے کہ جن شاگردوں کی وجہ سے خود استاد کا نام زندہ رہے۔

گویا آغا محمد اشرف نے بھی آزاد کی عیش کی شاگردی تسلیم کی، لیکن چونکہ وہ ذوق ہی کے شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہیں، اس لیے عیش کا تعلق دب گیا۔ بہر حال میرے نزدیک انھوں نے عیش سے مشورۂ سخن کیا تھا، اسی لیے یہاں انھیں کے حالات سب سے پہلے درج ہیں:

۲۔ راوی، لاہور (مولانا محمد حسین آزاد نمبر): ۲۷

مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخ ولادت کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء (۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ) کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی محمد باقر مشہور شیعی عالم اور شمالی ہند میں سب سے پہلے اردو ہفتہ وار "اردو اخبار" کے جو ۱۸۳۶ء میں دلّی سے جاری ہوا، مالک اور ایڈیٹر تھے۔ افسوس کہ ان کا انجام بہت المناک ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے مشہورِ زمانہ ہنگامے کے دوران میں انھوں نے مسٹر ٹیلر کو پناہ نہیں دی تھی۔ اور بعد کو دیسی سپاہ نے ٹیلر کو قتل کر دیا تھا۔ مولوی محمد باقر اسی باعث بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

محمد حسین نے مکتبی تعلیم گھر پر مکمل کی اور اس کے بعد جنوری ۱۸۴۵ء میں باقاعدہ دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں انھیں سولہ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ کالج میں عربی کی تکمیل کے بعد وہ اپنے والد کے دہلی "اردو اخبار" میں کام کرنے لگے۔ شاعری کا شوق ہوا، تو ذوق کی شاگردی اختیار کر لی، جو ان کے والد کے ہم سبق اور بچپن کے دوست تھے۔ جب ذوق کا نومبر ۱۸۵۴ء میں انتقال ہو گیا، تو اس کے بعد حکیم آغا جان عیش سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ لیکن اس کی مدت زیادہ نہیں رہی۔ ڈھائی سال بعد مئی ۱۸۵۷ء میں "غدر" ہو گیا۔ جس میں اُن کے والد انگریز کی گولی کا شکار ہوئے، اور خود انھیں شہر بدر ہونا پڑا۔

دلّی سے نکل کر وہ پریشان حال کئی شہروں میں تلاشِ معاش میں گئے۔ لکھنؤ، مدراس، نیلگری وغیرہ میں روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ لیکن کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر تقریباً دو برس کی ہرزہ گردی کے بعد پنجاب کی ریاست جیند میں راجہ سروپ سنگھ نے اپنے فوجداری دفتر کی محافظی پر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ نو مہینے کے قریب (۶ فروری سے ۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء تک) رہے۔ اگلے برس ۱۸۶۰ء میں جگراؤں (پنجاب) کے رئیس ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان بہادر نے اپنے پاس بلا لیا۔ انھوں نے مجمع البحرین کے نام سے ایک مطبع اور اخبار جاری کیا تھا۔ آزاد اس کے پرنٹر اور پبلشر بنا دیے گئے، اور غالباً اخبار میں کچھ کتابت کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔

ظاہر ہے کہ نہ یہ ملازمت وقیع تھی، نہ اس کا مشاہرہ ہی کافی تھا۔ اسی لیے وہ

چاہتے تھے کہ کسی طرح لاہور میں کوئی روزگار کا سلسلہ پیدا ہو جائے، خواہ تنخواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ لاہور صوبے کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں ترقی کے مواقع اور امکانات کہیں زیادہ تھے۔ اس میں ارسطو جاہ نے بھی کچھ مدد کی۔ بالآخر سال بھر بعد ۱۸۶۱ء میں پہلے بڑے ڈاکخانے میں سررشتہ داری کی اسامی پر تقرر ہو گیا اور چند ہی ماہ بعد محکمۂ تعلیم میں یہی نوکری مل گئی۔

اس زمانے میں پنڈت من پھول پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کے میر منشی تھے۔ انھیں کی مدد سے انھیں محکمۂ تعلیم میں نوکری ملی تھی۔ لیکن اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے آزاد کا مستقبل زیادہ یقینی اور قابلِ اطمینان ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب روس وسطی ایشیا میں اپنی طاقت اور اثر و رسوخ بڑھانے کی فکر میں تھا۔ انگریز روس کی ان سرگرمیوں کو تشویش سے دیکھ رہے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ موثق اطلاعات مہیا نہیں تھیں، جن سے معلوم ہوتا کہ روسی اقدام کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ وہ کن علاقوں پر قبضہ جما چکے ہیں؟ کن مقامات پر ان کی فوجیں اور فوجی ساز و سامان اور یہ بھی کس مقدار میں جمع ہے؟ ان کے آیندہ کیا ارادے ہیں؟ اور جب تک ان سوالوں کا جواب نہ ملے، انگریز کے لیے کوئی کارروائی کرنا ممکن نہیں تھا۔ دراصل انھیں فکر یہ تھی کہ روسی پیش قدمی سے ان کی ہندستانی مقبوضات کو خطرہ تھا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایک خفیہ مشن وسطی ایشیا کے ممالک کا چوری چھپے دورہ کر کے وہاں روسی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات مہیا کرے۔

یہ خفیہ مشن چار ارکان پر مشتمل تھا۔ پنڈت من پھول اس کے لیڈر تھے۔ ان کے علاوہ تین اور شخص — مولوی محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش اور کرم چند نند رام — ان کے ساتھ گئے تھے۔ یہ سب فارسی جانتے تھے، بلکہ آزاد تو عربی سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے نام بدل لیے اور سفر کا مقصد غلط بیان کیا۔ پنڈت من پھول نے اپنا نام دیوان سنگھ مہاجن رکھا تھا۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ چونکہ وہ حکومت کے ذمہ دار افسر تھے، اس لیے وہی مشن کے لیڈر بنائے گئے۔

محمد حسین آزاد طالب علم کے بھیس میں گئے تھے۔ ان کا مقصد کسبِ علم اور نایاب کتابوں کا حصول تھا۔ انھوں نے اپنا نام بہار الدین رکھا تھا۔

منشی فیض بخش اصل میں پشاور کے رہنے والے تھے۔ یقیناً فارسی کے علاوہ پشتو بھی جانتے ہونگے۔ وہ افغان تاجر کی حیثیت سے گئے۔

کرم چند نند رام شکارپور (سندھ) کے باشندے دراصل سنار تھے۔ وہ پنڈت من پھول کے ذاتی غلام بنے رہے۔ انھوں نے نام بھی نہیں بدلا تھا۔

یہ سب لوگ مختلف راستوں سے اپنے سفر پر ۳ ستمبر ۱۸۶۵ء کو مری سے روانہ ہوئے اور تقریباً سوا سال کی غیر حاضری کے بعد، ۷ نومبر ۱۸۶۶ء کو واپس پشاور پہنچے۔

اس مشن کی روانگی سے پہلے ہی ۱۸۶۴ء میں لاہور میں گورنمنٹ کالج اور جنوری ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب قائم ہو چکی تھی۔ جب نومبر ۱۸۶۵ء میں مشن اپنے مقصد میں کامیاب بخیر و خوبی واپس آیا، تو حکومت نے آزاد کو انجمن پنجاب کا سکریٹری مقرر کردیا۔ یہ گویا ان کی خدمات کا اعتراف بھی تھا اور آیندہ کی ترقی کا پیش خیمہ بھی۔ ان کے والد مولوی محمد باقر کے غدر کے بعد بغاوت کے الزام میں قتل ہونے سے اگر حکومت کے دل کے کسی گوشے میں کوئی شبہہ آزاد کے بارے میں موجود تھا، تو وہ بھی اس تقرر سے دور ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مولوی علمدار حسین تھے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ بیماری کے باعث تین مہینے کی رخصت لے کر چلے گئے تو ان کی غیر حاضری میں کپتان ہالرائڈ، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن (تعلیم) نے کالج کے پرنسپل مسٹر لائٹنر کی سفارش پر آزاد کو ۲ اگست ۱۸۶۹ء کو کالج میں عارضی طور پر قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر (عربی) مقرر کردیا۔ ۵۰ روپے مشاہرہ مقرر ہوا۔ بدقسمتی سے مولوی علمدار حسین کا اسی بیماری میں اگلے برس (۲۴ مئی ۱۸۷۰ء کو) انتقال ہو گیا۔ اس پر محمد حسین آزاد ۱۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر مستقل کردیے گئے۔

۱۸۷۰ء کے شروع میں حکومتِ پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے ایک ماہنامہ "اتالیقِ پنجاب" کے نام سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال اور نائب ایڈیٹر آزاد مقرر

ہوئے۔ لیکن کسی باعث محکمے نے چند ہی مہینے بعد یہ پرچہ بند کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ہفتہ وار "ہمارے پنجاب" شائع ہونے لگا۔ اب کے آزاد اس کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ وہ کالج میں عربی بھی پڑھاتے تھے، اور اس پرچے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کوئی سال بھر تک وہ بیک وقت یہ دونوں کام کرتے رہے۔ بعد کو مولانا حالی بھی اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر رہے۔

اب آزاد کی سرکاری حلقوں میں پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ کے دل میں خیال آیا کہ اردو اسکولوں کا نصاب اصلاح طلب ہے، خاص طور پر اس کا شعری حصہ بہت فرسودہ اور مضامین کے لحاظ سے بیکار ہے۔ میکلوڈ نے ڈائرکٹر تعلیم ہالرائڈ کو لکھا کہ اس صورتِ حال پر غور کر کے اصلاح کی کوشش کی جائے۔ ہالرائڈ نے مولانا محمد حسین آزاد سے مشورہ کیا اور دوسرے اصحابِ علم کی رائے معلوم کرنے کے لیے انجمن پنجاب کا جلسہ طلب کیا۔ (۹ مئی ۱۸۷۴ء) سب سے پہلے آزاد نے ایک "لیکچر" دیا جس میں اردو شاعری کے نقائص گنوائے۔ اس کے بعد ہالرائڈ نے سامعین اور اردو دوستوں سے ایک لمبی تقریر کے ذریعے اردو شاعری میں اصلاح کی درخواست کی اور یہ تجویز رکھی کہ آیندہ ایسے ماہانہ مشاعرے منعقد کیے جائیں، جن میں شعرا "طرح" پر غزلیں لکھنے کی بجائے کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے مہینے سے مشاعرے شروع کیے جائیں۔ اور پہلے مشاعرے کے لیے مضمون "برسات" منظور ہوا۔

آزاد گورنمنٹ کالج سے یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء تک وابستہ رہے۔ اس سال حکومت نے فیصلہ کیا کہ مشرقی زبانوں کے درجے الگ کر کے اورینٹل کالج کھولا جائے۔ چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء کو کالج کے عربی اور سنسکرت کے استاد اورینٹل کالج منتقل ہو گئے۔

ستمبر ۱۸۸۵ء میں وہ ایران کی سیر و سیاحت اور کتابوں کی فراہمی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کا یہ سفر بہت کامیاب رہا۔ وہ دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد جولائی ۱۸۸۶ء میں واپس لاہور پہنچے تھے۔ وہ گئے تو پانی کے جہاز سے تھے، پہلے لاہور سے کراچی تک

ریل سے گئے اور پھر وہاں سے عرشۂ جہاز پر سوار بوشہر (ایران)۔ واپسی میں انھوں نے خشکی کا رستہ اختیار کیا اور قندھار اور کوئٹے سے ہوتے ہوئے لاہور آئے۔

اب سرکاری حلقوں میں ان کی علمی خدمات کے اعتراف کا وقت آگیا تھا۔ ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ تین سال بعد جون ۱۸۹۰ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور یوں جو تعلق ۱۸۶۹ء میں شروع ہوا تھا، ۲۱ برس بعد بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بہت پریشان رہے تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کے خاندان پر جو مصیبت نازل ہوئی تھی، اگرچہ اس میں اُن کی اپنی جان تو بچ گئی، لیکن والد مولوی محمد باقر اور ایک معصوم بہن کی موت بھولنے والی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد کے تین چار برس بہت پریشان حالی اور عسرت میں گزرے۔ ملک کے مختلف حصّوں میں وہ تلاشِ روزگار میں سرگرداں رہے۔ اس زمانے کے تفصیلی حالات تو ہمارے علم میں نہیں لیکن یقیناً ناداری اور جان کے خوف نے ان پر نیند حرام کر رکھی ہوگی۔ شروع میں نوکری کا جو سلسلہ قائم ہوا، تو اس زمانے میں آمدنی اتنی قلیل رہی، کہ اس میں جان و تن کا رشتہ قائم رکھنا بھی دشوار رہا ہوگا۔ ان کی جسمانی آسایش کا زمانہ لاہور پہنچنے کے بعد، بالخصوص گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے شروع ہوا۔ یہاں انھوں نے اکیس برس بظاہر امن چین اور آسودگی میں بسر کیے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہونگے کہ میں انھیں انگریزوں کی نوکری کر رہا ہوں جنھوں نے میرے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، جن کی بدولت دلّی کا سا وطن اور بھرا پُرا گھر چھوٹا، دوست احباب کی جدائی نصیب ہوئی، تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ پورا زمانہ انتہائی محنت اور ذہنی کوفت کا بھی تھا۔ ان کی جملہ تصانیف اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ ۱۸۸۴ء میں جوانسال بیٹی امۃ السکینہ کی ناوقت موت نے پوری کر دی۔ اس کی ذہانت اور قابلیت کا کچھ اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ وہ آزاد کے مسودے ٹھیک کیا کرتی تھی، اس کی لکھی ہوئی چیزیں خود آزاد کے نام سے شائع ہوتی تھیں اور جو بقول آزاد سات

بیٹوں سے گراں بہا تر" تھی۔ بس اس سانحہ نے فتیلہ کا کام کیا، اور وہ جذباتی اور روحانی آتشیں مادّہ، جو خارجی حالات کی مجبوری سے آج تک دبا رہا تھا، اسے آگ لگ گئی اور ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا۔

اس کے بعد وہ تقریباً پچیس برس زندہ رہے۔ لیکن یہ پورا زمانہ اندھیرے اُجالے میں گزرا۔ بیشتر وارفتگی کا غلبہ رہا۔ لیکن جب کبھی یہ کیفیت نہ رہتی، اور وہ اپنے معمولی ہوش و حواس میں ہوتے، تو علم و ادب کی قسمت جاگ اٹھتی۔

اسی حالت میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء (۹ محرم ۱۳۲۸ھ) کو جان بحق ہوئے اور اگلے دن بھاٹی دروازے کے باہر کربلا گامے شاہ میں سپرد خاک کیے گئے۔ حالی نے تاریخ کہی:

تاریخِ وفات اس کی جو پوچھے کوئی، حالی!
کہہ دو "ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا"

آزاد کی بیشتر تصانیف ان کی زندگی میں شائع ہو گئی تھیں۔ صرف چند ان کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئیں۔ دماغی توازن بگڑ جانے کے بعد بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ یہ سارا ذخیرہ نثر میں ہے، اور اس کا موضوع الٰہیات اور روحانیات ہے۔ ان میں سے دو تین رسالے شائع بھی ہوئے ہیں۔ بقیہ تمام رسالے غیر مطبوعہ ان کے خاندان کے پاس لاہور میں محفوظ ہیں۔

اب تک ان کی چالیس سے اوپر کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے دو (مجموعہ نظم آزاد اور خمکدۂ آزاد) نظم میں ہیں اور بقیہ تمام نثر میں۔ نثر کا بیشتر حصہ درسی کتابوں پر مشتمل ہے، جو انھوں نے محکمۂ تعلیم کی فرمائش پر ابتدائی اور وسطی درجوں کے نصاب کے لیے لکھی تھیں۔

عام دلچسپی کے لیے جو کتابیں قلمبند ہوئیں، ان میں آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارس بہت اہم ہیں اور بار بار چھپی ہیں۔ انھوں

نے دیوانِ ذوق بھی مرتب کیا تھا۔ یہی آج کل دستیاب ہوتا ہے اور اسی سے ذوق کا نام زندہ ہے۔

آزاد کی شہرت آج شاعر سے زیادہ نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔ ان کی انشا اور طرزِ تحریر کا جواب نہیں۔ ان کی نظمیں زیادہ تر لاہور کے مشارٗالیہ مشاعرے کے لیے لکھی گئی تھیں، جن کا عنوان بھی غالباً کوئی اور منتخب کرتا تھا۔ اسی لیے ان میں وہ زندگی اور گرمی نہیں ملتی، جو زندہ رہنے والی نظم کے لیے ضروری ہے۔ ان نظموں کی تاریخی اہمیت مسلّمہ ہے۔ ہماری شاعری کو نیا رخ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ لیکن آج جب کہ ان کی تصنیف پر ایک صدی سے زیادہ ہونے کو آئی، ان کی قدر نہیں کی جاتی۔

آزاد کے کلام کا مختصر نمونہ حسبِ ذیل ہے:

سنیگا، دیکھنا، رو رو کے آواز اک جہاں میری
تمھارے عشق کی ہے داستاں، اور ہے زباں میری

سناؤں داستانِ عشق سب قلقل کے پردے میں
صراحی کے دہن میں کاٹ کر رکھ دو زباں میری

تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی، اڑا دو دھجیاں میری

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا

منھ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا

روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی

وہ گہری سبزیوں میں، گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں

وہ صبح کی ہوا سے، درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کے وہ رخِ گل کو چومنا

سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم بھی آ کے رات کو، موتی لٹا گئی

پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پر لہرا کے جاتے تھے

سورج نے سر نکالا ایک پہاڑ پر ۔۔۔ بولا جوان شیر کی صورت دھاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا، ہاں بڑھے چلو

ایک جھوکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے ۔۔۔ تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے

زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک ۔۔۔ کوہ سے کاہ تلک، باغ سے اشجار تلک

ابر کی طرح بخارات کا گھر کا آنا ۔۔۔ برف کے پردے میں وہ روئی دھنکتے جانا

ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اڑتے ۔۔۔ اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے

جا بجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے ۔۔۔ اور سرچشمہ میں، شیشے کی طرح جم جاتے

جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے ۔۔۔ یا کہ پتوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے

شجرِ نور سرِ طور سر آتے ہیں! ۔۔۔ سربسر غیرتِ بلور نظر آتے ہیں

علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے جانا چاہا ۔۔۔ بزم اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا

سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے پاس اپنے ۔۔۔ خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ ان کے

قتلِ مضموں تھا، زمانے میں، فقط کام ان کا ۔۔۔ نکتہ چینی سے تھا مشہور جہاں نام ان کا

الغرض بڑھ کے وہ جس دم سرِ دربار آئے ۔۔۔ لوگ انھیں دیکھتے ہی، جوش میں اک بار آئے

اور چلائے کہ، ہے علم سے کیا کام انھیں ۔۔۔ مشغلے اور ہی کچھ ہیں، سحر و شام انھیں

کوئی تصنیف ہو ان کی، تو دکھا دیویں ذرا ۔۔۔ ہو جو تقریر کا دعویٰ، تو سنا دیویں ذرا

سن کے اس بات کو، ان کے بھی ہوئے کان کھڑے ۔۔۔ سامنے تخت کے گھبرا کے ہوئے آن کھڑے

سوچ کر ہوش حواس اپنے سنبھالے آخر ۔۔۔ اور بغل سے کئی کاغذ وہ نکالے آخر

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم ۔۔۔ پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم جانتے ہم

یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں

اس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں

[محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف

محمد حسین آزاد (جہاں بانو بیگم) ؛
محمد حسین آزاد (انگریزی) از محمد صادق ؛
ماہنامہ راوی (مولانا محمد حسین آزاد نمبر)]

۲۔ تجمل دہلوی، رسول خان

رسول خاں نام تھا۔ ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خان دہلوی کے فرزند تھے۔ ان کا دہلی کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ علم طب انھوں نے مصلح الملک حکیم اسد علی خان سے حاصل کیا تھا۔ مہاراجہ ہندو راؤ رئیس گوالیار (مقیم دہلی) کی سرکار میں بزمرۂ اطبا ملازم تھے۔ فنِ خطاطی سے بھی شغف تھا، اور اس میں آخری زمانے کے مشہور خطاط محمد امیر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ اکثر خطوط بہت عمدہ لکھتے تھے۔ نظم و نثر دونوں سے تعلقِ خاطر تھا۔ قصہ طوطا مینا اور چند رسائل ان سے یادگار ہیں۔ شاعری میں حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لیتے تھے۔ بلکہ ان کا عیش کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتا تھا۔ اصنافِ سخن میں غزل، قطعہ، شہر آشوب اور تاریخ گوئی پر عبور حاصل تھا۔ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۶ – ۱۸۷۷ء) میں پچاس برس کی عمر میں رحلت کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :

کشتہ ترے ستم کا جلایا نہ جائیگا — رکھا رہے گا طاق پہ اعجازِ عیسوی
منظور، ناصحا! تری ساری نصیحتیں — پر اس کا دھیان دل سے بھلایا نہ جائیگا
مطلب ہزار دل میں ہیں، پر اس کے روبرو — سچ تو یہ ہے کہ لب بھی ہلایا نہ جائیگا

"فغانِ دہلی" میں ان کے متعدد شہر آشوب شامل ہیں۔ ان میں سے صرف ایک قطعہ دیکھیے :

پھرتے چلتے جو میں آنکلا بہ شہر دہلی
وہ مکاں مجھ کو نظر آئے، نہ اس جا وہ مکیں
نہ دکانوں کی وہ رونق، نہ وہ لطفِ بازار
نہ وہ خوبیِ سڑک، اور نہ صفائیِ زمیں

نہ کٹوروں کی وہ جھنکار، نہ شورِ خلقت
نہ پریزادوں کا جلوہ، نہ وہ حُسنِ نمکیں
نہ وہ کوٹھوں کی سجاوٹ، نہ وہ کمروں کی نمود
نہ کوئی ماہ لقا، اور نہ کوئی زُہرہ جبیں
جس طرف دیکھا، نہ پایا کوئی واں راحتِ جاں
دلِ مضطر نے کسی جائے نہ پائی تسکیں
چرخِ بدکیش کو کیا کوسوں، نہ چھوڑے اس نے
وہ نزاکت بھرے انسان، وہ اہلِ تمکیں
ایسے ایسے تھے کہ اچھوں کو غش آجاتے تھے
کھول دیتے تھے جدھر اپنی، وہ زلفِ مشکیں
خوں رُلایا انھیں جلاّدِ فلک نے کیا کیا
وہم سے کرتے نہ جو ہاتھ حِنا سے رنگیں
ملنا دشوار ہے اب اُن سے تو اے پیک خیال!
دلِ بیتاب کو کس طرح سے آجائے یقیں
لگ گئی کس کی نظر، کون تھا ایسا کم بخت
کور ہو جائے الٰہی، کہیں چشمِ بد بیں
باغ کی سمت میں آیا تو میں کیا دیکھتا ہوں
خاک سی اُڑتی ہے، گل بوٹے کا واں نام نہیں
جس طرف دیکھا تو اک ڈھیر تھا خار و خس کا
نہ تو نرگس تھی، نہ سوسن، نہ سمن، نے نسریں
سو سوا ٹھکھیلی سے چلتی تھی جہاں بادِ نسیم
بادِ صرصر کا بھی دیکھا، تو نہ تھا نام کہیں

عندلیبانِ چمن چہچہے کرتے تھے جہاں
ایک چڑیا بھی نہ دیکھی وہاں کرتی چیں چیں
تھی جہاں نغمہ سرائیِ طیورِ گلشن!
مرثیہ خوانوں کی سی آئے تھی آوازِ حزیں
آشیانے ہیں وہاں زاغ و زغن کے صدہا
تھے جہاں سیکڑوں طاؤس، ہزاروں شاہیں
چوبِ بوسیدہ کا انبار پڑا تھا کہ جہاں
سروِ نوخیز کھڑے رہتے بہ زیب و تزئیں
تودہ تودہ تھا پڑا ہائے، وہاں بول و براز
جس جگہ رہتی تھی آراستہ بزمِ رنگیں
چہچہے، قہقہے میں جن کے گزرتے اوقات
مثلِ ماتم زدہ بیٹھے نظر آئے غمگیں
دیکھ یہ حال بصد حسرت و صد یاس و الم
وہاں تجمّل نے پڑھا مطلع ثاقبؔ[۲] یہ وہیں

اے کہن سالِ فلک! دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا، کھو کے نشانِ دہلی

(خمخانۂ جاوید جلد دوم؛ فغانِ دہلی: ۱۷۱ - ۲۷۲؛
مراۃ الاشباہ: ۷۰؛ سخن شعرا: ۸۳)

۳۔ تشنہ دہلوی، محمد علی:

دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعری کی ابتدا شیخ ابراہیم ذوقؔ کے زیرِ سایہ ہوئی۔

۲۔ شہاب الدین احمد خان بہادر ثاقبؔ دہلوی

اور ان کے انتقال کے بعد حکیم آغا جان عیش کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وارستہ مزاج تھے۔ ہمہ وقت مستی و مخموری سے کام تھا۔ وضع درویشانہ تھی، لیکن لباس کی طرف سے اکثر بے پروا اور غافل رہتے۔ معاصرین میں ظہیر دہلوی، انور دہلوی اور داغ دہلوی سے زیادہ صحبت تھی۔ حافظہ کی قوت کا یہ عالم تھا کہ شعرائے معاصرین کے علاوہ اکثر شعرائے متقدمین کا کلام بھی ازبر تھا۔ ان کے ذہن کی رسائی اور طبیعت کی وزاکی کے سب ہی قائل تھے۔

تشنہ ۱۲۸۲ھ تک دلی میں مقیم رہے۔ پھر وارفتگی نے زور کیا تو بادیہ پیمائی کی ٹھانی، جہانیاں جہاں گشت بن گئے۔ میرٹھ، سہارن پور، پٹیالہ، امرتسر، لاہور، ملتان وغیرہ کی خاک چھان ڈالی۔

گر تشنہ! چھوٹتا نہ ہمارا وطن تو پھر
اس طرح پھرتے کاہے کو ہم بیوطن خراب

دو برس کی ہرزہ گردی کے بعد ۱۲۸۴ھ میں وطن کی یاد آئی۔ دلی کا رخ کیا اور کچھ دن یہاں رہ کر یارانِ وطن کے درمیان صحبتِ فکر و فن گرم کی۔ چندے دم لے کر پھر چل کھڑے ہوئے۔ اب کے ایسے گئے کہ پلٹ کر نہیں آئے۔ عالمِ غربت میں ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹–۷۰ء) میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بعض تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ تشنہ نے پورب میں انتقال کیا، لیکن وہ نشان دہی نہیں کرتے کہ کہاں انتقال ہوا۔ تشنہ کے رفیقِ قدیم ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ تشنہ کی وفات الور میں ہوئی۔

تشنہ کے بارے میں ان کے بعض معاصرین کا یہ قول ہے کہ وہ اپنے ہم صحبت شعرا کا کلام اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں، بالخصوص داغ کے کلام پر ان کی نظرِ عنایت زیادہ رہتی تھی۔

لالہ سری رام تشنہ کی شاعرانہ شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اُن کے مشاق سخن سنج ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ شعر بہت اچھا کہتے

روزمرہ زبان پر اچھا عبور تھا۔۔۔ کلام میں اکثر ایسے بلند پایہ اور عدیم النظیر اشعار پائے جاتے ہیں، جس سے ان کا رتبۂ استادی مسلم ہوتا ہے۔ (خمخانۂ جاوید، ۲ : ۸۸)

تشنہ کی غزلیں ان کی زندگی ہی میں عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہو گئی تھیں اور اکثر اربابِ طرب کی محفلوں کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے :

ٹھنڈا چراغ ہو گیا پیری میں عمر کا
تھا رات بھر دیے کا اجالا، سحر نہ تھا

جب تک کہ اس کی زلفِ مسلسل کا تھا نہ دور
اندھیر تھا جہاں میں، مگر اس قدر نہ تھا

کہا ہم نے کہ اے جانِ جہاں ہم تم پہ مرتے ہیں
تو فرمایا کہ، مجھ پر آپ کیا احسان کرتے ہیں

جہاں میں ایک تو ہم ہیں کہ تنگ آئے ہیں جینے سے
اور اک خضر و مسیحا ہیں کہ اس جینے پہ مرتے ہیں

الٰہی دیدہ و دل تو نہ ٹھہرے، رہگذر ٹھہرے
کبھی حسرت گزرتی ہے کبھی ارماں گزرتے ہیں

طبیعت کی روانی ایک سی رہتی ہے یاں، تشنہ!
وہ دریا ہیں کہ جو چڑھتے ہیں، پھر دم میں اترتے ہیں

کیا کہا، پھر بھی کہو، دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے خمِ گیسو میں، اگر کچھ بھی نہیں

اک جفا تیری، نہیں کچھ بھی، مگر ہے سب کچھ
اک وفا میری کہ، سب کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع بھی، گُل بھی ہے، بُلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہیں، سحر کچھ بھی نہیں

شمع مغرور نہ ہو بزم فروزی پہ بہت
رات بھر کی یہ تجلّی ہے، سحر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ، جدھر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی میں تو اُدھر ہوں کہ، جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے، اے تشنہ!
فائدہ رونے سے، اے دیدۂ تر! کچھ بھی نہیں

نہ دل زلفوں سے چھوٹا اور نہ تم زلفیں بنانے سے
یہ وہ جنجال ہے جس سے نہ تم نکلے، نہ ہم نکلے

تمھاری ہم کو خبر کیا کہ ایک مدّت سے
یہ بے خبر ہیں کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

نہ ہوں وہ لب جو کھلیں شکوۂ جفا کے لیے
وہ ٹوٹیں ہاتھ جو اٹھیں کبھی دعا کے لیے

ہوئی تھی ایسی کہاں کی صفائی اُس بُت سے
کہ آسماں نے عوض خاک میں ملا کے لیے

(خمخانۂ جاوید، جلد دوم
سخن شعرا : ۸۷
گلستانِ سخن : ۱۷۲-۱۷۳)

۴۔ حسن سکندر آبادی، میر محمد حسن

میر محمد حسن نام، میر قلندر علی سکندر آبادی کے بیٹے تھے۔ دلی میں قیام تھا۔ تجارت ذریعۂ معاش تھی۔ مذاقِ شاعری کی بدولت اوّل اوّل اپنے ہموطن منشی ہرگوپال تفتہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعد میں حکیم آغا جان عیش کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق ۱۸۷۴ء میں حیات تھے۔ یہ چند شعر ان کے کلام کا نمونہ ہیں:

ناحق اس بُت کی دوستی میں، حسن! لگ گیا داغ، پارسائی میں

حسن، کل آبلہ پا، وحشیانہ سر کو ٹکراتا اٹھلائے منہ، گریباں چاک، جاتا تھا بیاباں میں

مجھ سے بنیاد ہے محبّت کی عشق کا خاندان ہے مجھ سے

بُرا ہو، یا الٰہی! دل لگی کا گھٹا کی عمر اور الفت بڑھا کی

رونے سے ایک پل نہیں فرصت فراق میں یہ آنکھ کیا لگی، مرے پیچھے بلا لگی

(خمخانۂ جاوید، جلد دوم)

۵۔ ہادی، مرزا غلام فخر الدّین

شاہزادہ خجستہ بخت خلف شاہ عالم ثانی کے فرزند تھے۔ سلیم الطبع اور پختہ فکر کے مالک تھے، ان کا صرف یہ ایک شعر ملا:

آیا نظر وہ ماہ لقا تین دن کے بعد
روشن یہ قصرِ چشم ہوا تین دن کے بعد

(سخن شعرا: ۵۵۹؛
گلستانِ سخن: ۴۷۵)

۶۔ ہُد ہُد، عبد الرحمٰن

کہیں پورب کے علاقے سے دلی آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ حکیم آغا جان کی

رہائش گاہ کے قریب ایک مکتب تھا۔ اسی میں بچوں کو پڑھانے لگے۔

یہیں حکیم صاحب کے خاندان کے بعض بچے بھی زیر تعلیم تھے۔ ان میں ایک لڑکا عبدالرحمن سے سکندر نامہ کا درس لیتا تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے اس سے سکندر نامہ کا سبق جو سنا تو عجیب نئے نئے مطالب و مضامین سننے میں آئے۔ اس پر انھوں نے لڑکے سے کہا کہ کسی وقت اپنے استاد سے ہم کو بھی ملواؤ۔ چنانچہ عبدالرحمن ان کا پیغام ملنے پر حاضر ہو گئے۔ حکیم صاحب نبّاض کے علاوہ قیافہ شناس بھی تھے۔ صورت دیکھتے ہی بھانپ گئے کہ یہ شخص علم سے کورا ہے، البتہ اگر اس پر تھوڑی سی محنت اور وقت صرف کیا جائے تو بزمِ سخن میں دلچسپ اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے دورانِ گفتگو میں دریافت کیا کہ آپ کچھ شعر و شاعری سے شوق فرماتے ہیں؟ مولوی عبدالرحمن نے جواب دیا "ہو سکتا ہے، یہ کیا مشکل بات ہے"۔ حکیم صاحب نے فرمایا: "ایک جگہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔ آٹھ نو دن درمیان میں ہیں۔ یہ مصرع طرح ہے آپ بھی غزل کہہ لیجیے تو آپ کو بھی مشاعرہ میں لے چلیں"۔ عبدالرحمن نے آج تک مشاعرہ کا نام بھی نہ سنا تھا نہ اس کی تہذیب سے واقف تھے۔ عیشؔ نے انھیں مشاعرے کی صورتِ حال سے واقف کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ غزل کہہ کر مشاعرے میں شریک ہوں۔ عبدالرحمن صاحب غزل کہہ کر لائے اور مولوی صاحب ہی تخلص رکھا۔ حکیم صاحب نے غزل کی تعریف بھی کی اور جا بجا اصلاح سے سنوار کر تفریحِ طبع کا آلہ تیار کیا۔ مولوی صاحب اس سلوک سے بیحد خوش ہوئے اور حکیم صاحب کو بھی اطمینان ہو گیا۔

چونکہ مولوی صاحب کی وضع قطع نہایت درجہ مضحک تھی، چگی ڈاڑھی، لمبی اور نکیلی، منڈا ہوا سر اس پر ٹکّو عمامہ، دُوری سے دیکھنے پر کھٹ بڑھئی نظر آتے تھے۔ حکیم صاحب کی طبیعت لہرائی۔ ارشاد فرمایا کہ شعرا کو تخلص بھی ایسا چاہیے، جو پُر کشش اور ظریفانہ ہو اور خوشنما بھی۔ آپ ہُدہُد تخلص کریں۔ ہُدہُد نہ صرف حضرت سلیمان کا قاصدِ خجستہ گام

۴۔ شہزادی قمر سلطان کی تصدیق کے مطابق یہ مکتب مسجد آغا جان کے نچلے درجے میں تھا۔ خود مسجد کی نچلی تعمیر کی نوعیت بھی اس قول کے درست ہونے کی شہادت دیتی ہے۔

تھا بلکہ رازدار بھی تھا۔

عبدالرحمٰن نے عیش کے فرمان کو بخوشی قبول کیا اور "مولوی صاحب" سے "ہُدہُد" بن گئے۔
مشاعرہ میں جب شمع ہُدہُد کے سامنے آئی تو حکیم صاحب نے موقع کی مناسبت سے ان کے بارے میں چند تعارفی جملے ارشاد فرمائے۔ جنھیں سُن کر سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میاں ہُدہُد کا شعر پڑھنا تھا کہ پوری محفل زعفران زار بن گئی۔ اور ہر طرف سے تعریف کا سیل امنڈ پڑا۔

غرض عیش کی کوششوں سے مولوی عبدالرحمٰن ڈنکے کی چوٹ شاعر اور ہُدہُد بن گئے۔ اس کے بعد کیسا مدرسہ، اور کہاں کا درس، بس اب ہمہ وقت شاعری تھی یا مشاعرے اور میاں ہُدہُد۔ لیکن پیٹ بڑی ظالم چیز ہے۔ درس کا سلسلہ بند ہو گیا تو حکیم صاحب کو میاں ہُدہُد کے ذریعۂ معاش کی فکر ہوئی۔ آخر ایک کارآمد نسخہ تجویز کیا۔ میاں ہُدہُد سے کہا کہ بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ ڈالو تو تمھیں دربار میں لے چلیں۔ حکیم صاحب شاہی طبیب تو تھے ہی، قصیدہ تیار ہوتے ہی ہُدہُد کو دربار میں ساتھ لے گئے۔ مسخرے ہمیشہ سے امیروں اور شاہوں کی محفل کی رونق بڑھاتے آئے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر تو خود شاعر تھے۔ ہُدہُد کا کلام ان کی زبان سے سُن کر حد درجہ محظوظ ہوئے۔ آزاد نے اپنی یادداشت سے اس قصیدے کے چار شعر آبِ حیات میں نقل کیے ہیں۔

جو تیری مدح میں، میں چونچ اپنی وا کر دوں
تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلہ کر دوں

جو آ کے ریز کرے تیرے آگے موسیقار
تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں

جو سرکشی کرے آگے مرے ہُما آ کر
تو اس کے نوچ کے پَر، شکلِ نیولا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لیے
فلک کہے ہے: بمقترِ میں با جرا کر دوں

ظفر نے قصیدہ سن کر تخلص کی رعایت سے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہُدہُد الشعرا منقار جنگ بہادر خطاب عطا فرمایا اور ساتھ ہی چار روپے مہینا علوفہ مقرر کر دیا۔ اب کیا تھا ہُدہُد کی شاعری پر گویا شاہی مُہر لگ گئی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ برسات نے ہُدہُد کا گھونسلہ اجاڑ دیا۔ مکان زمین بوس ہو گیا۔ ہُدہُد بیچارہ کیا کرتا، حتی الامکان ہاتھ پاؤں مارے لیکن مکان ہاتھ آنا تھا نہ آیا۔ مجبور ہو کر حکیم صاحب سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ شہر میں کئی شاہی مکانات خالی پڑے تھے۔ حکیم صاحب نے ہُدہُد کو تسلی دے کر کہا: گھبراؤ نہیں، شہر میں بیسیوں شاہی مکانات ہیں، انھیں میں سے کسی ایک میں گھونسلہ بنانے کی اجازت مل جائیگی۔ یہ کہہ کر بندوبست میں مصروف ہوئے۔ اس موقع کے لیے عرضی موزوں ہوئی۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

بجز ترے شاہنشہا، کس کس کے آگے روئیے
کس سے کہیے جا کے یہ، غم کو ہمارے کھوئیے
تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار
ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں پوئیے
حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریے
سنگلاخ ایسی زمیں ہے، سوچ، اے دل، تا کجا
فکر کیجے صرف اس میں، اور پتھر ڈھوئیے
رشتۂ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہو وے دراز
یا خدا، کِھلتے رہیں دنیا میں جب تک سوئیے
دے دے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے
مارتا پھرتا ترا ہُدہُد ہے ٹامک ٹوئیے

جس زمانہ میں قلعہ کے شاہی ملازمین کی تنخواہ کی ادائی کی ذمّہ داری راجہ دیبی سنگھ کے سپرد ہوئی، ہُدہُد کی تنخواہ بھی رک گئی۔ ہُدہُد نے عیش کو متوجّہ کیا۔ چنانچہ فوراً

ایک قطعہ راجہ دیبی سنگھ کی خدمت میں ارسال کیا گیا:

جہاں میں آج دیبی سنگھ، تو راجوں کا راجا ہے
خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آبراجا ہے
سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی
تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجا ہے
شکم اہل جہاں کے سب ہیں شکرانے بجالاتے
دمامہ تیرا جا کر گنبدِ گردوں پہ باجا ہے
کسی کو دے نہ دے تنخواہ، تو مختار ہے اس کا
مگر ہُدہُد کو دے دے، کیوں یہی ہُدہُد کا کھاجا ہے

ہُدہُد کبھی کبھی حکیم صاحب کے اشارے پر ایک آدھ ٹھونگ کسی ممتاز معاصر سخنور کے بھی لگا دیتے تھے یا ایسی غزلیں برسرِ مشاعرہ پڑھ دیتے جس کے الفاظ شستہ و رُفتہ، ترکیبیں رنگین اور پیچیدہ ہوتیں، لیکن پورے شعر میں معنی و مطلب ندارد۔ مثلاً ایک دن یہ شعر پڑھا:

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہۂ مضراب نہیں

لوگ معترض ہوئے تو جواب دیا کہ میں نے یہ غزل غالب کے رنگ میں کہی ہے۔ غالب نے تو اسے مذاق میں اڑا دیا، لیکن سب حضرات تو چپ رہنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک بانہ تیار کر کے مقابلے کے میدان میں پھاند پڑے۔ لیکن اس مقابلے میں ہُدہُد تو صحیح سلامت رہے، بانہ کے پرَ نچ گئے۔ اور آخر کار اسے میدان سے ایک دم بھاگتے بنی۔ ہُدہُد میدان سے شاد و کامیاب اپنا قصیدہ پڑھتے ہوئے پلٹے:

جسے کہتے ہیں ہُدہُد، وہ تو نرشیروں کا دادا ہے
مقابل تیرے کیا ہو، تو تو اک جُرّہ کی مادہ ہے

گراب کی بازڑی میداں میں آئی سامنے میرے
تو دم میں پر نہ چھوڑونگا، یہی میرا ارادہ ہے
مقرر بازؔ جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے!
ہوا معلوم یہ اُس سے کہ گھر تیرا کشادہ ہے
ادب، اے بے ادب، اب تک نہیں تجھ کو خبر اس کی
کہ ہُدہُد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

جب بازؔ کی نہ چلی، تو یاروں نے ایک اور شخص کو تیار کیا اور اس کا زاغؔ تخلص رکھ کے اسے ہُدہُد سے بھڑا دیا۔ ہُدہُد نے ان حضرت کی بھی خوب خبر لی۔ وہ بھی مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور تھوڑے دنوں بعد ایسا غائب ہوا کہ پھر اُس کا پتا نہ چلا۔ جناب زاغؔ کی پذیرائی کے لیے ہُدہُد نے جو استقبالیہ تیار کیا تھا، اسے ملاحظہ فرمایئے:

جُون آیا ہے بدل اب کے عدو کوّے کی
اس کی ہے پاؤں سے تا سر وہی خُو کوّے کی
وہی کاں کاں، وہی کیں کیں، وہی ٹاں ٹاں اس کی
بات چھوڑی نہیں، ہاں اک سرِ مو کوّے کی
پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوّا ہوگا
پھر جو معلوم کیا، ہے یہ بہو کوّے کی
بن کے کوّا جو یہ آیا ہے، تو اے ہُدہُد شاہ!
دُم کترد دینے کو کچھ کم نہیں تو کوّے کی

ہُدہُد کے یہ تمام حالات اور کلام محمد حسین آزادؔ کے بیان پر مبنی ہے (آبِ حیات: ۴۸۱-۴۸۷) "سخن شعرا"، اور "گلستانِ سخن" میں بھی جو کچھ ہے، وہ "آبِ حیات" ہی کی خوشہ چینی ہے۔ گویا ہُدہُد کے بارے میں تمام کوائف کا واحد ماخذ محمد حسین آزادؔ ہیں۔

یہاں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے خیال میں آزاد کا یہ بیان صداقت پر مبنی نہیں ہے کہ حکیم (عیشؔ) صاحب کے فکرِ سخن کے وقت "جو ظرافت کے مضامین خیال میں آتے، انھیں موزوں کر کے ہُدہُد کی چونچ میں دے دیتے تھے"، (آبِ حیات: ۴۸۵) بلکہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر سے کچھ ایسا شبہہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خود ہُدہُد کی شخصیت ہی جعلی اور مولانا آزاد کی افسانہ طرازی کا کرشمہ ہے۔ لکھتے ہیں:[5]

۵۔ مضامین فرحت، ۲: ۱۹۰-۱۹۱

آزاد جانتے تھے کہ اگر ہُد ہُد کو غالبؔ اور مومنؔ جیسے لوگوں سے مشاعرے میں لڑادونگا، تو دنیا بھر میں کوئی بھی میری بات ماننے والا نہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ کیا کہ ہُد ہُد کو حکیم آغا جان عیشؔ کا پٹھو بنا کر میدان میں اتارا۔ جو جانور ہُد ہُد کے مقابلے میں آیا اس کو کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اور اس پالی کی ہار جیت سے کچھ نہیں کیا، تو کم سے کم ذوقؔ کے برابر والوں کا مذاق اڑا کر ان کی شان میں بٹہ ضرور لگا دیا۔

آزاد مرحوم نے ہُد ہُد کو ایک نہایت بیوقوف شخص ظاہر کر کے اس کے کلام کو حکیم آغا جان عیشؔ سے منسوب کیا ہے۔ حکیم صاحب کا سرمایۂ حیات ان کے دو دیوان ہیں۔ اور دونوں اس وقت میرے پاس موجود ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام اور ہُد ہُد کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خوش مذاقی ان کو چھو کر نہیں گئی ہے۔ خدانخواستہ کسی شعر میں مذاق کا پہلو اختیار کیا بھی ہے، تو سبحان اللہ! اس لکھنے سے نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔ ان کے دونوں دیوانوں میں خوش مذاقی کے صرف چند ہی شعر ہیں، وہ سب کے سب لکھے دیتا ہوں۔ آپ خود ان کے مذاق کو ہُد ہُد کی خوش مذاقی سے ملا کر دیکھیے اور انصاف کیجیے کہ ہُد ہُد کی چونچ میں حکیم صاحب کا دیا ہوا چونگا ہے۔ یا وہ یہ آذوقہ کہیں اور سے اٹھا کر لایا ہے۔

اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے عیشؔ کے کلام سے ان کی خوش مذاقی کے نمونے دیے ہیں۔ لے دے کے یہ سارے گیارہ شعر ہیں؛ جو ان کے دونوں دیوانوں کا نچوڑ ہیں۔ انھیں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لیجیے، یہ ہے حکیم صاحب کے دونوں دیوانوں کی خوش مذاقی کا خلاصہ۔ اس کے بعد بھی اگر آپ آزاد مرحوم کی اس تحریر کو صحیح سمجھیں اور یہ فیصلہ کریں

کہ آغا جان عیشؔ ہی ہُدہُد کو شعر لکھ دیا کرتے تھے، اور اس لیے لکھ دیا کرتے تھے کہ اس زمانے کے نامور شعرا پر چوٹ کی جائے، تو آپ جانیں، اور آپ کا دین ایمان جانے۔

یہ حقیقت ہے کہ آزاد مرحوم نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے سر پر تاجِ ملک الشعرائی رکھنے کے لیے کس کس کی پگڑی نہیں اچھالی، اور کہاں کہاں کے طوطا مینا نہیں اڑائے۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہُدہُد کا یہ کلام عیشؔ کا کہا ہوا نہیں ہے، بلکہ نہ صرف یہ کلام ہی، خود ہُدہُد کی شخصیت بھی محمد حسین آزاد کے دماغ کی اختراع ہے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے ہُدہُد کے نام سے جو کلام "آبِ حیات" میں درج کیا ہے، وہ خود ان کا اپنا کہا ہوا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے عیشؔ کے دیوان سے چُن چُن کے صرف گیارہ شعر درج کیے ہیں، جو کھینچ تان کے کسی درجے میں مزاح کی ذیل میں لائے جا سکتے ہیں۔ اور وہ ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسے بھونڈے مذاق کا شخص ہُدہُد سے منسوب کلام کسی صورت نہیں کہہ سکتا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا فرمانا بجا۔ لیکن محمد حسین آزاد کے ہاں تو ایسے گیارہ شعر بھی نہیں نکلیں گے۔ وہ تو ماشاء اللہ مزاح سے بالکل عاری ہیں۔ پس، اگر یہ شعر عیشؔ نے نہیں کہے کیونکہ ان میں مزاح کی حس نہیں تھی، تو آزاد تو کسی عنوان بھی ان کے خالق نہیں قرار دیے جا سکتے۔

۷۔ واحد دہلوی، شیخ عبدالواحد

دہلی میں رہٹ کا کنوا نام ایک محلّہ تھا، یہ اپنے ایامِ شباب میں وہیں رہتے تھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو حکیم آغا جان عیشؔ کی شاگردی اختیار کی۔ نمونۂ کلام درجِ ذیل چند اشعار ملے ہیں:

بیتاب ہو کے شوق میں سب راز کہہ دیا
واحدؔ ستم کیا یہ دلِ بیقرار نے

مونس اپنا دل کو میں سمجھا تھا وا حد! عشق میں
پر مرے پہلو میں وہ بھی دشمنِ جاں ہو گیا

پوچھتے کیا ہو اسیرانِ قفس کا احوال
بال و پر نکلے نہیں تھے کہ گرفتار ہوئے

(سخن شعرا : ۵۳۸،
گلستانِ سخن: ۴۷۰)

کتابیات

آب حیات : محمد حسین آزاد، (بار دہم) مطبع کریمی، لاہور

تاریخ جھجر : ابوالاعجاز منشی غلام نبی میرٹھی، مطبع فیض احمدی : ۱۸۶۶ء

تاریخ ہند : شمس العلما منشی ذکاء اللہ، مطبع نولکشور، لکھنؤ :

تذکرہ علمائے ہند : رحمان علی، مطبع نولکشور، لکھنؤ : ۱۹۱۴ء

تذکرہ ہندی : غلام ہمدانی مصحفی (مرتبہ مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو ہند : ۱۹۳۳ء

تلامذۂ غالب : مالک رام، برقی آرٹ پریس، نئی دہلی : ۱۹۸۴ء

جواہر سخن : (جلد ۲) محمد مبین چریاکوٹی، ہندستانی اکیڈمی، الٰہ آباد : ۱۹۳۵ء

چراغِ دہلی : مرزا حیرت دہلوی، کرزن پریس، دہلی : ۱۹۰۷ء

خمخانۂ جاوید : سری رام (۱، ۲، ۵) : ۱۹۰۸ — ۱۹۴۰ء

داستانِ غدر : راقم الدولہ ظہیر دہلوی، کریمی پریس، لاہور

دیوانِ ذوق : مرتبہ محمد حسین آزاد، علمی پرنٹنگ ورکس، دہلی : ۱۹۳۳ء

دیوانِ معروف : مرتبہ شاہ عبدالحامد قادری بدایونی، نظامی پریس، بدایوں : ۱۲۵۳ھ

ذکرِ غالب : مالک رام (طبع پنجم) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی : ۱۹۷۶ء

سخنِ شعرا : عبدالغفور نسّاخ، مطبع نولکشور، لکھنؤ : ۱۸۷۴ء

شعرائے اردو : میر حسن (مرتبہ حبیب الرحمٰن خان شروانی) انجمن ترقی اردو ہند : ۱۹۴۰ء

علم و عمل ۰ : (وقائع عبدالقادر خانی) مترجمہ معین الدین، ایجوکیشنل پریس، کراچی

فال آف دی مغل امپائر : سر جادو ناتھ سرکار (انگریزی) کلکتہ : ۱۹۳۲ء

فغانِ دہلی : محمد تفضّل حسین خان کوکب، مطبع بدر الدّجیٰ، دہلی : ۱۸۷۶ء

گلِ رعنا : حکیم سیّد عبدالحی، مطبع معارف، اعظم گڑھ : ۱۳۶۴ھ

گلزارِ ابراہیم : علی ابراہیم خان (مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ : ۱۹۳۲ء

گلستانِ بےخزاں (نغمۂ عندلیب) قطب الدین باطن، نولکشور پریس لکھنو: ۱۸۷۵ء
گلستانِ سخن: مرزا قادر بخش صابر، مطبع نولکشور ۱۲۷۱ھ
گلشنِ ہند: مرزا علی لطف، رفاہِ عام سٹیم پریس، لاہور: ۱۹۰۶ء
مجموعہ نغز: حکیم قدرت اللہ قاسم (مرتبہ محمود شیرانی): ترقی اردو بورڈ، نئی دلی: ۱۹۷۳ء
محمد حسین آزاد: ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی: ۱۹۶۵ء
محمد حسین آزاد: جہاں بانو نقوی حیدر آباد: ۱۹۴۰ء
محمد حسین آزاد (انگریزی): ڈاکٹر محمد صادق لاہور: ۱۹۷۴ء
مراۃ الاشباہ: محمد مرتضیٰ خان شیدا دہلوی، دہلی: ۱۲۸۵ھ
مضامینِ فرحت (جلد ۲): مرزا فرحت اللہ بیگ: مطبع دستگیری، حیدر آباد: ۱۹۴۴ء
مومن، شخصیت اور فن: ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی: ۱۹۷۲ء
مومن: کلب علی خان: مجلس ترقی ادب، لاہور: ۱۹۶۱ء
میخانۂ درد: ناصر نذیر فراق: جیّد برقی پریس، دہلی: ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء
نکات الشعرا: میر تقی میر: انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد: ۱۹۳۵ء
نوبت پنج روزہ (وداع ظفر): راشد الخیری: دہلی اردو اکاڈمی: ۱۹۸۷ء
نہالستانِ شار: محمد جمال الدین طور: آگرہ اخبار پریس، آگرہ: ۱۹۳۵ء
واقعاتِ دارالحکومت دہلی (جلد ۲): بشیر الدین احمد شمسی مشین پریس، آگرہ: ۱۹۱۹ء
یادگارِ غالب: الطاف حسین حالی: رام دیال اگروال، الہ آباد: ۱۹۵۵ء

رسائل و جرائد

راوی (ماہنامہ)، لاہور (مولانا محمد حسین آزاد نمبر) لاہور: ۱۹۸۳ء
قومی زبان (ماہنامہ) کراچی: ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء

دیوانِ اوّل

الف

یا فتّاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

عیاں ہے ہر طرف کثرت میں جلوہ تیری قدرت کا
ترے صدقے دکھایا کیا تماشا اپنی قدرت کا
ہزاروں ایسے عالم ہوں گر معمورِ عصیاں سے
بہت ہے ان کو اک قطرہ ترے دریائے رحمت کا
بھلا کس طرح کوئی کُنہ صنعت کو تری پہنچے
جہاں آئینۂ ادراک ہو خود محوِ حیرت کا
مثل ہے جو کہ چھوٹا منہ بڑی بات اس جگہ سچ ہے
یہ منہ پایا ہے کس نے نام لے جو تیری عظمت کا
چلے میدانِ حمدِ پاک میں تیرے کوئی کیوں کر
وہاں اقرار ہے پیغمبروں کو ضعفِ طاقت کا
سوا اس کے کہ انساں دل سے خطِّ عاجزی کھینچے
بیاں ہو اور کیا وصف اس سے تیری شان و شوکت کا
یہ جب لاتقنطوا من رحمت اللہ تو نے فرمایا
تمسّک عاصیوں کو ہو گیا مضموں اس آیت کا

غزل نمبر (۱) س میں شامل نہیں، یہاں سے لی گئی ہے۔

مجھے دے جانِ آگہ اور اس ظلمت کدے میں تو
دلِ روشن عطا کر مجھ کو صدقہ اپنی عزت کا
منور کر دے تو کاشانۂ دل عیشؔ کا، یا رب!
رسول اللہ کا صدقہ اور تصدق اس کی عزت کا

(۲) ؎

ہم مدیحِ عالم ہیں رکھتے ہیں وہ ہاں اپنا
مدح جس کی سمجھیں فخرِ اہلِ آسماں اپنا

سرورِ دو عالم کا ہوں جہاں میں مداح
پیشوا مجھے سمجھیں کیوں نہ انس و جاں اپنا

بیوقوف توبہ کر جس کا ہو خدا مداح
اس کی مدح ہو ہم سے ہے یہ منھ کہاں اپنا

نام پاک کو اس کے تو تو کیا ہے روح القدس
ہاتھ آئے نور لکھے کر کے حرزِ جاں اپنا

وہ شفیعِ محشر ہے اس کے نام کے صدقے
اس کے نام سے روشن قصرِ دل ہے یاں اپنا

رشکِ حور جان و دل ایک لطف کا ذرہ
دیوے وہ اگر جمکا سوے عاصیاں اپنا

رونقِ زباں ہے یاں اسمِ پاک اس شہ کا
عیشؔ ہو سکے کیونکر کوئی ہم زباں اپنا

(۳) ؎

جانتا جو سب میں ہے جلوہ اسی کے نور کا
ہے نظر میں اس کی ہر ذرے کو رتبہ طور کا

ہوگا ناوک خوردہ جو اس نرگسِ مخمور کا
اس کا زخمِ دل نہ چکھے گا مزہ انگور کا

بو جہل کعبہ میں ابراہیم بت خانے میں تھے
کیوں جی کیوں نزدیک ہو جاتا ہے یوں بھی دور کا

یہ جلا بھلا ہی وہ دل ہے جو پاوے آفتاب
کر لے بس سر سے ہی اپنے دیدۂ پرنور کا

تفتہ جانوں کو کوئی ٹھنڈا ابھی کر سکتا ہے آہ
شمع کے شعلے سے بس کیا چل سکا کافور کا

اہلِ بینش کو ہے ہر فرد اقیامت کا نشاں
اور ہر اک شام سے پیدا ہے عالم گور کا

دعویِ باطل وبالِ جان ہے اے مدعی!
حال کیا بانگ انا الحق نے کیا منصور کا

---

۱ غزل (۲) ... میں شامل نہیں، ... سے لی گئی ہے

۲ غزل (۳) ... کے ابتدائی دو شعر ... سے لیے گئے۔

زخمِ دل عاشق کا تیرے آفتاب حشر کو
مثلِ مہ سمجھے ہے پھاہا مرہمِ کافور کا

یادِ مژگانِ بتاں کے نیشِ غم سے بن گیا
خانۂ زنبور سر روزن مرے ناسور کا

زندہ سب ہو وینگے ہر مرقد سے بن شعلۂ نہنگ
حشر کو بھی ہو چکا اٹھنا ترے رنجور کا

چھتریاں دن رات ڈھوتا ہے مہ و خورِ فلک کی
کیوں نہ ہو خم بوجھ سے جھکتا ہے قد مزدور کا

شور جس کانِ ملاحت کا ہے اس کا ہی تو ہاں
ہے نمک پروردہ سر روزن مرے ناسور کا

جاہ و حشمت پر یہاں کی بھولنا مت غافلو
کیوں کہ ٹوٹے ہے تکبر یہاں اک مغرور کا ق

چرخِ کجرو وہ ہی دیتا ہے بنا اک آن میں
کاسۂ دریوزہ گر کاسہ سرِ فغفور کا

عیش سنگِ غم سے صرفِ شیشۂ دل ہو گیا
قافیہ تھا جو اچھوتا ایک چکنا چور کا

(۴)

پرتو ادیکھیں گر اُس کے عارضِ پر نور کا
حضرتِ موسیٰ کو یاد آجائے جلوہ طور کا

شور گر سن لیں ہمارے نالۂ پر شور کا مطلع ثانی
بھول جاویں حضرتِ اسرافیل رکھنا صور کا

بعدِ مردن قبر میں ضبطِ فغاں کے ہاتھ سے
صورِ محشر بن گیا روزن مرے ناسور کا

سعی بیجا مت کرائے جراح زخمِ عشق ہے
اس کو مرہم چاہیے نیشِ سرِ زنبور کا

کیا حقیقت ہے تمھاری اے تنجر پیشگاں
خاک میں جب مل گیا کاسہ سرِ فغفور کا

مر مٹے سو جاں سے ہم حسن پر بھی رحم آتا نہیں
دیکھنا اے دل تکبر اُس بتِ مغرور کا

عیش زلف اُس رخ پہ چھٹتی ہے تو ہو جاتی ہے شام
اور اٹھتی ہے تو ہو جاتا ہے تڑکا نور کا

(۵)

نالہ جو بلبلِ تفسیدہ جگر کا نکلا
وہ صبا ظلم رسیدہ گلِ تر کا نکلا

صبح دم گھر سے جو ٹکڑا وہ قمر کا نکلا
کانپتا شرق سے خورشید سحر کا نکلا

بھولا کہتے نہیں اس کو یہ مثل ہے مشہور
شام کو آئے اگر کوئی سحر کا نکلا

جان پہ چوری گئی نقصان ہوا دل کے سبب
دوش دیجے کسے یہ بھیدی تو گھر کا نکلا

ایک کو ایک نہ آتا تھا نظر ہوش تھے گم
بزم میں شب کو جو ذکر اس کی کمر کا نکلا

ابرِ تر ہو گیا بس سنتے ہی پانی پانی
کچھ فسانہ جو مرے دیدۂ تر کا نکلا

ساتھ اغیاروں کو لے لے کے پھرے خون بھلا
یہ سرا پہلے کدھر سے کہو شر کا نکلا

تیغ قاتل کی زباں چاٹتے ہے سان آج تلک
نہ مزہ دل سے مرے خونِ جگر کا نکلا

پھر رہا ڈر تجھے کس بات کا اے عیش بتا
دل سے دھڑکا جو ترے نفع و ضرر کا نکلا

(٦)

جس دل میں تری زلف کا سودا نہیں ہوتا
وہ دل نہیں ہوتا نہیں ہوتا، نہیں ہوتا

عاشق جسے کہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا
اور ہووے بھی بالفرض تو مجھ سا نہیں ہوتا

جو کشتۂ تیغِ نگہِ یار ہیں، ان پر
کچھ کارگر اعجازِ مسیحا نہیں ہوتا

مانا کہ ستم کرتے ہیں معشوق، مگر آپ
جو مجھ پہ روا رکھتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا

جو مست ہے ساقی نگہِ مست کا وہ تو
منت کشِ جام و مے و مینا نہیں ہوتا

کہتا ہے کوئی شعلۂ جوّالہ، کوئی برق
اس دل پہ گماں لوگوں کو کیا کیا نہیں ہوتا

زاہد[۱] ہو دو چارِ نگہِ مست تو دیکھیں
آلودہ بہ مے کیونکہ مصلا نہیں ہوتا

ہاں[۲] کچھ تو بیانِ ہوسِ دل میں ہے لذت
جو لب سے جدا حرفِ تمنا نہیں ہوتا

تسکینِ دلِ سوختۂ شمع کی خاطر
کس شب پرِ پروانہ سے[۳] پنکھا نہیں ہوتا

دل عشق نے اتنا بھی نہ چھوڑا کہ جو کہویں
تقسیم جُز لا یتجزّا نہیں ہوتا

دے بیٹھے ہو دل عیش تم ان لوگوں کو جن کی
بیداد کا واں بھی کوئی شنوا نہیں ہوتا

(۷)

سچ بتا کا ہے کا پیکاں[۴] ترے تیر میں تھا
جو مزہ اور ہی زخمِ دلِ دلگیر میں تھا

آہ، اوس دل میں، خدا جانے ہوا کیا ورنہ
نالۂ دل مرا ڈوبا ہوا تاثیر میں تھا

---

۱ و ۲ یہ دونوں شعر س میں اڑ گئے ہیں۔ ل، سے اضافہ کیے گئے

۳۔ ل: بھی

۴۔ پہلے یہ مصرع یوں تھا:

سچ بتا کاہے کا پیکان ترے تیر میں تھا

اُس کی تعریف کروں، میں نے کہاں پائی زباں
خوبی و لطف جو کچھ یار کی تقریر میں تھا

آہ پوری ابھی نکلی ہی نہ تھی دل سے کہ یہاں
دیکھتے کیا ہیں کہ روزن فلک پیر میں تھا

رات دیتا ہی رہا دل کو مرے پیچ پہ پیچ
بل جو تو وہ شوخ تری زلف گرہ گیر میں تھا

نہ دیا غسل اسی واسطے مجھ کو پس قتل
میں نہایا ہوا آب دم شمشیر میں تھا

کیا بلا شوق شہادت تھا کہ تھا حشر کا دن
مجھ کو وہ عرصہ کہ جو ذبح و تکبیر میں تھا

تھے کل اشعار سُنے ہم نے سبھوں کے لیکن
سب سے انداز انوکھا غزل میسر میں تھا[1]

مژدۂ وصل نہ پہنچا تھا تجھے عیش تو پھر
کیوں افاقہ ترے کل رنگ کی تغییر میں تھا[2]

(۸)

مجھے وہ شوخ دلبر کیا نہ پایا
کہ بس دل ہی گیا گذرا نہ پایا

گرا جو اشک کا قطرہ نہ پایا
بہت ڈھونڈھا کہیں ڈھونڈھا نہ پایا

حجاب اپنے سوا اپنا نہ پایا
بجز اپنے دوسرا پردا نہ پایا

سُنا جس دل کو ہم سمجھے تھے اپنا
سو وہ کمبخت بھی اپنا نہ پایا

کبھی تجھ کو دل آزاری سے فارغ
ارے او شوخ بے پروا نہ پایا

---

[1] اصل میں مصرع ثانی مٹا ہوا ہے، ل سے اضافہ ہوا۔

[2] اصل میں مقطع پڑھا نہیں گیا، ل سے اضافہ کیا گیا۔

شمیمِ کاکلِ مشکیں سے بہتر　　کوئی دل کے لیے نسخہ نہ پایا
بہت ڈھونڈھا دلِ شیدا کو لیکن　　خدا جانے کہاں بھولا، نہ پایا
شریفے کی طرح دل ہے گرہ بند　　کسی عقدے کو اس کے وا نہ پایا
بھلا تو ہی بتا، ہنگامۂ حشر　　ترے کوچے میں کب برپا نہ پایا
صبا لے بھاگتی خوشبو مگر ہیچ　　کوئی اس زلف کا ڈھیلا نہ پایا
محبت میں تری اے بحرِ خوبی[1]　　کہیں اس دل کا تھل بیڑا نہ پایا
کسی نے آہ عالم میں سلجھتا　　تری زلفوں کا الجھیڑا نہ پایا
ترے تیرِ جفا نے زخمِ دل چھٹ　　کوئی اور آشنا گہرا نہ پایا
کسی خوں نابہ نوشِ دل کو ہم نے　　رہینِ بادہ و مینا نہ پایا
مقابل اس کے جوڑے کے صبا نے　　ختن میں مشک کا نافا نہ پایا
دماغ و دل کو اپنے میں نے صد شکر　　مریضِ دعویِٔ بیجا نہ پایا

کھلی جس کو حقیقت عیش، ابھی
حباب آسا پتا اس کا نہ پایا

(۹)[2]

اُس کو کہتے ہیں غلط ماہِ مبیں کا ٹکڑا　　ماہ خود آپ ہے ایک اُس کی جبیں کا ٹکڑا
کیا فرعون نے دعویِٔ خدائی دیکھو　　لگ گیا ہاتھ جو ایک اُس کو زمیں کا ٹکڑا
جو سخا پیشہ ہیں وہ بانٹ کے کھاتے ہیں سنا　　ان کو ملتا ہے اگر نانِ جویں کا ٹکڑا
زیادہ مقسوم سے اک جَو کا بھی ملنا معلوم　　سب کو ملتا ہے لکھا عرش بریں کا ٹکڑا
اس میں ہر شعر تھا اے ہمنفسو درد کی پوٹ　　ایک کل لائے تھے دیوانِ حزیں کا ٹکڑا
شیخ رکھتا نہیں کچھ حلت و حرمت پہ نظر　　وہ تو چٹ کرتا ہے مل جائے کہیں کا ٹکڑا
اس گئے گذرے زمانے میں بھی یہ گھر وہ ہے　　سب دیا کھاتے ہیں اب تک بھی یہیں کا ٹکڑا

۱۔ س میں "محبت میں تری" سے مقطع تک کے ۷ اشعار نہیں، ل سے اضافہ کیے گئے۔

۲۔ یہ غزل "س" میں شامل نہیں۔ ل سے اضافہ ہوئی۔

بوظفر نام ہے اُس زینتِ اورنگ کا آج پھیلتا سب میں ہے جس تخت نشیں کا ٹکڑا

عیش آباد رکھے خالقِ اکبر اُس کو
کیونکہ ہے وہ دلِ تیمر[1] کے نگیں کا ٹکڑا

(۱۰)[2]

ہم نے دلِ پرسوز کو کیا بر سے نکالا پرکالۂ آتش تھا کہ مجمر سے نکالا
بھالا سا پڑا دل پہ مرے سُرمے کا اس نے دنبالہ جوں ہی چشمِ فسوں گر سے نکالا
مژگاں کو دکھا کون تھا شب بزم میں جس نے خونِ رگِ جاں کو مرے نشتر سے نکالا
انصاف سے گر دیکھو تو ہر اشک کا قطرہ بہتر صدفِ چشم نے گوہر سے نکالا
دل نے طپشِ عشق میں آنکھوں کی بدولت خس خانے کا کام اس مژۂ تر سے نکالا
دل کرتا ہے وحشت سے طلب رخصتِ صحرا پھر عشق نے جھگڑا یہ نئے سر سے نکالا
ہم نے تو سدا شمع صفت سر ہی کٹایا جو آہ کا شعلہ دلِ مضطر سے نکالا
بس چیخ اٹھا حشر بھی دوزخ سے جب اس کو میرے دلِ سوزاں کے برابر سے نکالا

رازِ دلِ سربستہ کا عیش اٹھ گیا پردہ
شب اس نے جو منہ پردے کے اندر سے نکالا

(۱۱)

گر صبا غنچۂ دل بہرِ عنادل کھولا[3] تو یہ کیا بات تھی کیا عقدۂ مشکل کھولا
عقدۂ دل نہ کھلا تجھ سے کسی کا تو جان پھر کبھی لب جو پے دعویٔ باطل کھولا
رہ گئی آئینے کی طرح بھچک ساری بزم اس نے جب بندِ نقاب آ سرِ محفل کھولا
تیرہ ہو جائے گی عُشاق کی صبحِ امید رخ پہ زلفوں کو گر اے حور شمائل کھولا
اے صبا! تجھ سے بگڑ جائے گی مجنوں سے بھی تو نے لیلیٰ کا اگر پردۂ محمل کھولا

۱؎ تیمور کا مخفف ۲؎ غزل نمبر ۱۰ لندن کے نسخے سے شامل کی گئی
۳؎ غزل نمبر ۱۱ کا مطلع لندن کے نسخے سے لیا گیا

ٹکڑے یہاں دل کے ہوئے بزم میں جوں ہی تیرا
عقدۂ بندِ قبا غیر نے قاتل کھولا

سخت جانی سے نہ ہوں اپنی خجل کیوں اس کی
نوکِ مژگاں نے رگِ جاں کو بمشکل کھولا

یک قلم عیشؔ تڑپ جائے گی مجلس ساری[1]
میں نے گر دفترِ حالِ دلِ بسمل کھولا

(۱۲)

جس دن تلک اثر مری آہ و فغاں میں تھا
بتلاؤ کون چین سے سویا جہاں میں تھا

رکھتے تھے ہم بغل میں دلِ گرم وہ کہ بس
پڑ جاتا جس کے نام سے چھالا زباں میں تھا

عاشق کا کبھو پہلے ہی وہاں کام ہو گیا
تیرا ہنوز تیر پہ پری تر و کماں میں تھا

اے برق جس کی لاکھ جہنم تھے جیب میں
ایک اک شرر وہ نالہ[2] آتش فشاں میں تھا

لاکھوں کے دل کو باتوں ہی باتوں میں لے گیا
افسوں کہوں کہ سحر کہوں کیا بیاں میں تھا

آیا تھا کون سیر کو سچ کہیو عندلیب!
جو شورِ الاماں کا پڑا گلستاں میں تھا

کیا پاسِ عشق ہے کہ موئے پر بھی رازِ عشق
سربستہ ووں ہی[3] ہر قلمِ استخواں میں تھا

وہ گرمِ صرفِ ناز تھے وہاں بزمِ غیر میں
سرگرم اس طرف مرا دل صرفِ جاں میں تھا

چومے تھے کس کے ہونٹ کہ جو مرتے دم مزہ
تلخی کے بدلے قند کا میرے دہاں میں تھا

کچھ کیا چکا نسیمِ سحر، برگِ گل پہ کل
جھگڑا جو عندلیب میں اور باغباں میں تھا

ہاں واقعی ہے تم تو نہ تھے، بزمِ غیر میں
افسوں مجھی کو پڑھ کے دیا برگِ پاں میں تھا

بلبل کو باغ میں جو تڑپنے دیا، بھلا
جز خار آس تے اور بھی کچھ آشیاں میں تھا

وہ ناتوان تھا دلِ عاشق کہ جس کا آہ
نالہ کبھی زمین و کبھی آسماں میں تھا

---

[1] بنیادی نسخے میں مقطع کا مصرعِ اولیٰ اسی طرح ہے۔ اس کے برابر میں نیا مصرع یوں لکھا گیا ہے:

عیشؔ جائے گی تڑپ سنتے ہی مجلس ساری

[2] غزل ۱۲ کے یہ تین اشعار عکس میں صاف نہ ہونے کی وجہ سے پڑھے نہیں جاتے لہٰذا لندن سے پورے کیے گئے

[3] (ل) : یوں ہی

شبِ خواب میں معاملہ اس مہ جبیں سے، عیشؔ!
وہ پٹ گیا جو اپنے نہ وہم و گماں میں تھا

(۱۴۳) ل[1]

جلوہ فرما جو چمن میں وہ خود آرا ہوتا — سروِ آزاد غلامِ قدِ رعنا ہوتا
دام گر زلفوں کا مکھڑے پہ بچھایا ہوتا — کون سا طائرِ دل تھا کہ نہ آیا ہوتا
مل کے ہونٹوں پہ مسی پان چبایا ہوتا — رنگِ شام و شفق اس ڈھب سے دکھایا ہوتا
رخِ پُر نور پہ گر زلف کو دیکھا ہوتا — خضر کو چشمۂ حیواں کا نہ سودا ہوتا
عقدۂ زلف، شبِ تار میں گر وا ہوتا — صفحۂ چرخ پہ خورشید نہ پیدا ہوتا
میکشی رات کو غیروں سے رہی تم کو جو واں — کیوں نہ یہاں خونِ جگر صرفِ تمنا ہوتا
یوں نہ آئے وہ تصور میں کہ غیروں سے یہاں — پردۂ چشم حجابِ رخِ زیبا ہوتا
فصدِ سودا زدۂ عشق جو لینی تھی تو آہ — نوکِ مژگاں سے رگِ جاں کو کھولا ہوتا
دیکھا غیروں نے تڑپنا ترے بسمل کا وے — تو اگر سیر کو آتا تو تماشا ہوتا
میری[2] چاہت کو نہ ملنے سے سبھوں نے جانا — تم اگر ملتے تو یہ راز نہ افشا ہوتا
چھو ہی[3] لیتا میں اگر زلفِ معنبر اس کی — مَیل ہاتھوں کی مرے عنبرِ سارا ہوتا
ہم نشیں خاک کہوں تجھ سے مرے سینے میں — کاش کے اس دلِ پُر درد سے کانٹا ہوتا
یہ بھی کچھ خیر ہوئی وہ نہ ہوئے جلوہ فروز — ورنہ چاہت کا ہر اک شخص کو دعویٰ ہوتا
دیکھتا گردشِ چشم اس کی جو زاہد بھی تو بس — گردِ ساغرِ مے اس کا مصلا ہوتا
ہے[4] نصیرؔ آج تو وہ ملکِ سخن کا دریا — ق — پانی بھرتا ہی ترے آگے جو مرزا ہوتا

---

۱ غزل نمبر ۱۴۳ کے ابتدائی ۳ اشعار پڑھے نہیں جاتے، "ل" سے لیے گئے ہیں

۲ اصل: سے؛ ل: نے

۳ اصل: بھی؛ ل: ہی

۴ یہ اور اس کے بعد کا شعر "ل" سے لیے گئے۔

زندہ ہوتے وہ اگر میرؔ علیہ الرحمۃ ‏ اُن کو بھی تیری ہی شاگردی کا دعویٰ ہوتا
اور جو اپنے کو سمجھے ہیں کہ ہم شاعر ہیں ‏ اُن کا مذکور یہٖ ہی اے سخن آرا ہوتا
نام لیتا نہ کوئی شعر و سخن میں اُن کا ‏ تیری شاگردی کا گر اُن پہ نہ چھایا ہوتا
آتا گر آنکھوں میں از راہِ تصور تو ابھی
عیشؔ رنگ کفِ پا یار کا میلا ہوتا

(۱۴)

اشکوں کے عوض خونِ دل آیا، تو ہوا کیا
پانی کو اگر خون بنایا تو ہوا کیا
اے دیدۂ تر خوبی تو یہ تھی کہ وہ آتا
اتنا بھی نہ جب تجھ سے بن آیا، تو ہوا کیا
کس ناز سے کہتے ہیں کہ کیوں ڈھونڈیے دل کو[2]
کیا چیز تھی، اک دل تھا، نہ پایا، تو ہوا کیا
جوں نقشِ قدم اپنی حقیقت تھی جہاں میں
گر تو نے بھی اے چرخ مٹایا، تو ہوا کیا
اُس دل میں تو تاثیر نہ کی کام تھا جس سے
[3] یوں نالوں نے گر عرش ہلایا، تو ہوا کیا
وہ آہ کہ تاثیر نہ تھی جس میں سو اُس سے
اُٹھا یوں ہی جی اپنا جلایا، تو ہوا کیا
جُز بدمزگی اور رہا، اے ہوسِ دل
اب قصۂ غم اس کو سنایا، تو ہوا کیا

---

[1] ل: بھی ہے۔
[2] ک: ڈھونڈیے دل کی۔
[3] اس غزل کے یہ دو اشعار "ل" سے شامل کیے گئے ہیں۔

جو باس پہ اُس زلف کی دل غش ہے، عزیزو!
گر عطر مجھے لا کے سنگھایا، تو ہوا کیا
آخر کو ہے سب ہیچ، گر اسباب جہاں کا
جوں رنگِ حنا ہاتھ میں آیا تو ہوا کیا
چل، تو ہی بتا دے، ترے کوچے میں مرا دل
اے شوخ، اگر کام نہ آیا، تو ہوا کیا
جب دل نہ پھرا لذتِ دنیا سے تو پھر، عیشؔ!
تسبیح کے دانوں کو پھرایا تو ہوا کیا

(۱۵)

شور اب عالم میں ہے اُس شعبدہ پرداز کا
چرخ بھی اک شعبدہ ہے جس سراپا ناز کا
سادہ رُوئی تھی بھی، اور اُس پہ اب آیا ہے خط
دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے اِس آغاز کا
تیر ہووے جس کی مژگاں، اور ہو ابرو کماں
دل نہ ہو قرباں کیوں کر ایسے تیر انداز کا
اُس کے شاہینِ نگہ کو طائرِ دل کے لیے
پنجۂ مژگاں نہیں گویا ہے چنگل باز کا
عیشؔ، مجھ کو بے پر و بالی پہ پرواز ہے
میں نہیں محتاج کچھ بال و پرِ پرواز کا

(۱۶) ٭

آہ جس روز سے چھوٹا ہے وطن غنچے کا
نہ کھلا دل، کیے یہاں لاکھ جتن، غنچے کا
نام لے بھولے سے گر شمعِ لگن غنچے کا
یہ نزاکت ہے کہ جل جائے بدن غنچے کا

٭ غزل نمبر ۱۶ میں اس مطلع کے بعد ۳ اشعار ناقص ہیں جو "ن" سے لیے گئے۔

غش ہوئی بلبل شیدا و صبا لوٹ گئی — دیکھ کر باغ میں بے ساختہ پن، غنچے کا
غسل بلبل کو دیا چاہیے آبِ گُل سے — اور لازم ہے کہ دیں اس کو کفن غنچے کا
دیکھنا چاہیے لیلیٰ کو بچشمِ مجنوں — پوچھنا چاہیے بلبل سے چھبن غنچے کا
آمدِ فصلِ بہاری کی خبر باغ میں ہے — مدح خواں کیونکہ نہ ہو مرغِ چمن غنچے کا
بُو کو جو پردۂ ناقہ میں چھپا رکھتا ہے — کیا مقلّد ہے کہیں مشکِ ختن غنچے کا
بخدا اگر دہن یار کی ہنسی بولے — منہ بگڑ جائے ابھی قبلۂ من، غنچے کا

عیشؔ، پوچھے تو کوئی بادِ صبا سے اتنا
کہ کبھی تونے بھی دیکھا ہے دہن غنچے کا

(۱۷)

خونِ دل آ صدفِ دیدہ میں وہ آب بنا — کہ جو مژگاں پہ چڑھا گوہرِ نایاب بنا
عنصرِ خاک تو ہے سردی، یہ حیرت ہے کہ وہ — کون سی خاک تھی جس سے دلِ بیتاب بنا
چارہ گر مرہمِ کافور سے کیا ہوتا ہے — زخمِ دل ہے کوئی اس کے لیے تیزاب بنا
کر وضو خونِ جگر سے پئے تحصیلِ مراد — اور خمِ ابروے دلدار کو محراب بنا
غمِ فرقت میں تھی ایک آہ سو وہ برق ہوئی — اور اک دل تھا سو وہ معدنِ سیماب بنا
ہے دعا عاشقِ مہجور کی فرقت میں یہی — اُس کے ملنے کے خدایا کہیں اسباب بنا
دعویٰ اس شکل پہ اُس چہرۂ پرنور سے واہ — پہلے صورت تو کہو اپنی کہ مہتاب بنا
کان میں اپنے پہن کر کہو بالا دکھلا — بحرِ خوبی میں تو اس طرح سے گرداب بنا
توڑ سکتا ہے تو بس نفس کو دے اپنے شکست — اور بنانا ہے تو قصرِ دلِ احباب بنا

واہ کس چشمِ سیہ مست کا کشتہ ہوں کہ عیشؔ!
خاک سے بھی میری جو جام مے ناب بنا

۱؎ اصل میں شعر کا دوسرا مصرع اڑا ہوا ہے، یہ لندن کے نسخے سے پورا کر لیا گیا۔

۲؎ یہ شعر بھی نامکمل ہے لندن کے نسخے سے پورا کیا گیا۔

(۱۸)

گر دلِ بیتاب سے نالہ کوئی سر ہو گیا
دیکھ لیں گے سب کہ وہ کس طرح مضطر ہو گیا

ہاں خجل لب سے ترے یاقوتِ احمر ہو گیا
اور دانتوں سے ترے شرمندہ گوہر ہو گیا

دل مرا جو وقفِ مژگانِ ستم گر ہو گیا
رونگٹا ہر اک بدن پر میرے نشتر ہو گیا

کچھ عجب تاثیر ہے کوے بتاں کی کیا کہوں
جو گیا اُن کی گلی میں اُن کا نوکر ہو گیا

بس سلام اپنا، وہاں بھی داد اپنی مل چکی
اُس کا جانب دار خود محشر کا داور ہو گیا

کیا کہوں یوں ہی ارادہ قتل کا اس نے کیا
تیغ ابرو بن گئی، مژگان کا خنجر ہو گیا

کس[1] نے شب دیکھا اُسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
عمر کا کس کی یہ پیمانہ برابر ہو گیا

بعد[2] بوسے کے سنا دشنام دنیا یار کا
تلخ کاموں کے لیے قندِ مکرر ہو گیا

اے[3] صبا ڈھیلا ہوا یہ پیچ کس کی زلف کا
جو زمیں سے آسماں سارا معطّر ہو گیا

دل[4] پہ رکھ کر ہاتھ بس سارے بھڑک کر رہ گئے
جلوہ فرما بزم میں جب وہ فسوں گر ہو گیا

عیش[5] اعجاز آتشِ عشقِ بتاں کا دیکھنا
دل مرا شیشہ تھا یا شیشہ سے پتھر ہو گیا

(۱۹)

ربط معشوقوں سے، اے دل، نہیں آساں کرنا
چاہیے پہلے وہاں جان کو قرباں کرنا

دھجیاں دامنِ صحرا کی اڑا دستِ جنوں
کیا بڑا کام ہے چاک اپنا گریباں کرنا

---

[1] ل: جو نہیں

[2] اصل میں اس شعر کا مصرع اولیٰ اڑا ہوا ہے جو ل سے پورا کیا گیا۔

[3] ایضاً

[4] اصل میں یہ شعر مٹ گئے ہیں جو ل سے پورے کیے گئے

[5] پہلے مصرع تھا: آتشِ عشقِ بتاں کا دیکھنا اعجاز عیش

اے فلک چوک ہوئی تجھ سے تو یہ چوک ہوئی
چاہیے تھا مرے زخموں کو نمکداں کرنا

میرا دل رہنے دے، اے صید فگن، مان کہا
ایک اس کو بھی کسی تیر کا پیکاں کرنا

وہ ہیں آفت کہیں کر بیٹھے لگاوٹ اُن سے[1]
کام ایسا نہ کہیں اے دلِ ناداں، کرنا

روح کھنچتی ہے پڑی، کسی نے سکھایا ہے تجھے
نالہ اس درد سے اے بلبلِ نالاں، کرنا

تیری بیداد کو اے چرخ لگے گا بٹا
کہیں پورا کسی عاشق کا نہ ارماں کرنا

بے ادب تڑپے ہے کوئی دمِ بسمل یوں[2] ہی
دیکھ قاتل کا نہ تر خون میں داماں کرنا

تجھ سے ڈر جاؤں میں اُن آبلہ پاؤں میں نہیں
چھیڑ کچھ[3] سوچ کے، اے خارِ بیاباں، کرنا

کس کو آتا ہے، فلک، جز صدفِ چشم بتا
خون کو آب، آب کو یوں گوہرِ غلطاں کرنا

جل نہ جاویں جگر و جان تری آہوں سے
پاسِ ہمسایہ بھی کچھ، اے دلِ سوزاں، کرنا

---

[1] ل: اس سے

[2] ک: "یوں بھی"۔ ل: کیوں

[3] اصل میں دوسرا مصرع اڑا ہوا ہے، 'ل' سے مکمل کیا گیا۔

چشمِ قاتل سے رگِ جاں یہی کہتی ہے
اور بھی تیز ذرا نشترِ مژگاں کرنا

دیکھنا بوے غمِ یار نہ نکلے دل سے
نکہتِ گل کی طرح غنچے میں پنہاں کرنا

ابرِ تر کو کہو چل، بھاگ، مرے دیدۂ تر
پھر نئے سر سے بپا چاہے ہیں طوفاں کرنا

دلِ سوزاں کی مرے آگ بجھی جاتی ہے
ایک ادھر بھی جھپک، اے دامنِ مژگاں، کرنا

عیشؔ، تو زلف کا کرتا ہے تصوّر دل میں
دیکھ جمعیتِ دل کو نہ پریشاں کرنا

(۲۰)

جب تلک مجھ کو خیالِ مژۂ یار رہا
دل مرا مورِدِ صد سرزنشِ خار رہا

تو تو وہاں بزم میں ہم صحبتِ اغیار رہا
سر پٹکتا ترا عاشق پسِ دیوار رہا

میں تو کہتا تھا وہ آویں گے، وہ کہتا تھا نہیں
مجھ میں اور دل میں یہی رات کو تکرار رہا

ایک مانی نہ شبِ وصل میں تا صبح اونھیں
جو کہا میں نے اسی بات کا انکار رہا

اے فلک میکدۂ دہر میں کہہ، میرے سوا
کون شورابہ کشِ منّتِ اغیار رہا

کعبہ و دیر کے جھگڑے سے ہے کیا کام اُسے
سجدہ گہ جس کا کہ نقشِ قدمِ یار رہا

یادِ کیفیتِ چشمانِ سیہ مست میں یہاں
دل مرا غیرتِ صد خانۂ خمار رہا

رنگ اک عشق کا یہ بھی ہے کہ یوسف سا عزیز
بے گنہ جرمِ زلیخا میں گرفتار رہا

۱؎ ل: ناصح

۲؎ اس شعر کے ابتدائی چند الفاظ اڑ گئے ہیں یہ لندن کے نسخے سے پورے کر دیے گئے۔

ٹیڑھے کیوں ہوتے ہیں ابرو کہ تری ساری عمر　　دل مرا جھیلتا تلوار پہ تلوار رہا
تیرے تر بارہ ہیں اے شوخ نگہ کا تیری　　جو رہا تیر سو وہ دل کے مرے پار رہا
کیا کہوں تجھ سے میں اے راحتِ جاں تیرے بغیر　　مضطرب سینے میں کیا کیا نہ دلِ زار رہا
ہوا معلوم نہ ہنگامۂ محشر مجھے، کیوں　　دل مرا محوِ تجلّیِ رخِ یار رہا
عیشؔ اس چرخ کو کیا کو ہے یہ روز نیا
دل کو دیتا مرے آزار پہ آزار رہا

(۲۱)

سنتے ہی حیرت زدہ سارا زمانہ ہو گیا　　تیرے دیوانے کا مرنا وہ فسانا ہو گیا
تیری فرقت میں سُنا اے سرو بستانِ جمال[۲]　　طائرِ غم کے لیے دل آشیانا ہو گیا
اپنے تو عاشق کے مرنے کی حقیقت کچھ نہ پوچھ　　تو نے منہ موڑا اُدھر، اس کو بہانا ہو گیا
آپ ہم لوٹا کیے ہیں آہ موزوں جب کبھی[۳]　　اضطرابِ دل سے شعرِ عاشقانا ہو گیا
ناصحا تو بھی بجا کہتا ہے، پر انصاف کر　　کیا کرے وہ آہ جس کا دل دِوانا ہو گیا
اس کو کیا چاہا کہ اس کے چاہتے[۴] ہی یک قلم　　دشمنِ جاں اپنا، بیگانہ یگانا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے[۵] اپنے عیشؔ یہاں
ایک دم میں اور ہی کچھ کارخانہ ہو گیا

(۲۲)

جلوہ فرما ہو اگر شب کو وہ جاناں اپنا　　منہ نہ دکھلائے فلک پر مہِ تاباں ہو گیا
گل دکھاتے ہیں اُدھر چاکِ گریباں اپنا　　رو نا روتی ہے[۶] اِدھر بلبلِ نالاں اپنا

۱۔ ل: ہو　　۲۔ اصل: خیال؛ ل: جمال
۳۔ ل: کبھے
۴۔ ک: کو
۵۔ ک: سے
۶۔ ک: رونا روتے ہیں

کاوشِ دستِ جنون عشق میں تیرے ہاتھوں　　چاک رہتا ہے سدا جیب و گریباں اپنا
ابرِ نیساں کی ہو اک پل میں ابھی ہستی گم　　گوہرافشاں ہو اگر دیدۂ گریاں اپنا
فلکِ پیر کے دیوے گا دھوئیں دم میں بکھیر　　آیا گر لب پہ کوئی نالۂ سوزاں اپنا
قیس کہتا تھا کہ ننگے کھلے رہنے کا مرے　　کیوں فسانہ ہے ابھی گھر ہے بیاباں اپنا
لے کے آئینے سے تا نرگس و مہتاب ہر ایک　　دیکھ حیران ہوا دیدۂ حیراں اپنا
عیشؔ، گر عاشقِ شیدا کی پریشانی کو
زلف سن لے نہ رکھے نام پریشاں اپنا

(۲۳)

یہ ممکن ہے جو چھڑ کو آب ٹھنڈا　ق　تو ہو بالفعل کچھ سیماب ٹھنڈا
مگر چھینٹوں سے تیرے اے پری رو　　نہ ہوگا یہ دلِ بے تاب ٹھنڈا
مے گلگوں نے پھونکی آگ دونی　　یہ کیسا تھا مزاجِ آب ٹھنڈا
جو دیکھا حال عاشق کا ترے اور　　تو دم بھرنے لگے احباب ٹھنڈا
تڑپنے کی نہیں سینے میں آواز　　ہوا شاید دلِ بیتاب ٹھنڈا
لکھا اس مہر وش کو خط میں مہرو　　وہ، وہ گرم اور یہ القاب ٹھنڈا
جو دیکھے اس کے مکھڑے کو تو ہو جائے　　چراغِ ماہِ عالم تاب ٹھنڈا
پڑی اشکوں سے زخمِ دل میں ٹھنڈک　　نیا نسخہ ہے یہ تیزاب ٹھنڈا
بڑھی اس لب کے بوسے سے تپِ دل　　کہاں ہے شربتِ عناب ٹھنڈا
نہ ٹھہرے لختِ دل مژگاں پہ کیوں عیشؔ!
مکاں ہے یہ لبِ تالاب ٹھنڈا

(۲۴)

تو نے چاہا ہے دلا، عاشقِ جاناں ہونا　　دیکھنا دیدہ و دانستہ نہ ناداں ہونا

ل۔ک: کو

جگرِ خستہ سے کیوں سینے میں ضد باندھی ہے[1] ۔۔۔ دل تو ہی چل ہدفِ ناوکِ مژگاں ہونا
ضبط اے نالہ، دلِ عرصۂ گردوں کم ہے ۔۔۔ ایسی باتوں کے لیے چاہیے میداں ہونا
جمع جب ہوتے ہیں مژگاں پہ جگر کے ٹکڑے ۔۔۔ یاد آتا ہے کسی کا مجھے مہماں ہونا
دل سے اٹھتا ہے دھواں آہ کسی کا جس وقت ۔۔۔ یاد آتا ہے وہ زیبِ لب و دنداں ہونا
بازوے یار تو نازک ہے دمِ ذبح ذرا ۔۔۔ تو کہیں کُند نہ اے خنجرِ برّاں، ہونا
ابروے یار نے تاکا ہے، خبردار اے دل! ۔۔۔ تیر پر ہر مژۂ یار کے قرباں ہونا
زخمِ دل سے مرے پوچھے کوئی اے غنچہ دہن! ۔۔۔ تیرے اس میبِ زنخداں کا نمکداں ہونا

عیشؔ یہ کس نے بتایا ہے غمِ یار کو یوں
دلِ عاشق سے بتا دست و گریباں ہونا

(۲۵)

خونِ دل یہاں وقفِ مژگاں ہی رہا ۔۔۔ غم ترا دست و گریباں ہی رہا
قتل ہو کر بھی دلِ شیدا مرا ۔۔۔ تشنہ کامِ آبِ پیکاں ہی رہا
کام بھی یہاں ہو چکا، وہاں چارہ گر ۔۔۔ درپے تدبیرِ درماں ہی رہا
کاوشِ دستِ جنوں کو نت یہاں ۔۔۔ شغل چاک جیب و داماں ہی رہا
وعدے غیروں سے وفا ہوتے رہے ۔۔۔ ایک ہم سے عہد و پیماں ہی رہا
یاد میں اس چشمِ فتاں کی سدا ۔۔۔ دل چراگاہِ غزالاں ہی رہا

چیونٹی کو بھی سنا اے عیشؔ یہاں
دعویٔ ملکِ سلیماں ہی رہا

(۲۶)

یہ کہہ دو ابر سے گر میں کبھی رونے پہ آؤں گا
تو ہر نوکِ مژہ سے خون کے دریا بہاؤں گا

---

[1] لفظ "ہے"، کتابت سے رہ گیا ہے
[2] ل: ہاں

یہی اس دل کے ہاتھوں سے اگر آرام پاؤں گا
تو اے ہمدم! میں اس جینے ہی سے بس ہاتھ اٹھاؤں گا

خدا کے واسطے دیکھو تو! یہ کیا کج ادائی ہے
سوالِ بوسہ پر کہتے ہیں میں سیدھی[1] سناؤں گا

ابھی اُس دن کے لالے ہیں، خدا وہ دن تو دکھلائے
جو وہ آئیں تو میں تلووں تلے آنکھیں بچھاؤں گا

سنا او وہ فتنۂ جاں ہوں، مرکے بھی نالوں کی سوزش سے
قیامت خفتگانِ خاک کے میں سر پہ لاؤں گا

میں ہوں گو سخت جاں لیکن بوقتِ ذبح اے ہمدم!
یہ ممکن ہے کہ میں، اور بازوے نازک دکھاؤں گا

فلک پھر ٹیڑھ کی لینے لگا ہے، ان دنوں ہم سے
میں اس کجرو کو پھر ایک آدھ دن سیدھا بناؤں گا

نصیحت ہم کو فرماتے جو ہو اے حضرتِ ناصح!
یقیں ہے تم کو، میں عشقِ بتاں سے باز آؤں گا؟

ابھی کہنا فضولی ہے جو زلفِ یار ہاتھ آئے
تو بس تجھ کو مزہ میں اے شبِ ہجراں چکھاؤں گا

یہی ٹھانی ہے دل میں، عیشؔ، قسمت آزمانے کو
جو ہونی ہو، سو ہو، میں کوچۂ قاتل میں جاؤں گا

(۲۷)

مرا سا رونا تجھے ابرِ تر نہیں آتا ۔۔۔ سرشک میں تری لختِ جگر نہیں آتا
ہزار وقف کیے جان و دل بھی آہ مگر ۔۔۔ مری طرف وہ کبھی مفت بر نہیں آتا[2]

---

[1] ل: سوالِ بوسہ پر کہتے ہیں، سیدھی ہی سناؤں گا۔

[2] اصل میں دوسرا مصرع اُڑ گیا ہے۔ ل سے پورا کیا گیا۔

جبھی تلک ہیں یہ ناصح نصیحتیں تیری — کہ بزم میں وہ بتِ فتنہ گر نہیں آتا
جواب خط کی ہو امید کیا، وہ وہ جا ہے — جہاں سے پھر کے کوئی نامہ بر نہیں آتا
جو ایک دم وہ سرکتا ہے میرے پہلو سے — تو دم میں دم مرا دو دو پہر نہیں آتا
جو بوند آنسو کی نکلے ہے میری آنکھوں سے — صدف سے ایسا تو باہر گہر نہیں آتا
ہماری آہِ شرر بار سے تجھے، اے برق! — یہ ہم بھی دیکھیں کہ کیوں کر حذر نہیں آتا

اے عیش کام مرے سب خدا کے فضل پہ ہیں[1]
میں بے ہنر ہوں، مجھے کچھ ہنر نہیں آتا

(۲۸)

سینے سے تیرِ یار کا پیکاں نکل گیا — افسوس گھر میں آن کے مہماں نکل گیا
حیراں ہوں میں بتا تو ہوا جس پہ تو خفا — کیا ایسا میرے منھ سے مری جاں نکل گیا
کچھ چاشنیِ عشق سے واقف تھا قیس سو — دیوانہ ہوکے سوئے بیاباں نکل گیا
اشکوں کے ساتھ، سینے سے، لے اب تو رحم کر — خوں ہو کے دل بھی دیدۂ گریاں نکل گیا
تیرِ نگاہِ یار کا کیا ہوگا توڑ جب — سینے کے پار یار کا پیکاں نکل گیا
بخشش کو اس کی دیکھ کے سب دل سے خوفِ حشر — مژدہ ہو اے ندامتِ عصیاں نکل گیا
وہ چھوٹتا ہے قید سے ہستی کی، جو کوئی — ہو بوئے گل کی طرح سے عریاں نکل گیا

اے عیش جائے غور ہے شکوہ ہو اُس کا کیا[2]
انسانیت سے اپنی جو انساں نکل گیا

---

[1] مصرع اولیٰ پہلے یوں تھا:
خدا کے فضل پہ ہیں عیش سارے کام مرے

[2] ک: یہ عیش جائے غور ہے

(۲۹)

حالِ دل اس شوخ کو جس دن سنایا جائے گا
دیکھنا غیروں کا دل کیا کیا جلایا جائے گا

گر یہی ہیں ڈھنگ اس دل کے تو آخر دیکھنا
آہ اس دل ہی سے ہاتھ اک دن اٹھایا جائے گا

ٹھن گئی ہے اب یہی دل میں نہ آویں[۱] گے کبھی
کوچۂ جاناں تلک گر ہم سے جایا جائے گا

آچکا ہے یہ حدیثِ پاک میں اے بے خبر
گر کسی پر تو ہنسا، تو بھی ہنسایا جائے گا

جو جلائے[۲] گا دلِ عشاق پروانے کی طرح
شمع کی مانند ہاں وہ بھی جلایا جائے گا

نیک و بد اپنا حوالۂ عیش، ہاں ایسے کے ہے
جو ستائے گا ہمیں، وہ بھی ستایا جائے گا

(۳۰)

یوں چرخ سے حاصل کبھی کچھ کام نہ ہوگا
جب تک کہ کوئی نالہ سرانجام نہ ہوگا

اس چشم سیہ مست کا جو ہووے گا سرشار
دل اس کا رہینِ ہوسِ جام نہ ہوگا

ہو گئی مے گلرنگ مجھے زہرِ ہلاہل
گر بزم میں وہ ساقیِ گلفام نہ ہوگا

ناصح، تو ہی انصاف سے کہہ عشق بتاں میں
بے چین تو ہونگے اگر آرام نہ[۳] ہوگا

فرہاد کی تربت سے یہی آتی تھی آواز
مجھ سا تو جہاں میں کوئی ناکام نہ ہوگا

وہ لاکھ خفا ہوویں[۴] مگر اپنی طرف سے
موقوف کبھی نامہ و پیغام نہ ہوگا

پژمردہ جو ہونے لگا دم بادِ صبا سے
وا غنچۂ دل صبح سے تا شام نہ ہوگا

ملنے کا نہیں یہ دلِ ناکام حلاوت
جب تک شکرِ[۵] ہر بوسہ بدشنام نہ ہوگا

---

۱ ل: ہم

۲ ک: جلا ہوگا

۳ س میں اس کے بعد کا ایک ورق ساقط ہے ل سے تکمیل کی گئی۔

۴ ک: ہوئیں

۵ ک: جب تک ترے ہر بوسے پہ دشنام نہ ہوگا

اے چارہ گر، یہ مرضِ عشقِ بتاں ہے ق باز آؤ، علاجِ دل ناکام نہ ہوگا
تم صرف عبث کرتے ہو ہمت اسے جز وصل آویں کے مسیحا[1] بھی تو آرام نہ ہوگا

یہاں عیشؔ جو آزاد منش ہیں انھیں وہاں بھی
وارستہ مزاجی کے سوا کام نہ ہوگا

(۳۱) [2]

جلوہ دکھلائے جو وہ شمع شبستاں اپنا اڑ کے پروانہ بنے یہ دلِ سوزاں اپنا
گر ہدف ہم کو کرے ناوکِ مژگاں اپنا ہم بھی موجود ہیں دل کرنے کو قرباں اپنا
فتنہ گر جوش میں ہے خونِ رگِ جاں اپنا تیز کر تو بھی ذرا نشترِ مژگاں اپنا
وا کرے باغ میں گر وہ لبِ خنداں اپنا گل کرے دیکھتے ہی چاک گریباں اپنا
دیکھنی ہو اُسے گر سیرِ چراغاں منظور خونِ دل جلوہ نما ہے سرِ مژگاں اپنا
آفت جان ہے معشوقوں کی الفت، ہے ہے یہ سمجھتا نہیں دیکھو دلِ ناداں اپنا
یہاں ہر اک اشک کے قطرے میں ہے طوفاں بھرا حضرتِ نوح لیے پھرتے ہیں طوفاں اپنا
مرضِ عشق سے کوئی بھی سنا ہے بچتے عبث اے چارہ گرو، کرتے ہو درماں اپنا
عشق میں چھوڑ دیا تاب و تواں نے، سچ ہے کب بُرے وقت میں ہوتا ہے کوئی ہاں اپنا
بلبلیں کہتی تھیں رو رو کے، بس، ظلم نہ کر باغباں رہنے دے تہ کر کے گلستاں اپنا
گر کسی پر نہیں عاشق، تو عدم سے بلبل! گل کیے آتے ہیں کیوں چاک گریباں اپنا
گر دکھاویں گے وہ اپنے لبِ میگوں یوں ہی لے کے رہ جائے گا منہ لعلِ بدخشاں اپنا
قیس سر دفترِ عشاق جسے کہتے ہیں وہ بھی ناکام تھا اک طفلِ دبستاں اپنا
دیکھ کر چاک گریباں کو مرے ڈر ہے کہیں بخیہ گر چاک نہ کر ڈالے گریباں اپنا

---

[1] ک : آوے گا مسیحا

[2] ورق ساقط ہونے کے باعث یہ غزل بنیادی نسخے میں نہیں ملتی، لندن کے نسخے سے نقل کی گئی ہے۔
"ک" سے مقابلہ کیا گیا

رشکِ صد زہد ہو گر بخش دے عصیاں اپنا
اپنے الطاف و عنایت سے، خداوندِ کریم

آسماں کیا ہے جسے کیجیے نمک داں اپنا
شور ہے ہر لبِ زخمِ جگرِ عاشق سے

سعیِ غمگیں سے فراہم ہوا دیوان، ورنہ
تھا پڑا یوں ہی کلامِ عیشؔ پریشاں اپنا

(۳۲)

اب کہنا ہے لاحاصل اُس وقت مزا ہوتا
وہ ہوتے اکیلے اور یہ بے سر و پا ہوتا

گر بزم میں بے پردہ وہ جلوہ نما ہوتا
پہلے ہی قیامت سے اک حشر بپا ہوتا

جھنٹے تو نہ پڑتے تھے، کچھ شان میں اے ظالم!
کیا حال ہے کہ تیرا اتنا تو کہا ہوتا

دن دیکھنے کا ہے کو یہ ہم فلک کج رو
گر نالۂ دل اپنا کم بخت رسا ہوتا

جو وعدہ وفا کرنا منظور نہ تھا، اچھا
جھوٹا ہی کبھی تم نے وعدہ تو کیا ہوتا

اس میں ہی رہا پردہ، بے پردہ نہ وہ آئے
بے پردہ وہ گر آتے، کیا جانیے کیا ہوتا

کیا جانیے جب کیا تو عالم میں ستم ڈھاتی
گر بادِ صبا تجھ سے وا بندِ قبا ہوتا

اک خلق کا خوں ہوتا، پامالِ جفا ناحق
وہ پائے نگاریں گر رنگیں بہ حنا ہوتا

گر نکہت زلف اُس کی مجھ شیفتہ تک لاتی
نقصاں ترا کیا اس میں، اے بادِ صبا، ہوتا

ہے عیشؔ تنک ظرفی معشوق سے یہ کہنا
ہم جان فدا کرتے، گر وعدہ وفا ہوتا

(۳۳)

پڑ گیا اِس کو عِشق کا چسکا
دل نہیں اب رہا میرے بس کا

تفتہ جانوں کو عطرِ خس نہ سُنگھا
بَیر ہے کیوں کہ آتش و خس کا

کیا اُٹھا جانِ جاں وہ پہلو سے
دم لگا کھینچنے اے نو، نس نس کا

دل کے لینے میں ہے کمال اُسے
کیا کہیں ٹھگ ہے، وہ بنارس کا

لہ ل : ہے

شیخ صاحب بھی طرفہ ہیں معجون ق نسخہ ڈھونڈے ہیں لوٹ کر کس کا
اس بڑھاپے میں یہ ہوس توبہ کیا ٹھکانا ہے ایسے بڑ بھس کا

قصۂ حسن و عشق میں چپ رہ
کیوں یہ قصہ ہے عیشؔ آپس کا

(۳۴)

نالہ چھوٹا جو دل فگاروں کا مینہہ برسنے لگا شراروں کا
کیا ٹھکانا ہے گلعذاروں کا کھیت ہے ہند و صغداروں کا
جس کو کہتے ہیں عشق عالم میں شغل ہے وہ بھی ایک یاروں کا
دُرِ گوش اس کے دیکھ کر دمِ صبح رنگ فق ہوگیا ہے تاروں کا
حشر کو بھی نہ ہوں گے زندہ یہ[1] ہے پتہ اُس نگہ کے ماروں کا
پوچھ اپنی پھری نگاہوں سے ق حال برگشتہ روزگاروں کا
عشق جو خانماں خراب ہے وہ خاص دشمن ہے جاں نثاروں کا
ایک بلبل کو آپ روتے ہیں خون اس نے کیا ہزاروں کا[2]
تیغِ ابرو و خنجرِ مژگاں کیا ٹھکانا ہے ان کے واروں کا

لیک میں بھی وہ سخت جاں ہوں عیشؔ
پھر گیا منہ بس ان کی دھاروں کا

(۳۵)

آفتِ جاں اُس پری سے دل لگانا ہوگیا
اُس کو کیا چاہا کہ اک دشمن زمانا ہوگیا
پاؤں وہ کب آتے تھے، اب پاؤں میں مہندی لگی
یہ تو اب اُن کے لیے خاصا بہانا ہوگیا

---

[1] س۔ل۔ک۔ تینوں نسخوں میں " وہ " یہ ہے۔ یعنی 'وہ' زائد ہے۔
[2] یہاں سے پھر ایک ورق ساقط ہوگیا ہے۔ل سے تکمیل کی گئی ہے۔

دیکھ لیں گے اُس کے درباں کو بھی اب تو کیا کہیں
گر کسی تقریب اُس کوچے میں جانا ہو گیا

دل کو پایا ہم نے سینہ میں تڑپتے لوٹتے
گوش زد جب اپنے شعرِ عاشقانا ہو گیا

کیا کرے گا خلد کو لے کر وہ مبتلا تو سہی
کوچۂ سفّاک میں جس کا ٹھکانا ہو گیا

خرمنِ تاب و تواں کے واسطے، اے ہم نشیں!
غیرتِ صد برق اُس کا مسکرانا ہو گیا

کوہِ غم تیرے مریضِ ہجر نے سر پر دھرا
ناتواں تیرا یہاں تک تو توانا ہو گیا

یاد میں اس زلفِ مشکیں کی شب فرقت میں عیشؔ!
جو گرا آنسو کا قطرہ سنگ دانا ہو گیا

(۳۶) ؎

پھاڑ دامن مرا تو، خارِ بیاباں، اچھا
منع کرتا نہیں میں شوق سے ہاں ہاں اچھا

تیغ ابرو نے کیا جان کو ٹکڑے ٹکڑے
کر ہدف دل کو تو اے ناوکِ مژگاں اچھا

گر پریشانیِ عشاق میں ہو تیرا بھلا
کر پریشاں انھیں اے زلفِ پریشاں اچھا

درد سر لیتے ہو کیوں مول عبث، چارہ گرو!
کہیں ہوتا ہے مریضِ غمِ ہجراں اچھا

ہم تو ہیں خاص رعیت تری اے دشتِ جنوں!
ٹکڑے دامن کے اڑا پھاڑ گریباں اچھا

نہ چکھا دیں مزہ اُس کو تو جب ہی کہنا
ہم کو روکے تو سہی آپ کا درباں اچھا

سیب و خورشید و گہر کہتے ہیں اُس کافر کے
ہم سے دانت اچھے رُخ اچھا ہے زنخداں اچھا

جان و دل یوں ہی سُلگتے رہیں میرے بولے
گر یہ ٹھانی تو چل اے جنبشِ داماں اچھا

؎ یہ غزل بھی لندن کے نسخے سے شامل کی گئی ہے

زخمِ دل کے لیے عشاق کے، یہ چرخ کہیں　　گرچہ کم ظرف ہے لیکن ہے نمک داں اچھا
میں بُرا آپ ہی سو اچھوں کے اچھے لیکن　　ہے وہ اچھا جسے سب کہویں مری جاں اچھا

عیش سب اپنی برائی ہے، نہیں کوئی برا
سب بھلے ہیں یہ اگر آپ ہے انساں اچھا

(۳۷) ؎

گو اثر نہیں رکھتا نالہ و فغاں اپنا　　پر یہ کہہ دو کر رکھے فکر آسماں اپنا
کیا کرے گا ہم چشمی ہم سے خستہ جانوں سے　　منھ تو پہلے بنوا دے مہ جبیں کتاں اپنا
برق کی ہو سٹّی گم، دوزخ الاماں مانگے　　ایک ایک نالہ ہے وہ شرر فشاں اپنا
مجھ کو منع کرتا ہے دل لگی سے کیوں واعظ!　　دل دیا جسے چاہا، دل تھا مہرباں اپنا
ایک جان باقی ہے اس پہ دیکھو کیا گزرے　　دل تو ہو چکا پہلے صرفِ امتحاں اپنا
بے مبالغہ ہے یہ چھکّے (چھوٹ) ہی جاویں　　برق دیکھ لیوے گر یہ دلِ طپاں اپنا
خاک ہو گئے جل کر تو بھی اف نہ کی منھ سے　　اور تاکجا رکھیں سوزِ دل نہاں اپنا

عیش کہہ دو ناصح سے کیوں بکے ہے بےہودہ
سود ہم سمجھتے ہیں عشق میں زیاں اپنا

(۳۸)

رہنے لگا ہے دل کو پھر اک اضطراب سا　　آنے لگا ہے اشکوں میں پھر خونِ ناب سا
صحرا نوردیوں کی نہ کس طرح دھن بندھے　　جب ہو رفیق اس دلِ وحشت مآب سا
ماہیّت اپنے دل کی کہیں خاک، دل کی جا　　سینے میں کچھ پڑا ہے جلا اک کباب سا
ہستی کا حال اپنی بھلا تم سے کیا کہیں　　دنیا میں آکے دیکھ گئے ایک خواب سا

چشمِ فلک کو عیش چکا چوند ہو گئی
بے پردہ ہو گیا جو وہ رخ آفتاب سا

؎ اس غزل کا مطلع بنیادی نسخے میں نہیں، لندن کے نسخے سے لیا گیا۔ ل میں ردیف الف کی یہ آخری غزل ہے۔

(۳۹)

اب اس کو کیا کریں، وہ بے وفا نہیں آتا
ہزار طرح سے کہتے ہیں، آ نہیں آتا

خدا کے واسطے انصاف سے کوئی کہہ دے
سوا و فا کے انھیں اور کیا نہیں آتا

ہے سر سے پاؤں تلک تجھ میں جذب یہ مانا
یہ تجھ کو جذبِ دل اے کہربا، نہیں آتا

بجا ہے فخر کرے عیش جو مرا ناخن
یہ کام اس سے بن اِس کے سوا نہیں آتا

گرا ہیں غنچوں کی کھولیں تو کیا کمال کیا
صبا کو کھولنا بندِ قبا نہیں آتا

(۴۰)

دل مرا صرفِ تمنّا ہو چکا
لو جی لو بس یہ بھی جھگڑا ہو چکا

ہم سے پہلے کہ صبا اس بزم میں
کون آیا اور کیا کیا ہو چکا

دل تو تم دیتے ہو اُس عیّار کو
پھر تمھیں صاحب، یہ پیدا ہو چکا

سعی کیوں کرتے ہو اے چارہ گرو!
یہ مریضِ عشق اچھا ہو چکا

اک قدم وحشت میں اٹھا تھا کہ یہاں
دیکھتے کیا ہیں کہ صحرا ہو چکا

جن کو ہے دعوئِ زُہد و ورع آج
حال ظاہر سب پہ ان کا ہو چکا

میکدے میں پوچھ لو سو بار عیش!
رہنِ مے، اُن کا مصلّے ہو چکا

(۴۱)

کیا جس کو ترک اس سے پھر کام کیا
یہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا

چھٹی ہیں کسی سے بھلا عادتیں
نہ دیویں گے وہ جلوۂ عام کیا

جو رکھتے ہیں اس زلف و رخ کا خیال
وہ کیا جانیں، ہے صبح کیا، شام کیا

ابھی دل لگاتے ہی صدمے ہیں یہ
اس آغاز کا ہوگا انجام کیا

ے ک : گاؤں

جو عاشق ہیں واقف نہیں کفر سے ۔۔۔ نہ آگہ کہ ہے چیز اسلام کیا
کرے گا اُن آنکھوں سے ہم چشمیاں ۔۔۔ حقیقت وہ رکھتا ہے بادام کیا

جو ہیں مست اُس چشمِ میگوں کے، عیش!
نہیں جانتے وہ کہ ہے جام کیا

(۴۲)

سچ تو یوں ہے کہ بڑا چین مری جاں ہوتا ۔۔۔ اگر اس دل کی جگہ تیر کا پیکاں ہوتا
صورتِ یار میں آتا ملک الموت اگر ۔۔۔ تو میری جاں کا لینا بہت آساں ہوتا
جان قربان تھی اس شوخ کماں ابرو پر ۔۔۔ دل نہ کیوں کر ہدفِ ناوکِ مژگاں ہوتا
زخمِ دل کو مرے فی الجملہ تسلّی ہوتی ۔۔۔ کاسۂ چرخ اگر اس کا نمک داں ہوتا
شیخیٔ ابرِ تر اک پل میں ابھی جھڑ جاتی ۔۔۔ گر مقابل یہ مرا دیدۂ گریاں ہوتا
گو میں خود رفتہ تھا پر ہوش وہیں آجاتے ۔۔۔ گر سنگھایا مجھے وہ سیبِ زنخداں ہوتا
قیس و فرہاد کے جھگڑے ہی سنا چھٹ جاتے ۔۔۔ عہد میں اُن کے جو یہ بے سر و ساماں ہوتا
گر مسیحا بھی سنا نبض مداوا آتے ۔۔۔ تو بھی اچھا نہ مریضِ غمِ ہجراں ہوتا
تھا علاج اس کا فقط شربتِ دیدار ترا ۔۔۔ ق ۔۔۔ تجھ کو انکار اگر اس میں مری جاں ہوتا
تو یہ بیمارِ غمِ ہجر بھی وہ ہے کہ یوں ہیںؔ ۔۔۔ جان دیتا یہ نہ منّتِ کشِ درماں ہوتا

دل کی دل ہی میں رہی عیش مزے جب اڑتے
وہ مرے زخمِ جگر پر نمک افشاں ہوتا

(۴۳)

سوا خدا کے نہیں کوئی دستگیر اپنا ۔۔۔ وہی معین ہے اور ہے وہی نصیر اپنا

ھ ک : ہی

اُسی کے نام سے پاتا ہے کامِ جاں لذّت — اُسی کا اسم مبارک ہے دل پذیر اپنا
وہ آپ جیسا شہنشاہ ہے کریم و رحیم — کیا ہے چھانٹ کے ویسا ہی بس وزیر اپنا
ہے اُسی کا اسمِ مبارک محمدِ عربی — وہی شفیع ہے بس روزِ دار و گیر اپنا

جنابِ شاہِ غلام علیؒ ولی اللہ
خدا کے فضل و کرم سے ہے عیشؔ پیر اپنا

(۴۴)

سکھا گیا ہو جب انداز وہ شریر اپنا — نہ کیونکہ دشمنِ جاں ہووے چرخِ پیر اپنا
اِدھر وہ چشمِ فسوں ساز دل کو کھینچے تھی — اُدھر کو کرتی ہے وہ زلف نو اسیر اپنا
فلک سے کہہ دو کہ آ کجروی سے ہاتھ اُٹھا — وگرنہ دیکھ ہے ایک ایک نالہ تیر اپنا
بتوں کے عشق میں لو وہ بھی ہو گیا دشمن — بغل میں رکھتے تھے اک دل جو ہم مشیر اپنا
یہ قصد تھا نہ کہیں گے پر اُس نے جب پوچھا — بیاں ہی کرنا پڑا حال ناگزیر اپنا
اُسے یقیں نہیں اور یاں ہیں دل میں داغ پہ داغ — میں کس طرح اسے سینہ دکھاؤں چیر اپنا
سرشت اپنی ازل سے ہے عشق بازی کی — چھٹے تو کیونکہ چھٹے عشق ہے خمیر اپنا

ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں عیشؔ فقط
کلامِ میرؔ ہے البتہ دل پذیر اپنا

(۴۵)

لختِ دل کو مژۂ دیدۂ تر پر رکھا — مردمِ چشم نے تعظیم کی، سر پر رکھا
کوہِ غم ہم نے تمہارے لیے سر پر رکھا — دھیان پر تم نے نہ کچھ تفتہ جگر پر رکھا
جان سے جائے کوئی لاکھ مگر وہ نہ سنے — اس نے درباں بھی وہ چھانٹ کے در پر رکھا
دیں گے دل اس کو چھپے گا جو نظر میں اپنی — ہم نے موقوف یہ کام اپنی نظر پر رکھا
کیا مزا آیا ہے جرّاح نے جب مشک و نمک — ساتھ مرہم کے مرے زخمِ جگر پر رکھا
دستِ وحشت نے اُدھر دامنِ صحرا پھاڑا — اور اِدھر ہاتھ گریبانِ سحر پر رکھا
جینا مرنا ترے عاشق نے بس اپنا موقوف — تیرے ہی آنے نہ آنے کی خبر پر رکھا

دیکھنا ناچ پڑے گا جو مری آہ نے بھی — کوئی جگہ فلکِ شعبدہ گر پر رکھا
شاخِ گل دیکھ کے شرما گئی ہنگامِ خرام — ہاتھ اس شوخ نے جو اپنی کمر پر رکھا
بلبلیں جل گئیں میں نے پئے نظارۂ گل — ہاتھ دیوارِ چمن کی جو کگر پر رکھا
عشق کا بوجھ جب اے عیشؔ کسی سے نہ اٹھا
تو یہ اللہ نے دل و جانِ بشر پر رکھا

(۴۶)

عشق میں صرفِ تمنّا یہ دلِ شیدا ہوا — ایک جھگڑا تھا سو فیصل یہ بھی لو جھگڑا ہوا
اس دلِ دیوانہ کو پھر زلف کا سودا ہوا — لو مبارک پھر جنوں کا سلسلہ پیدا ہوا
کان پھر شاید رقیبوں نے بھرے ہیں اُن کے کیوں — پھر نظر آتا ہے تیور اُن کا کچھ بدلا ہوا
ہجر میں اس بحرِ خوبی کی نہ پوچھو کیا کہوں — جو گرا مژگاں سے قطرۂ اشک کا دریا ہوا
اس شکر لب نے کیا غیروں کا شیریں کامِ جاں — تلخ کا مانِ محبت کے لیے کڑوا ہوا
یہ صبا خوشبو کہاں سے تجھ میں آئی گر نہیں — پیچ اس کی جعدِ مشکیں کا کوئی ڈھیلا ہوا
کہہ دو وصل لمبی ہو یہاں سے اے شبِ ہجراں یہاں — ہے تصوّر میں کسی کے اپنا دل بہلا ہوا
باغ میں وہ آئینہ رو گر نہیں آیا، تو پھر — باعثِ حیرت ترا کیا نرگسِ شہلا ہوا
گر یہی چالاکیاں دستِ جنوں کی ہیں تو عیشؔ!
یہ بھی سن لینا کہ ٹکڑے دامنِ صحرا ہوا

(۴۷)

قوتِ بازو سے اس کی جب درِ خیبر کھلا
خلق پر اس روز زورِ بازوے حیدر کھلا
شب جو آویزے کا اس کے کان کے گوہر کھلا
رہ گیا گردوں پہ ہر اک دیدۂ اختر کھلا

ا۔ اصل: اس۔ ک سے تصحیح کی گئی
۲۔ ک: لکھوں — ۳۔ پہلے "کیوں" تھا، اسے بدل کر حاشیے میں "کیا" کر دیا

خود بخود چھاتی کے یہاں ٹوٹے ہی جاتے ہیں کواڑ
غیر نے کنڈی ہلائی شاید اس کا در کھلا

سب گنہگاروں کا چھٹکارا ہے گر پہلے مرا
نامۂ اعمال پیشِ داورِ محشر کھلا

عمر بھر تڑپا کیا اور مفت یوں ہی جان دی
درد کچھ تیرا نہ اس پر اے دلِ مضطر کھلا

نرگس و مہتاب و آئینہ نے جو دیکھا اسے
دیدۂ حیراں رہا ہر ایک ہوش شدر کھلا

ایک جنبش نے کیا اس کی جہاں میں قتلِ عام
آج تیغ ابروے قاتل کا یہ جوہر کھلا

شمع پر سوزِ دلِ پروانہ شب کو بزم میں
جب وہ جل بھن کر ہوا کمبخت خاکستر کھلا

میں نے تو پردہ رکھا تھا پر ان آنکھوں کے سبب
رازِ دل یہاں تک ہوا ظاہر کہ تو گھر گھر کھلا

تفتہ جانوں کو نہیں درکار کچھ ہرگز لباس
شمع کا شعلہ ہے، دیکھو، پاؤں سے تا سر کھلا

عقدۂ دل تو نہ کھولا تو نے، تجھ سے گر صبا
غنچۂ گل کا کھلا عقدہ، تو کیا پتھر کھلا

جیتے جی یا موت کی لذت فقیروں پر کھلی!
جس کی بند آنکھیں ہوئیں یا یہ مزا اس پر کھلا

تیرہ بختیانِ ازل ہوں گے پریشاں اور بھی
زلف کے بالوں کو رکھا گر نہ یوں منھ پر کھلا

ے اصل: کونڈی

طالعِ خوابیدہ اپنے وہ ہیں، وہ بھی سو گئے
اے لو اپنی داستانِ غم کا جب دفتر کھلا

ہے ہمیشہ سے کینہ پروری اُس کا شعار
عیشؔ، تم پر آج حالِ چرخِ دوں پرور کھلا

(۴۸)

دشمن عاشق کا ہے سب سے فلکِ پیر سوا
دوست اس کا نہیں کوئی دلِ دلگیر سوا

تشنہ کامانِ محبت کو جہاں میں سیراب
کون کر سکتا ہے آبِ دمِ شمشیر سوا

واسطے عاشقِ شیدا کے جہاں میں کہیے
ہے کوئی دامِ بلا زلفِ گرہ گیر سوا

دشمنوں کی مرے تو میرے جلانے کو وہ آہ
سامنے میرے کیا کرتے ہیں توقیر سوا

کیوں نہ ممنونِ تصوّر ہوں کہ یہاں آٹھ پہر
کچھ نہیں پیشِ نظر یار کی تصویر سوا

تیرے بیمارِ غمِ ہجر کا اے عیسیٰ دم
آج کہتے ہیں کہ حال اور ہے تغیر سوا

ہم نے دیکھا تو عجب چیز ہے تالیفِ قلوب
پس جہاں میں نہیں اس سے کوئی تسخیر سوا

لاکھ فرسودہ کرے ناخنِ تدبیر کوئی
یار، ہوتا نہیں کچھ خاک بھی تقدیر سوا

پاکے صحت تجھے دے ہیں یہ دعا عیشؔ غریب
دیوے اللہ تیرے ہاتھ میں تاثیر سوا

(۴۹)

عاشقوں کو اے فلک، دیوے گا تو آزار کیا
دشمنِ جاں اُن کا تھوڑا ہے دلِ بیمار کیا

رشک آوے کیوں نہ مجھ کو دیکھنا اُس کی طرف
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے روزنِ دیوار کیا

آہ نے تو خیمۂ گردوں کو پھونکا دیکھیں اب
رنگ لاتے ہیں ہمارے دیدۂ خوں بار کیا

مرغِ دل کے واسطے اے ہم صفیرو! کم ہے کیوں
کچھ قضا کے تیر سے تیرِ نگاہِ یار کیا
چل کے میخانے ہی میں اب دل کو بہلاؤ ذرا
عیشؔ یاں بیٹھے ہوئے کرتے ہو تم بیگار کیا

(۵۰)

پروانہ اپنے جلنے پہ کرتا ہے ناز کیا
کچھ کم ہے اس سے شمع کا سوز و گداز کیا
تیرِ مژہ نے تو وہ ستم ڈھائے، دیکھیے
لائے گی آفت اب نگہ مستِ ناز کیا
افشا کیا ہے راز نہ ملنے نے آپ کے
میں نے کیا ہے آپ کا افشائے راز کیا
چکھے ہوئے ہیں یہاں شبِ ہجراں کی چاشنی
ہووے گا اس سے روزِ قیامت دراز کیا
جوہر ہی کا تو سنگ و جواہر میں فرق ہے
گر یہ نہ ہو تو دونوں میں ہو امتیاز کیا
جب تک حضورِ قلب نہ ہووے، نماز میں
زاہد خدا کے واسطے، ہے وہ نماز کیا
حافظ نے سچ کہا ہے کہ یہ کوتہ آستیں
کرتے ہیں دیکھو دستِ تطاول دراز کیا
گیرائی اس کے پنجۂ مژگاں کی کیا کہوں
آگے ہے اس کے چنگلِ شاہین و باز کیا
گھبرا نہ عیشؔ، دیکھ تو پردے سے غیب کے
کرتا ہے آشکار ترا کارساز کیا

(۵۱)

کھینچ جب تیغ وہ ابرو کی اُدھر آ ہی گیا
ہو کے بس میں بھی اِدھر سینہ سپر آ ہی گیا
یہاں نہ آنے کے لیے عذر ہیں سارے ورنہ
اس کو آنا تھا تو وہ غیر کے گھر آ ہی گیا
دل لیا چاہیے ہے اندازِ نظر سے تیرے
اب نظر ہم کو ترا مدِّ نظر آ ہی گیا

جان کا اپنی وہ عالم کہ نہیں قابو میں
دل کا یہ حال کہ آیا یہ جدھر، آ ہی گیا
چرخ نے ٹیڑھ کی لی تھی کہ لب پر میرے
ساتھ ہی نالہ بھی لب پر یز اثر آ ہی گیا
سرِ منصور کو بس دیکھ سرِ دار کہا
خلق کے، نخلِ محبّت میں ثمر آ ہی گیا
عشق میں ظلم یہاں تک ہے کہ ناکردہ گناہ
دل بھی پامالی میں دنبالِ نظر آ ہی گیا
سرکشی شمع نے اُس بزم میں کی تھی دیکھو
اُس کا گلگیر اجی کاٹنے سر آ ہی گیا
زخم تھا دل پہ جو اُس تیغِ نگہ کا آخر
پھیل کر دل سے وہ لوٗ تا بہ جگر آ ہی گیا
ابر بے طرح گھر آیا تھا ڈرا تھا میں تو
جوش پر تجھ کو بھی اے دیدۂ تر آ ہی گیا
آہ کو آپ بھی فرمائیں کچھ! اے حضرت دل!
کیوں بدی پر فلکِ شعبدہ گر آ ہی گیا
ڈھونڈنے والے کو ملتا ہی ہے کیوں وحشت میں
شغل کو ہاتھ گریبانِ سحر آ ہی گیا
ہے وہ سفّاک اگر عیشؔ، تو میں بھی وہ ہوں
نہ ڈرا سامنے ایسے کے، نڈر آ ہی گیا

(۵۲)

کریں گے دیدۂ تر اور کیا ضرر میرا — بہا یا اشکوں میں سب دل مرا جگر میرا
دکھاؤں گا رقمِ شوق کی تمھیں تاثیر — پہنچ گیا کبھی وہاں تک جو نامہ بر میرا

جو گوشں زد ہوا گل کے تو دیکھنا بلبل — کہ گل کھلائے ہے کیا نالۂ سحر میرا
کبھی خیال ہے زلفوں کا اور کبھی رخ کا — ہے یہ ہی شام سے لے شغل تا سحر میرا
نہ پوچھو نظروں ہی نظروں میں کیا کہوں تم سے — اڑا کے لے ہی گیا دل وہ مفت بر میرا
سنایہ اوروں کو جاکر نصیحتیں اپنی — خدا کے واسطے ناصح پھرا نہ سر میرا
ہر اک کو دعوے ہیں اپنے ہنر کے عالم میں — یہاں ہے بے ہنری بس فقط ہنر میرا
اٹھانی پڑتیں یہ باتیں کسی کی کاہے کو
یہ ہوتا کہنے میں اے عیشؔ دل اگر میرا

(۵۳)

تیری الفت میں ہم پہ کیا نہ ہوا — اس پہ بھی ہم کو کچھ گلا نہ ہوا
بوئے زلف اس کی ہم تلک لاتی — تجھ سے اتنا بھی اے صبا نہ ہوا
دل مرا کب مژہ، بتا تو سہی — ہدفِ ناوکِ بلا نہ ہوا!
کون سا دل ہے وہ بتا تو فلک — کہ جو یہاں صرفِ مدعا نہ ہوا
درد کو دل سے ربط ہے اتنا — کہ کبھی اس سے وہ جدا نہ ہوا
اُس نے زخموں پہ کی نمک پاشی — ہم سے حقِ نمک ادا نہ ہوا
آج تک ناخنِ صبا سے کہو — عقدۂ دل کسی کا وا نہ ہوا
شکوۂ غیر کیا کرے کوئی — اپنا جب تجھ سا آشنا نہ ہوا
کیا خدا جانے نخوتیں ہوتیں
عیشؔ صد شکر پارسا نہ ہوا

(۵۴)

عشق میں یہاں جان و دل کو لگ گیا ہے گھن جدا
اور کلیجا آتشِ غم سے رہا ہے بھن جدا
شمع ملتی ہے کفِ افسوس اپنے حال پر
اور سر کو شمع کا شعلہ رہا ہے دھن جدا

کیا لکھوں احوالِ چرخ تفرقہ پرداز کا
یہ وہ ظالم ہے کہ کردے گوشت سے ناخن جدا
جان کو دھندا اُدھر الفت میں بھی کچھ اور ہے
دل اِدھر رکھتا ہے سینے میں اُدھر اور تن جدا
عیش گر غور اس میں تاثیرات اشیا حق ہے کیوں
حق تعالیٰ نے دیا ہر شے کو ہے[1] اک گن جدا

(۵۵)

حال دل کا اُسے جتانا کیا | نہ سنے جو اُسے سنانا کیا
آئے جب آگے ایسے ظالم کے | جورِ گردوں سے منہ چھپانا کیا
ہم سے چلتا ہے ٹیڑھ کی اے لو | ہو گیا ہے فلک دِوانا کیا
سر فروشوں کی ہے یہ عین مراد | کوے قاتل میں جاکے آنا کیا
پوچھتے کیا ہو مسکنِ عاشق | بے گھروں کا اجی ٹھکانا کیا
جان و دل لے کے اب خفا ہے کیوں | ہم نے کہنا ترا نہ مانا کیا
دلِ خود رفتہ کا علاج کرے | کوئی نادان اور دانا کیا

لے کے دل جو کہ دشمنِ جاں ہو
عیش ایسے سے دل لگانا کیا

(۵۶)

دم آکر لبوں پر مری جان ٹھہرا | مگر تو نہ یہاں آکے اک آن ٹھہرا
ڈبویا اک عالم کو رونے نے میرے | یہ رونا نہ ٹھہرا کہ طوفان ٹھہرا
یہ قسمت کی خوبی جو خط اُن کو لکھا | تو نزدیک ان کے بد عنوان ٹھہرا
یہ قدرت خدا کی ہے تو اس کے در کا | جو دشمن تھا اپنا وہ دربان ٹھہرا

---

[1] ک : ہر

میں اس بیوتوقی کا مائل ہوں اپنی — کہ دل دے کے اس بت کو نادان ٹھہرا
کہا اس کو جمعیتِ خاطرِ دل — جو پابندِ زلفِ پریشان ٹھہرا
کمی ہوگی کس چیز کی عیشؔ اس کو
خدا جس کا خود میرِ سامان ٹھہرا

(۵۷)

دلِ صد چاک نہ گر زلف کا شانہ بنتا — تو میں کیوں تیرِ بلاؤں کا نشانا بنتا
کرتے ہم دم میں سنا شورِ قیامت برپا — کسی تقریب گر اس کوچے میں جانا بنتا
ایسا بے چین نہ رہتا کبھی اِس دل کی جگہ — گر مرے سینے میں زنبور کا خانا بنتا
واعظا کہنے ہی کی باتیں ہیں یہ سب تو بھی — دیکھ لیتا اگر اس کو تو دیوانا بنتا
مانگتے وہ تو دل و جاں بھی دیے ہی بنتی — اُن سے ہرگز نہ کیے کوئی بہانا بنتا
دل لگا اُس سے جو عالم کا تھا منظورِ نظر — دشمنِ جاں نہ مرا کیونکہ زمانا بنتا
نزع میں سن کے ترے آنے کی ٹھہرا دم چند — ورنہ میں سوئے عدم کب کا روانا بنتا
دیکھتا اُس قدِ موزوں کو تو قمری کی طرح — سرو سو جاں سے غلامِ قدِ رعنا بنتا
عیشؔ اِس طرح نہ فوارۂ مژگاں چھٹتا
دیدۂ تر نہ اگر اُس کا خزانا بنتا

(۵۸)

کسی بات پہ رنج خدا کی قسم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا
کسی طرح کا رنج و ملال بہم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا

ہوئے یار تو راہیِ ملکِ عدم، یہاں روتے ہیں ان کے فراق میں ہم
کھلے کیونکہ یہ حال کہ حال رقم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا

مرے اُن کے جو دل کو تھا ربط بہم، یہ غلط ہے جو غیر بتاتے ہیں کم
وہی ربط ہے پہلا سا اس میں تو کم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا

ہمیں ضبط کی خو، انھیں ظلم کا ڈھب، گئی عمر تو اپنی اسی میں ہی سب
رہا یہ ہی معاملۂ چارۂ غم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا
کبھی دل کو جگر کا ہے رنج و الم، کبھی دل کا جگر کو ہے صدمۂ غم
رہا یوں ہی جدا غم و رنج و الم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا
کوئی کہتا قدیم زمانے کو ہے، کوئی لے گیا اُس کے حدوث پہ پے
جو تھا حقِ ثبوتِ حدوث و قدم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا
یوں ہی ہم تو ستم کشِ چرخ رہے، اُسی حال میں یار کے ظلم سہے
کبھی عیش، کم آہ یہ ظلم و ستم، نہ اِدھر سے ہوا نہ اُدھر سے ہوا

(۵۹)

زخمِ دل قربان ہو سو جان سے تیرِ یار کا
دیوے اک بوسہ اگر اس کو لبِ سوفار کا
بس دھواں دے گا بکھیر اس چرخِ کج رفتار کا
چل گیا چھرّا کوئی گر آہِ آتش بار کا
میں مریضِ عشق ہوں، مت کر علاج اے چارہ گر!
مبتلا بچتا سنا ہے تو نے اس آزار کا
ناصحا! میں مانتا کہنا ترا، پر کیا کروں
ان دنوں کچھ اور ہے ڈھنگ اس دلِ بیمار کا
دل مرا اُس پر نہ کیوں سو جان سے قربان ہو
اس نے چکھا ہے مزہ تیرِ نگاہِ یار کا
سرد مہریِ فلک سے ہم رہے افسردہ دل
کیا بگاڑ اس میں ہے اس کی گرمیِ بازار کا
اپنے دامن کی طرح وحشت میں کرتا دھجیاں
ہاتھ آجاتا مرے دامن اگر کہسار کا

دل بھلا ایسے ستم گر سے کہو کیوں کر بچے
جنبشِ ابرو سے یوں ہے کام جو تلوار کا
جھولیاں خوشبو کی بھر بھر کے جو لاتی ہے نسیم
پیچ ڈھیلا ہو گیا کس زلفِ عنبر بار کا
جب تو اک بوسہ تھا اب لیویں گے دو بوسے ضرور
کیوں کہ آیا درمیاں میں حرف اب تکرار کا
زخمِ دل پر سودۂ الماس تو میرے چھڑک
رکھ نہ اے جراح پھاہا مرہمِ زنگار کا
عیشؔ کیا جانے کوئی صحرا نوردی کے مزے
آبلوں کے دل سے پوچھو لطف نوکِ خار کا

(۶۰)

ہووے مشہور نہ کیوں عاشقِ بدنام بُرا — عشق کہتے ہیں جسے ہے یہ بہت کام بُرا
دیکھیں انجام ہو کیا اس کا خدا خیر کرے — دامِ الفت میں پھنسا ہے دلِ ناکام بُرا
تو بھی عاشق ہو کسی پر تو کھلے حال تجھے — دل لگا ہوتا ہے حسن اوبتِ خود کام بُرا
ننگ و عار آن کو نہ ہو ملنے سے میرے کیوں کر — سچ ہے کمبخت اِس الفت ہی کا ہے نام بُرا
عیشؔ آغازِ محبت ہی میں تھا دل کو کہا
دیکھ ہوتا ہے بُرے کام کا انجام بُرا

(۶۱)

حضرتِ عشق کی جناب ہے کیا — خانۂ دل کیا خراب ہے کیا
مست جو اس کی چشمِ مست کے ہیں — وہ نہیں جانتے شراب ہے کیا
لے کے دل جو کبھی نہیں دیتا — کہیے اس بات کا جواب ہے کیا

ل ک : کہے

یاد میں اس کی زلفِ پیچاں کے
دیکھنا دل کو اضطراب ہے کیا

شیخ صاحب کو مے کے پینے سے
وہ اگر دے تو اجتناب ہے کیا

آگے اس اپنے نالۂ دل کے
چنگ کیا چیز ہے، رباب ہے کیا

ہے جو یہ جوشش آج قصد ترا
سچ بتا دیدۂ پر آب ہے کیا

بس اُسی کا ظہور ہے سب میں
آتش و باد و خاک و آب ہے کیا

سامنے اپنی بے ثباتی کے
عرصۂ ہستی حباب ہے کیا

قتلِ عاشق جو کرتے ہیں معشوق
اُن کے مذہب میں کچھ ثواب ہے کیا

طالعِ خفتہ کی بدولت عیش!
ہم نہیں جانتے کہ خواب ہے کیا

ب

(۱)

سمجھ تو زیست کو اس عالمِ خراب میں خواب
زیادہ اس سے نہیں زندگی ہے خواب میں خواب

فراقِ یار میں آنکھوں میں ہیں بھرے دریا
بسے تو کیسے بسے دیدۂ پُرآب میں خواب

نہ پوچھو کیا کہوں میں تم سے دل ہی جانے ہے
مزے دکھائے ہے جو عالمِ شباب میں خواب

شبِ فراق بتاں میں نہ جا گیے کیونکر
سنا ہے آتے کسی کو بھی اضطراب میں خواب

عدو کے بخت نہ بیدار کس طرح رہویں
رہے ہے طالعِ عشّاق کی رکاب میں خواب

کہی ہے تو نے غزل جس ردیف و قافیہ میں
کہے تو عیش کوئی اس کے اب جواب میں خواب

ہ ل : کیونکہ

(۲)

سمجھ کے دیکھ تو ناداں کہ ہے یہ نقش برآب — نہیں رہا نہ رہے گا کسی کا عہد شباب
ہے اس کا وعدہ کہ میں دوں گا رزق اے ناداں — نہ کر تو فکر معیشت میں اپنی عمر خراب
ملک نواز ہے وہ اس کے ہاں نہیں کچھ دیر — وہ ایک پل میں مہیا کرے ہے سب اسباب
جہاں کے بحر میں اتنا ابھر ابھر[1] کے نہ چل — سمجھ یہاں تو نمائش کو[2] اپنی مثل حباب

یہاں کے ناز و نعم پر نہ بھول سوچ کہ[3] عیش ہے
ذرا سمجھیت ہو کیوں ہے یہ سب فسانہ و خواب

(۳)

اس بزم میں دریغ نہ تو ہم سے کر شراب — ساقی چل اٹھ کے جام بلوریں میں بھر شراب
یاں میکشوں کے طائر فکر و خیال کو — دے ہے لگا کچھ اور ہی یہ بال و پر شراب
تو محتسب بھی مست اُن آنکھوں کا ہو گیا — اب چین سے اڑائیے ہو کر نڈر شراب
پھر چھوڑ دے تو خط غلامی لکھیں ہیں ہم[4] — پی لیوے ایک دفعہ[5] یہ زاہد اگر شراب
گر خواب میں وہ چشم سیہ مست دیکھ لیں — وہ مستیاں ہیں ان میں کہ مانگے حذر شراب
اس چشم مست یار کی کیا مستیاں کہوں — رندان بادہ کش نہ پئیں عمر بھر شراب

واعظ کہے مضر ہے کہیں[6] عیش پر نہ یوں
سب میں ضرر رہی تو ہے ہے اک بے ضرر شراب

(۴)

ہمیشہ سے روش چرخ کینہ جو ہے خراب — اسی سبب سے ہر اک اہل آرزو ہے خراب

---

[1] ک : ابھر ابھر
[2] اصل : کے
[3] ک : تو
[4] ل : لکھیں گے ہم
[5] اصل : دفع
[6] اصل : کہے

تو دیکھ آئینہ دل میں اپنے اے ناداں
کہ اس جہاں میں پے حرص آپ تو ہے خراب

نہ رہ تلاش میں دنیائے دوں کی سرگرداں
یہ کہہ دیا تجھے کرتی یہ جستجو ہے خراب

غرور و نخوت و پندار ہیں مصاحب بد
یہ جس کے یار ہے اس کی آبرو ہے خراب

گلوں کے مرتی ہے جس رنگ و بو پہ اے بلبل!
وہ ہی تو دیکھے گی دو دن کو رنگ بو ہے خراب

بنی ہے میکدے پہ دور چشم یار میں یہ
پڑے ہیں ٹوٹے ادھر جام اُدھر سبو ہے خراب

ہوئی مغاں کی یہاں تک کساد بازاری
کہ پوچھتا نہیں کوئی وہ چار سو ہے خراب

جو ذی خرد ہیں وہ عیشؔ اس عروس دنیا کو
سمجھتے ہیں کہ یہ مردار زشت رو ہے خراب

(۵)

آ کر پھرا نہ نام کو آنکھوں میں خواب شب
کیا کیا رہا ہے دل کو مرے اضطراب شب

والا کس نے جام مے دیئے غیروں کو ادھر یہاں
چھلکا کیا ہے کاسۂ چشم پر آب شب

مانگا جو ایک بوسہ تو بولے کہ راہ تو
اک عمر میں دیا تو دیا یہ جواب شب

اس رُخ کو دیکھ بحر خجالت میں کچھ نہ پوچھ
شرمندہ ہو کے ڈوب گیا ماہتاب شب

سرگرم ناز دیکھ کے غیروں کے ساتھ اسے
جل بھن کے ہو گیا دل شیدا کباب شب

کل صبح تک تھیں آپ کی آنکھیں جھکی ہوئیں
سچ کہیے کس کے ہاتھ سے پی تھی شراب شب

زلف بتاں کی یاد میں اے عیشؔ کیا کہوں
دل نے مرے اٹھائے ہیں کیا پیچ و تاب شب

نہ رہا ایک یہاں کسی کا روپ — کبھی ہے چھاؤں اور کبھی ہے دھوپ
فلک پیر جس کو کہتے ہیں — یہ بدلتا ہے نت نیا اک روپ
ہندوی بھکیا[1] میں حق کا نام — ہے نرنکار اور جُوتی[2] سروپ
عیش اُس چرخِ شعبدہ گر کا
ایک[3] ہو تو کہوں میں رنگ انوپ

۱۔ بھکیا بمعنی بھاشا : زبان
۲۔ جوتی (جیوتی) : روشنی
۳۔ ک : ایک ہو تو لکھوں میں رنگ انوپ

ت

(۱)

کیا کہیں عالمِ شباب کی بات
معتبر ہوتی کب ہے خواب کی بات

جھڑ گئی شیخی ابر کی، جس دم
چل پڑی دیدۂ پُرآب کی بات

دیکھیے دم اُس کو حضرتِ ناصح!
جانتا جو نہ ہو جناب کی بات

یہ ہے اور آہ اُس کا کوچہ ہے
کیا کہوں اِس دلِ خراب کی بات

لاکھ پردہ کیا مگر نہ چھپی
آہ مجنونِ دل کباب کی بات

رنگ ہے زرد منھ پہ خشکی ہے
منھ سے نکلے ہے پیچ و تاب کی بات

آج کچھ بے قرار سے ہو تم
کہیں چھپتی ہے اضطراب کی بات

ق
چل پڑی بزمِ میکشاں میں جب
نگہِ چشمِ مستِ خواب کی بات

ہو گئے بس نشے ہرن سب کے
نہ رہی خاک کچھ شراب کی بات

سچ کہو کس سے دل لگا[2] ہے عیشؔ
نہیں یاروں سے یہ حجاب کی بات

۱۔ ل: آہ
۲۔ اصل: لگی

(۲)

ہووے نہ الٰہی کوئی بیمارِ محبت
ہے دشمنِ جان و جگر آزارِ محبت

ہم پا گئے، تو لاکھ کرا انکارِ محبت
پیدا ہیں ترے چہرے سے آثارِ محبت

جس بوجھ[۱] سے چکنے فلک و کوہ زمیں سب
انسان نے سر دھر لیا وہ بارِ محبت

ہم تجھ کو کہے دیتے ہیں سن اے دلِ ناداں!
آساں نہیں مشکل ہے بڑا کارِ محبت

پانے کا نہیں وہ تو کبھی غم سے رہائی
جو ہو گیا اک بار گرفتارِ محبت

دنیا میں نہیں رہتا کسی کام کا وہ دل
[۲] جس دل میں کہ اک دفعہ چبھا خارِ محبت

اے عیش جہاں میں ہے ہمیں تفتہ دلوں سے
کچھ تھوڑی بہت گرمیِ بازارِ محبت

(۳)

جو ہیں دھر سے گرفتارِ محبت
اٹھاتے ہیں وہی بارِ محبت

نہ ہو دشمن بھی بیمارِ محبت
برا ہوتا ہے آزارِ محبت

ہمیں ہیں یارِ غمخوارِ محبت
ہمیں ہیں نازبردارِ محبت

کریں وہ سر دھری لاکھ یہاں تو
رہے گا گرم بازارِ محبت

کوئی ترتے سنا ہے آج تک بھی
غریقِ بحرِ ذخارِ محبت

سوائے عاشقِ جانباز کوئی
نہیں آگاہِ اسرارِ محبت

وہ ہیں خمخانۂ دنیا میں سرخوش
جو رہتے ہیں گے سرشارِ محبت

رہے کس طرح وہ آرام سے دل
چبھا جس دل میں ہو خارِ محبت

ترے دیوان میں دیکھے جو ہم نے
بھرے ہیں، عیش! اشعارِ محبت

---

۱ اصل: بوج

۲ ک: انھیں

(۴)

آیا جو میرے، جو خواب میں وہ گلعذار رات
لوٹی ہے میں نے کیا کہوں کیا کیا بہار رات
تم نے سنا، بھی، ڈھایا ہے رندوں نے کیا ستم
لی شیخ جی کی بزم میں پگڑی اُتار رات
فرقت میں اس کی شمع کے شعلے کی طرح سے
کیا کیا رہا ہے سینے میں دل بے قرار رات
اے چرخ شکر بھیج کر ضبط آڑے آگیا
بھرا تھا ورنہ یہ نفسِ شعلہ بار رات
دل فوجِ غم سے ہجر میں اس مہ جبین کے
کیا کیا لڑا کیاں ہے اکیلا گہار رات

ٹ

غم ترا بسکہ رہا ہے دلِ ناداں سے لپٹ
لختِ دل اشک میں آ کر رہے مژگاں سے لپٹ

وحشتِ دل نے نہ دی دستِ جنوں کو فرصت
چھوڑا دامن تو گیا چاکِ گریباں سے لپٹ

ہے ارادہ یہی دل کا دمِ ناوک فگنی
چیر کر سینے کو جائے ترے پیکاں سے لپٹ

ہو گی جمعیتِ خاطر تری برباد ارے
دل کہا مان، نہ اُس زلفِ پریشاں سے لپٹ

ایسا کم ہوتا ہے ہندو کو مسلماں سے ربط
جس طرح زلف رہے ہے رخِ تاباں سے لپٹ

عیش سنتا تھا وہ کس کی، نہ سنی اُس نے مری
بیچ میں آ ہی گیا کاکلِ پیچاں سے لپٹ

ث

کیوں پے چارہ گری پھرتے ہیں احباب عبث
کیوں حرام اپنے پہ کرتے ہیں خور و خواب عبث

وہی ہوگا تری قسمت میں جو لکھا ہے سنا
بے قراری ہے تجھے اے دلِ بے تاب عبث

اس سے کیا ہوتا ہے جراحوں کو سودا ہے
زخم دل پر مرے کیوں رکھتے ہو تیزاب عبث

یہاں رَچے دل میں ہیں اُس ماہ جبیں کے جلوے
جلوے دکھلائے ہے ہم کو شبِ مہتاب عبث

اُس کی بخشش نہیں محتاج سبب کی اے عیشؔ!
اہلِ دنیا کو ہے پابندیِ اسباب عبث

ھ ک : جلوے دکھلاتی ہے

ج

جو دیے ہیں گے مجھے اس فلک پیر نے رنج
نہ دیے ہوئیں گے یہ شمع کو گلگیر نے رنج

پوچھتا بھی نہیں اتنا کوئی افسوس کہ کیوں
بے سبب ہم کو دیے اس بت بے پیر نے رنج

دل پہ جو گزرے ہے دل جانے ہے اب کس سے کہوں
کہ دیے ہیں مجھے کیا کیا مری تقدیر نے رنج

تھا تو ظاہر میں تملّق ہی پہ باطن میں نفاق[۱]
ہیں دیے سب سے سوا اس تری تزویر نے رنج

رنج پہنچیں ہیں مجھے جو وہ جہاں میں سب پر[۲]
کر دیے میرے بیاں نقش تصویر نے رنج

رنج کیا مجھ کو دیا ہے کہ بس اک عالم کو
ہے دیا آہ زمانے کی یہ تغئیر نے رنج

رنج جو میں نے اٹھائے ہیں طپش سے دل کی
وہ دم ذبح اٹھائے نہیں نخچیر نے رنج

کام سب چھوڑ دے اللہ پہ اور چین منا
کیوں دیے ہیں یہ تجھے سب تری تدبیر نے رنج

رنج پر رنج ہوا مجھ کو نیا اور یہ عیش
کہ دیا سب کو مرے نالۂ شبگیر نے رنج

(۲)

جام گل بادۂ عشرت سے جو لبریز ہے آج
چہچہا کرتی ہے بلبل کو نشہ تیز ہے آج

قتل کی کوچۂ جاناں میں ہوا تیز ہے آج
ہر مژہ یار کی صد غیرت چنگیز ہے آج

پھر شگفتہ ہوئے شاید کہ گلوں کے غنچے
نالۂ بلبل شیدا طرب انگیز ہے آج

۱؎ ل: ظاہر میں تو تملّق ہے پہ باطن ہے نفاق ۲؎ رنج پہنچا ہے مجھے یہ کہ جہاں میں سب پر

یار کی زلف کو چھیڑا ہے مقرّر[1] تو نے
تجھ میں اے بادِ صبا بوے دل آویز ہے آج
دم کسی اور کو دینا ارے ہم جانتے ہیں
نگہِ لطف تری مصلحت آمیز ہے آج
بات کی بات میں طے کرتا ہے میدانِ سخن
گرم جولاں یہ مری طبع کا شبدیز ہے آج
کوچۂ زلف میں لاکھوں کے گئے دل مارے
سرزمیں ہند کی کیا عیش، بلاخیز ہے آج

(۳)

خوں بہانے کی ہوس ہے دیدۂ پرخوں کو آج
ہے بجا رنگیں کروں گر اشک کے مضموں کو آج
ہمدمو! اُس سے کسی ڈھب جا کے اتنا تو کہو
لے چلے ہیں لوگ دفنانے کسی مفتوں کو آج
اور تو میں کیا کہوں، شام و شفق جی چھوڑ دیں
گر مسی آلودہ دیکھیں اس لبِ میگوں کو آج
عرضِ گوشِ گل ہوا گر نالۂ بلبل، تو آہ
کیا ملا رنگِ قبول اُس عاشقِ محزوں کو آج
خود بخود لاکھوں کے دل پامال ہو دیں کیوں نہ وہاں
قصدِ جولاں ہے اجی! وہاں یار کے گلگوں کو آج
ذکر کرنا قیس کا لیلیٰ کا ہے دیوانہ پن
پوچھتا ہے کون تیرے[2] سامنے مجنوں کو آج

---

[1] ک: مکرّر
[2] ل: میرے

دل کے لے لینے کی حکمت میں بس اپنے سامنے
طفلِ ابجد خواں سمجھتے ہیں وہ افلاطوں کو آج
تجھ کو چھاتی سے لگا لیں گے، جو ہونی ہو، سو ہو
ماننے کے ہم نہیں ہرگز تری ہاں ہوں کو آج
دل کھنچا جاتا ہے میرا عیشؔ اس آوازے سے
چھیڑتا ہے کون اپنے نالۂ محزوں کو آج

(۴)

کہہ رہے ہیں میکدے میں سب یہی[1] مستانہ آج
جلد اٹھ ساقی، مئے گلگوں سے بھر پیمانہ آج
ہے ہجومِ بلبلِ شیدا جو کوچے میں مرے
کون سا گل رو ہوا ہے اپنا زیبِ خانہ آج
اُس کو جُوڑا مت کہو، باندھی ہیں مشکیں زلف کی
اس کے مکھڑے پر یہ کُھل کھیلی تھیں بے باکانہ آج
خوب پہنچائے کے آغوشِ تصوّر میں اسے
کیا ہی بن آئی یہ دل سے جرأتِ مردانہ آج
باغ میں چہکی تھی وہ گل بے ادب، اس واسطے
بال و پر نوچے، ہوا بلبل پہ یہ جرمانہ آج
سب جہاں تاریک ہے آنکھوں میں اور جلتا ہے دل
شمعِ بزمِ غیر ہے شاید رخِ جانانہ آج
اے صنم، شمع تصوّر سے مری[2]، نامِ خدا
اور ہی رونق پہ ہے دل کا مرے کاشانہ آج

---

[1] ک : یہ ہے
[2] ک : ترے

سلطنت مجذوب کی شاید کہ پھر چمکی ہے جو
صدرِ اعلیٰ میں ہوا قاضی دلِ دیوانہ آج

ہو مدد، اے کاوشِ خارِ جنوں جلدی کہ یہاں
پاؤں اُٹھ سکتا نہیں اپنا سوئے ویرانہ آج

جس نے بن دیکھے کیے لاکھوں کے دل پامالِ غم
اُس نگاہِ ناز کا ٹھہرا ہے دل بیعانہ آج

دل جلوں کو بعد جلنے کے بھی لگ جاتے ہیں پَر
راکھ ہو کر اُڑ گیا دیکھو پرِ پروانہ آج

زلف گر اُس رُخ پہ الجھی[1] ہے تو بس لازم ہے عکس
پنجۂ خورشید سلجھا دے بجائے شانہ آج

(۵)

اُٹھی اس طرح سے کل اِس دلِ بے تاب میں موج
پانی پانی ہوئی خجلت سے سنا آب میں موج

موج میں آب ہے، اور دیکھ لو، ہے آب میں موج
پا بہ زنجیر ہے یوں عالمِ اسباب میں موج

بلبلیں کیونکہ نہ تھرّائیں چمن میں، دیکھو
بن گئی فیضِ ہوا سے گلِ شاداب میں موج

زلفِ پُر پیچ کا گر عکس پڑے اُس رُخ پر
ہو عیاں چشمۂ خورشیدِ جہاں تاب میں موج

یار ہو ساتھ تو پھر بر لبِ دریا دیکھو
لطف دیتی ہے یہ کیا کیا شبِ مہتاب میں موج

---

[1] ک : الجھے

آہ کا آہ یہ عالم ہے دلِ شیدا میں
آگے چکراتی ہے جس طرح سے گرداب میں موج

غمِ[1] فرقت میں پری رُو کے مرے اشک کی آہ
متلاطم نہ ہو کیوں دیدۂ بے خواب میں موج

ہو وہ گر چیں بہ جبیں عیش دمِ مے نوشی
بن کے زنجیر پڑے جامِ مے ناب میں موج.

---

[1] مندرجہ شعر اور مقطع اصل میں شامل نہیں لندن کے نسخے سے شامل کیے گئے۔ بظاہر یہاں سے کچھ ورق ساقط ہو گئے ہیں۔

ح

اپنے[1] ہم رشکِ مسیحا سے ملیں یا نہ ملیں
اس میں کیا دیتا ہے تو اُے دلِ بیمار صلاح

مر مٹ اُس کوچہ میں تو نقشِ قدم کی مانند
عیش دیتا ہے یہی دل مجھے ہر بار صلاح

خ

جا[2] کے ہر روز تو اس کے پسِ دیوار نہ چیخ
چیخنے سے ترے ہوتا ہے خفا یار، نہ چیخ

اس کی نازک ہے طبیعت کہیں پہنچے نہ گزند
ہو کے بیتاب تو اتنا دلِ بیمار نہ چیخ

---

[1] ردیف ح کے صرف دو شعر کراچی کے نسخے میں پائے گئے ہیں۔ ل۔س میں موجود نہیں ہیں۔ بظاہر ساقط شدہ اوراق میں یہ غزلیں پوری ہونگی۔

[2] ردیف "خ" کے بھی صرف دو اشعار کراچی کے نسخے میں درج پائے گئے ہیں۔ ل۔س میں شامل نہیں۔

د

(۱)

حال[1] دریافت ہوا عشق کا غم کھانے کے بعد
قدر معلوم ہوئی دل کی تو دل جانے کے بعد

واعظا اُس[2] وقت کروں گا تجھے میں جھک کے سلام
ہوش تجھ میں رہے اُس شوخ کے دگر آنے کے بعد

جان جاتی ہے کھنچی جب مجھے یاد آتا ہے
دیکھنا اس کا کن انکھیوں سے وہ شرمانے کے بعد

کیا کہوں میں ترے بیمارِ غمِ ہجران کا
ہو گیا اور ہی کچھ حال ترے جانے کے بعد

ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق کا
کیونکہ آئی نہیں آواز پھر اک ہائے کے بعد

اب ملامت ہے عبث ناصحِ ناداں کو عیشؔ!
کیوں وہ شرمندہ ہوا خود مجھے سمجھانے کے بعد

(۲)

دیکھے[3] اشکِ صدفِ چشم کی گر تار کی بوند
تو ہو سو جاں سے نثار ابرِ گہر بار کی بوند

عوضِ چشمۂ حیواں بھی نہ دیں گر کوئی
مانگے آبِ قدمِ احمدِ مختار کی بوند

---

[1] ردیف "د" کی دو غزلیں بنیادی نسخے میں شامل نہیں، یہ لندن کے نسخے سے شاملِ مجموعہ کی گئی ہیں۔

[2] ل : آئے

[3] ک : دیکھ تو

زخمِ دل کے لیے جرّاح مرے مشک کے ساتھ
دے تو پگھلا کے ملا مرہم زنگار کی بوند

ہو غش اڑ کے اور پر پرواز کئے عنقا کے
نکل، ایسی ہوئی اس شوخ طرحدار کی بوند (؟)

ہو دیں سو جاں سے خریدار ابھی عطر و گلاب
ہے وہ خوشبو عرقِ چہرۂ دلدار کی بوند

ہم پیاسوں کو نہیں کرنے کا کوئی سیراب
ہاں مگر آبِ دمِ خنجرِ خونخوار کی بوند

ہے بہت دفترِ عصیانِ جہاں دھونے کو
ایک بحرِ کرم و رحمتِ غفّار کی بوند

زلفِ تر اس نے نہا کر جو نچوڑی، تو کہا
دل نے، ایک ایک ہے یہ زہرِ سرِ مار کی بوند

جلوۂ گلشنِ دنیا کے نہ آ پیچ میں عیش!
آگے تو جان، یہ ہے نوکِ سرِ خار کی بوند

(۳)

ہے یہ دنیا شرار کی مانند
بھاگ اس سے فرار کی مانند

صدفِ چشم میں ہر اک قطرہ
ہے دُرِ شاہوار کی مانند

نہ ہوا اور نہ ہوگا ابر کبھی
دیدۂ اشکبار کی مانند

عنبر و مشک میں کہاں خوشبو
اے صبا زلفِ یار کی مانند

ہیں (یہ) سیماب و برق و شعلہ و شمع
اس دلِ بے قرار کی مانند

(۴)

چھٹتا ہے فصلِ بہاری میں گلستاں صیّاد!
کروں میں کیوں نہ بھلا نالہ و فغاں صیّاد

قفس کی پھونکنی دو تیلیاں ہیں کیا مشکل
یہ نالے وہ ہیں کہ دیں پھونک آسماں صیّاد

بس آب و دانہ کی یہ خوبیاں ہیں سب، ورنہ
کہاں میں، اور کہاں دام اور کہاں صیّاد

قفس میں مر گئی سر کو پٹک پٹک بلبل
ہوا نہ اس پہ بھی کمبخت مہرباں صیّاد

لے یہ غزل صرف کراچی کے نسخے میں شامل ہے وہاں مقطع نہیں ہے۔

ئے مطلع اور دو شعر ک میں زائد ہیں۔ س میں نہیں

خدا کرے کہ ہو میری ہی طرح سے تو بھی
اسیرِ کنجِ غم و رنج و دستانِ صیّاد!

چمن کی دوری میں وہ زار و ناتواں ہوں میں
کہ تن میں باقی نہیں ہے گی میرے جاں صیّاد!

خدا کے واسطے تکلیفِ نالہ مجھ کو نہ دے
میں دم کے دم کا قفس میں ہوں میہماں صیّاد

یہ عیش رو کے کہا عندلیب نے کہ مجھے
فراقِ گل نے کیا زار و ناتواں صیّاد

(۵)

ان دونوں نالہ دل کو ہے اثر سے پیوند
بے ثمر نخل ہوا نخلِ ثمر سے پیوند

دیکھ لے زلفِ سیہ اس رخِ روشن پہ چھٹی
شام کا جس نے نہ دیکھا ہو سحر سے پیوند

ابر پھٹ جائے تو اے تارِ شعاعِ خورشید
کیجو تو اس کو مرے دیدۂ تر سے پیوند

بد گہر، بد گہروں سے ہے جہاں میں مربوط
کرتے ہیں نیک گہر، نیک گہر سے پیوند

بخیہ گر اس رخِ روشن پہ ہوں مائل کیجو
چاک دل کو مرے خورشیدِ سحر سے پیوند

زاہدا! آگ سے دوزخ کی بچا چاہے تو کر
زہدِ خشک اپنا مرے دامنِ تر سے پیوند

گو بظاہر ہیں جدا عیش مگر باطن میں
جان کو دل سے ہے اور دل کو جگر سے پیوند

(۶)

مجھ سا ہوگا نہ کوئی بے سر و پا میرے بعد
جانشیں نام ہی رہوے گا مرا میرے بعد

دل اسی غم سے ہے خوں پا کے وہاں شرفِ قبول
دیکھیے لائے گی کیا رنگِ حنا میرے بعد

خواب میں روح کرے گی مری مجرا تم کو
ڈھونڈ لادوگے[۱] اگر مجھ سا برا میرے بعد

خارِ صحرا کے یہ پھر چھیڑ کریں گے کس سے
مجھ سا کون آئے گا یہاں آبلہ پا میرے بعد

---

[۱] ک: لاؤ گے

گر یہی ظلم ہیں تیرے تو یہ بس یاد رہے
نام لینے کا نہیں کوئی ترا میرے بعد

لاکھ باندھے کوئی اس گلشنِ دنیا میں مگر
نہیں بندھنے کی کسی کی بھی ہوا میرے بعد

عیش، وہ مشقِ ستم کرتے تو ہیں مجھ پہ، مگر
اس کا معلوم انھیں ہوگا مزا میرے بعد

(۱)

بس اس لیے تمھیں بھیجا تھا لکھ کے ہاں کاغذ
کہ میرا حال کرے تم سے کچھ بیاں کاغذ

خدا کے واسطے کس طرح پہنچے وہاں کاغذ
نہ لے کے جا سکے جس جا فرشتہ خاں کاغذ

ابھی لکھا بھی نہ تھا حالِ سینۂ پُر داغ
کہ بن گیا یوں ہی صد شکِ گلستاں کاغذ

میں حالِ سوزِ دل اپنا لکھوں، تو کیسے لکھوں
حذر ہے خامہ کو مانگے ہے الاماں کاغذ

اب اس کو کیا کروں، وہاں تک پہنچ نہیں سکتا
جو ایک ہے مرا کمبخت رازداں کاغذ

سمجھ کے خط مرا غیروں کا بھی نہیں لیتا
یہ بدگمانی ہے، وہ شوخ بدگماں کاغذ

جو پہنچے ہاتھ تک اس ماہرو کے قسمت سے
تو پیدا کرتا ہے خاصیتِ کتاں کاغذ

خدا کے واسطے، چھپ چھپ کے ہم سے فرماؤ
یہ لوز بھیجو ہو، لکھ لکھ کے کس کے ہاں کاغذ

لکھا جو میں نے کہ خط کے جواب میں تم نے
لکھا نہ بھول کے ہم کو کبھی عیاں کاغذ

تو پھر کے آپ نے قاصد سے یہ کہا کہ یہاں
کہاں دوات، کہاں خامہ، اور کہاں کاغذ
نہ پہنچے عیش اسے ہم نے بار ہا لکھے
ہزار حیف، گئے یوں ہی رایگاں کاغذ

(۲)

حُب کے منگواتے ہیں لکھواکے ہم اکثر تعویذ
اور رکھتے ہیں وہ ہم جاں کے برابر تعویذ

کچھ بھی تاثیر نہ کی اہلِ عمل نے ہر چند
مشک کے ساتھ لکھے گھول کے عنبر تعویذ

سن لیا اس نے تو کہتا ہے دھر اکر مجھ کو
اور پاس اپنے رکھا کیجیے منگا کر تعویذ

وہاں عداوت کے عوض ربط بڑھا غیروں سے
ہم پشیماں ہوئے خود آپ جلا کر تعویذ

وہ درست ہوئے تو حاجت نہیں تعویذ کی کیوں
لاکھ تعویذ کا ہے ایک مقدّر تعویذ

جب اثر میرے ہی نالوں میں نہ ہوئے کمبخت
پیری اس میں کرے کیا اے دلِ مضطر تعویذ

خود فسوں ساز ہے وہ عیش بتِ سنگیں دل
اس پہ تاثیر کسی کا کرے کیوں کر تعویذ

ر

(۱)

دل وجگر سے کہاں جائے منتقل ہو کر — رہے گی آگ یہ سینے میں مشتعل ہو کر
جو آئے حضرتِ ناصح تو یہ بھی لکھ رکھو — کہ یہاں سے جائیں گے وہ خوب منفعل ہو کر
بلا مبالغہ کہتا ہوں، چیخے دوزخ بھی — جو گزرے اس دلِ سوزاں کے متصل ہو کر
فلک زدوں کی تو کچھ زندگی کا لطف نہیں — جیے تو کیا جیے دنیا میں مبتذل ہو کر
منافقانہ ملاقات، عیش خوب نہیں
نہ مل کسی سے، اگر مل تو صاف دل ہو کر

(۲)

میں نے کچھ اور کہا اُس نے سنا اور سے اور
تھا سوال اور، جواب اُس نے دیا اور سے اور
ایسا بہروپ بدلتے نہیں دیکھا ہم نے
بن گیا آئینہ، پاتے ہی صفا، اور سے اور
کھینچ لائے گی مرے گھر اسے اے ہم نفسو!
آہ کی آج وہ پلٹی ہے ہوا اور سے اور
اس طرح رنگ بدلتا ہے زمانہ دم دم
رنگ جس طرح بدلتی ہے حنا اور سے اور

یہ غزل جس نے سنی اُس نے کہا واہ جی واہ
عیشؔ کیا خوب بٹھایا ہے، بجا اور سے اور

(۳)

مت کسی سے تو جہاں میں بَیر ہو کر — ہو سکے تجھ سے جہاں تک خَیر ہو کر
ہاتھ کو اپنے تو پہلے کھینچ لے — پھر جدھر چاہے تو لنبے[1] پیر کر
قافلے والوں سے کہہ دو، تم چلو — ہم بھی آتے ہیں کوئی دم ٹھیر کر
دخترِ رز گر تجھے ملتی نہیں — شیخ کی ٹانگیں اٹھا اور فَیر کر
گر محبّت ہے تجھے اللہ کی — دور اپنے دل سے یادِ غیر کر

یہ بھی ہے اک دل لگی سنتا ہے عیشؔ
چل ذرا، دَیر و حرم کی سیر کر

(۴)

قد کسی کا یاد آیا سروِ بُستاں دیکھ کر — پھر گئیں نظروں میں زلفیں بستاں دیکھ کر
چرخ کو دعوی بڑا تھا اپنے ظلموں کا مگر — وہ بھی چکرا ہی گیا بیدادِ خوباں دیکھ کر
صدقے اُن آنکھوں کے دل میں کیا کہوں بے اختیار — گد گدی اُٹھتی ہے اُن کی نوکِ مژگاں دیکھ کر
فصلِ گل میں زیرِ دام آ، عندلیبِ خستہ حال — دل پکڑ کر رہ گئی سوئے گلستاں دیکھ کر
نشترِ نوکِ مژہ کو اُس بتِ خونخوار کی[2] — ہو گئی بیتاب سینے میں رگِ جاں دیکھ کر
کیوں چھپایا مَیں کیا اجارہ ہے کسی کا ہم نشیں! — دے دیا۔ اپنا تھا دل، اس بت کو ہاں ہاں دیکھ کر
نوح کا طوفاں بھی اے شوخ سٹی بھول جائے[3] — تیری فرقت میں مرے اشکوں کا طوفاں دیکھ کر
اپنے پاماوں پہ بھی رکھنی نظر کچھ چاہیے — راہ چلتے ہو چلو لیکن مری جاں دیکھ کر

---

[1] ک : اپنے
[2] ل . کے
[3] ل : نوح کا طوفاں گیا، اے شوخ، سٹی بھول. آہ

عیشؔ اس دیوانے پن کا بھی ٹھکانا ہے کہیں
ٹکڑے کر ڈالا جگر چاکِ گریباں دیکھ کر

(۵)

جو ہوتا آہ، تری آہِ بے اثر میں اثر — تو کچھ تو ہوتا دلِ شوخِ فتنہ گر میں اثر
بس اک نگاہ میں معشوق چھین لیں ہیں دل — خدا نے ان کی دیا ہے عجب نظر میں اثر
نہ چھوڑی غم نے مرے اک جگر میں خون کی بوند — کہاں سے اشک کا ہووے چشمِ تر میں اثر
ہو اُس کے ساتھ یہ بے التفاتیِ گل کیوں — جو عندلیب کے ہو نالۂ سحر میں اثر
کسی کا قول ہے سچ سنگ کو کرے ہے موم — رکھا ہے خاص خدا نے یہ سیم و زر میں اثر
جو آہ نے فلکِ پیر کو ہلا ڈالا — تو آپ ہی کہیے کہ ہے گا یہ کس اثر میں اثر
جو دیکھ لے تو جہنم کی پھیرے بندھ جائے[1] — ہے میری آہ کے وہ ایک اک شرر میں اثر
بگاڑیں چرخ سے ہم عیشؔ کس بھروسے پر
کہ[2] آہ میں ہے، نہ سوزِ دل و جگر میں اثر

(۶)

شکوۂ غیر زباں تک کہو[3] لائیں کیوں کر — اُن کا دل دکھتا ہے، دل اُن کا دکھائیں کیوں کر
لب ہلانے کا وہاں حکم نہیں کہیے ہم — دردِ دل اپنا اُنھیں آہ سنائیں کیوں کر
سر نہیں رکھتے کہ ہم پاؤں بنائیں اُسے پھر — کوئے قاتل میں اگر جائیں، تو جائیں کیوں کر
ٹیڑھ کی چلتا ہے دن رات، یہ چرخِ کج رو — ایسے کج رو کو بھلا[4] راہ پہ لائیں کیوں کر
دل ہے جوں نقشِ قدم کوچۂ جاناں کا مقیم
بجز فغاں اُس کو ہم اے عیشؔ اٹھائیں کیوں کر

---

[1] ل: جو دیکھ لے تو جہنم کی بھیڑ بندھ جائے
[2] ل: کہ آہ میں ہے نہ ہے سوزشِ جگر میں اثر [3] اصل: فنا
[4] ک: بھلا

(۷)

ہم نے ٹالا ہے آج تک ہنس کر
اے فلک ظلم تا کجا، بس کر

زلف کی ناگنی سے لاکھ بچو
اک نہ اک دن رہے گی وہ ڈس کر

کیوں جی ہم سے تو یوں چرائی آنکھ
اور غیروں سے باتیں ہنس ہنس کر

قتل پر آہ بے گناہوں کے
آج نکلے ہیں وہ کمر کس کر

دے کے دل منتیں ہیں جس تس کا
نہ الٰہی، کسی کو بے بس کر

نہ چھٹا مرغِ دل نہ چھوٹے گا
دامِ زلفِ سیاہ میں پھنس کر

نیک و بد کو نہ ہانک اک لکڑی
گر تجھے امتیاز ہے، مس کر

عیش یہ عاشقی ہے کھیل نہیں
جو کرے کام، ہوکے چو کس کر

(۸)

عاشق ہوئے ہیں حضرتِ دل اُس نگار پر
ہنستا ہے جو کہ اِس فلکِ فتنہ کار پر

اک نور سا ہے ہر شجر و برگ نہ بار پر
عالم ہی[1] اور ہے چمنِ روزگار پر

مستانے اُس کی چشمِ سیہ مست کے جو ہیں
ان کے نشے کبھی نہیں آتے اتار پر

غصے میں چہرۂ عرق آلودہ یار کو
پڑ جائے اُوس دیکھے تو بس نور و نار پر

قول[2] و قسم میں جس کے ہو سو طرح کا فریب
دل دے کوئی تو دے اسے کس اعتبار پر

---

۱ ک : ہے اور ہی

۲ ک : میں یہ شعر مقدم ہے

سیماب و برق شعلۂ جوالہ کو سُنا[1]
آتا ہے رشک میرے دلِ بے قرار پر

اُس شمع رُو پہ ہوا بھی سو جان سے نثار
مہرِ فلک کے ہو ویں جو پروانہ وار پر

ہر قطرہ اُس کا رکھتا ہے طوفاں گرہ میں کیوں
ہو چشمِ تر نہ خندہ زن ابرِ بہار پر

پیرِ مغاں سے کہہ دو کہ سو میکدے ترے
صدقے کیے تھے اک نگہِ مستِ یار پر

زلفوں میں اس کی جائے گتھا اُس نے کیا کیا
آتا ہے حیف، اس دلِ ناکردہ کار پر

دل محوِ جلوۂ رخِ تاباں وہ ہے کہ برق
پروانہ ہو مرے نفسِ شعلہ بار پر

زاہد ہے نیک کار تو ہے اپنے واسطے
ہنستا ہے کیوں ہمارے گناہوں کے بار پر

عاصی ہیں ہم نجات ہماری تو بس فقط
ہے منحصر عنایتِ آمرزگار پر

عشقِ بتاں کا نام نہ لوں عیشؔ گر مجھے
ہو اختیار اسِ دلِ بے اختیار پر

(۹)

پانو اپنے حنا سے لال نہ کر
خون عاشق کا پائمال نہ کر

اُس کے ابرو سے قصدِ ہم چشمی
ہو گی خفت تجھے، ہلال نہ کر

---

[1] ک: میں یہ شعر موخر ہے

بدزبانی سنائیہ عاشق سے — دیکھ اپنی زباں سنبھال نہ کر
مان یہ سانپ کا کھلانا ہے — اُس کی زلفوں کا دل خیال نہ کر
بوسۂ لب زکوٰۃ دولت حسن — دے دے عاشق کا ردسوال نہ کر
عیش یہ بت ہیں سنگ دل اُن سے
دردِ دل کا بیانِ حال نہ کر

(۱۰)

دل مرا تم نہیں دیتے نہ دو اچھا لے کر — پر یہ کہیے تو کر کیجے گا اسے کیا لے کر
پند وہ کیا ہوئے پوچھو تو سہی کیا گزری — آئی جب بزم میں یوسف کو زلیخا لے کر
دیکھ حالت ترے بیمارِ غم ہجراں کی — رہ گئے دانتوں میں انگلی کو مسیحا لے کر
حضرتِ شیخ جی کل شب گروے کے لیے — میکدے میں گئے تسبیح و مصلاّ لے کر
عرضِ حالِ دلِ شیدا جو کیا شب تو کہا — راہ لو اپنی یہ کیا آئے ہو جھگڑا لے کر
رو برو داورِ محشر کے بتاؤ تو سہی — ہم گنہ گار بھلا جائیں گے منھ کیا لے کر
نقدِ دل دے کے انھیں ہم نے خریدی وحشت — چلے بازارِ محبت سے یہ سودا لے کر
خط کے پرزے کیے اس شوخ نے اے لو ہاں سے — نامہ بر آئے تو یہ آئے سند لیا لے کر
لیے عصیاں عوضِ نقدِ گراں پایۂ عمر
لینے کیا آئے تھے اور عیش چلے کیا لے کر

ڑ

کڑھے ہوئے ہیں وہ اوپر تری نقاب کے پیڑ
کہ خار کھائیں جسے دیکھ کر گلاب کے پیڑ

نہ کیوں اُگے مری ضبطِ فغاں سے نخلِ مراد
کہ سب بناتے ہیں ٹھنی زمیں میں داب کے پیڑ

نہ کہیو شیخ جی صاحب سے، بے ثمر نکلے
لگائے ہیں نے جو بھیجے ہوئے جناب کے پیڑ

یہ برگِ پاں کی طرح دل کی آرزوؤں کے
تمام پھینک دیے غم نے چاب چاب کے پیڑ

غمِ فراقِ بتاں میں سنا، سنا اے دل!
نہیں ہیں آہیں، یہ ہیں میرے اضطراب کے پیڑ

پڑا حباب میں ہے سروِ جوئبار کا عکس
اُگا ہے سرو کا پا درمیاں حباب کے پیڑ

یہ ہیں خطوطِ شعاعی، کوئی بتاؤ تو
اُگے ہیں یا کہیں چشمے سے آفتاب کے پیڑ

دلِ برشتۂ عشاق دیکھ لیں جا کر!
نہ دیکھے ہوویں کسی نے اگر کباب کے پیڑ

لگائے ہیں یہ تری نخل بندِ فکر نے کیا
زمینِ شور میں اے عیشؔ آب و تاب کے پیڑ

(۱)

طوفان اٹھاتے ہیں مرے دیدۂ تر روز
ہوتا ہے نیا حشر بپا خلق میں ہر روز

کیوں ٹکٹکی رہوے نہ بندھی جانبِ در روز
اب آئے، اب آئے یہی سنتے ہیں خبر روز

یہ دیدۂ تر میرے دکھاتے ہیں ہنر روز
آنسو سرِ مژگاں پر بناتے ہیں گہر روز

یہاں آتشِ غم میں تری، اے مہروش، آ دیکھ
جلتے ہیں پڑے میرے دل و جان و جگر روز

صد رشکِ جہنم ہے، بس ایک اک شرر اُس کا
برسائے ہے وہ آہِ شرر بار شرر روز

اے چارہ گر، کیجے علاج اس کا بھلا کیا
جو روز ملے غیروں سے، اور جائے مکر روز

دکھلانا ہے اللہ کو بھی منھ، تجھے ظالم!
اس طرح کہ آ، مان کہا، ظلم نہ کر روز

کس طرح نہ ہو حال زمانے کا دگرگوں
دکھلائے ہے وہ جلوہ بہ اندازِ دگر روز

پروانہ تو عاشق ہی ہے، پر شمع بھی اے عیش!
رو رو کے سنا شام سے کرتی ہے سحر روز

(۲)

دیتا ہے آ کے جلوہ وہ بالائے بام روز
لیتا ہے خاص و عام کا مجرا سلام روز

غیروں کو آپ دیتے ہیں بھر بھر کے جام روز
اور ہم کو یہاں بتاتے ہیں بس صبح و شام روز

یا طوف کوے یار ہے، یا نالہ و فغاں
مجھ دل زدہ کو رہتا ہے بس یہ ہی کام روز

ہوگا ہجوم خلق جو محشر میں ایک دن
رہتا ہے اس کے کوچے میں وہ اژدہام روز

درباں کو اُس کے لاگ ہے اک مجھ سے ورنہ واں
ہوتے ہیں باریاب سبھی خاص و عام روز

تم اور تمھارا عشق، چلو اپنی راہ لو[1]
اُس بے وفا کا ہم سے ہے یہ ہی کلام روز

گر اختلاط اُس کو گلوں سے نہیں تو کیوں
رہتا ہے عندلیب کو نزلہ زکام روز

وہ رُخ وہ رُخ ہے سنتے ہوائے عیش آفتاب
لیتا ہے نور اس رخِ روشن سے وام روز

---

[1] ل : ہمارا

س

(۱)

دیدہ و دانستہ ہو ہو کر گرفتارِ ہوس
کیوں اُٹھاتا دل پہ ہے، نادان! تو بارِ ہوس

جس کا دل سینے میں، دیکھو، ہے دوکاندارِ ہوس
آج کل کیا گرم ہے عالم میں بازارِ ہوس

یہ مرض[1] وہ بدبلا ہے، سنتے ہو اے دوستو!
ہو نہ دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزارِ ہوس

وصلِ جاناں کی ہوس عاشق کو کچھ بے جا نہیں
حق بجانب اُس کے ہے، وہ ہے سزاوارِ ہوس

انتظامِ عالم کا گر ہووے تو ہووے کس طرح
ہیں غنی سے تا فقیر، اے عیشؔ، سرشارِ ہوس

(۲)

دل کو ہو کیوں نہ ترے تیر کے پیکاں سے اُنس
صاحبِ خانہ کو ہوتا ہی ہے مہماں سے اُنس

---

[1] ل : یہ مرض سنتے ہو تم وہ بد بلا ہے دوستو

ہم نے چاہا اگر اُس شوخ کو، کیا ظلم ہوا
رسم ہے، ہوتا ہے انسان کو انسان سے اُنس

زلف اس رُخ پہ چمٹی رہتی ہے ہر شام و سحر
اتنا کم ہوتا ہے کافر کو مسلماں سے اُنس

دلِ مجروح کو رہتا ہے زنخداں کا خیال
ہے اچنبھا کہ ہو گھائل کو نمک دان سے اُنس

ہوتی ہر ایک کو ہے جنس سے اپنی اُلفت
ہو نہ آئینے کو کیوں اُس دلِ حیراں سے اُنس

ہے مثلِ قیس کو لیلیٰ کا ستاتا بھی عزیز
مجھ کو کیوں کر نہ ہو اس شوخ کے دربان سے اُنس

عیش، وحشت میں بھی اک دم نہیں ہوتا ہے جُدا
کس قدر دستِ جنوں کو ہے گریبان سے اُنس

(۱)

نصیب آرام ہووے جب اسے ہو دل کو آسائش
نہ ہوگی بعدِ مُردن بھی ترے بسمل کو آسائش

مزہ آتا ہے اُس کو نیم بسمل چھوڑ دیتے ہیں[1]
ہمیں بھی ہے یہی منظور، ہو قاتل کو آسائش

تعلق ماسوا اللہ کا وبالِ جان ہے، اے ناداں!
نہیں ہوتی سُنی ہرگز دلِ مائل کو آسائش

طلب رکھتا ہے دل بوسے کی، کیوں دیتے نہیں صاحب
ملے ہے اجر اُس کو دے ہے جو سائل کو آسائش

پسِ ناقہ ہو مضطر، قیس بے تابی کے عالم میں
کہے تھا[2] رہوے یارب صاحبِ محمل کو آسائش

سراج الدین غازی ہے سریر آرا جو عالم میں
نصیب اُس کو اور اس کی ساری ہو محفل کو آسائش

۱۔ ل، ک: دیتے ہیں

۲۔ کھپار ہوے

نہیں ہے دور کچھ اے عیشؔ گردش سے زمانے کی
کہ ہو عالم کو تکلیف اور ملے جاہل کو آسائش

(۲)

ہے شمع کے شعلے کی طرح سر بسر آتش
آتش سے ترے غم کی دل آتش جگر آتش

رکھتا ہے وہ سینے میں یہ تفتہ جگر آتش
چیخ اٹھے کبھی دیکھے وہ دوزخ اگر آتش

سوزِ غمِ دوری سے جو ہے سینے میں بھڑکی
کب آہ بجھا سکتی ہے وہ چشمِ تر آتش

یوں نام سے اعدا مرے جل اٹھتے ہیں جیسے
بارودت[1] کے تودے میں کوئی دے پوے دھر آتش

بے حکمِ خداوندِ جہاں عیشؔ یہ لکھ رکھ
کیا تاب جو پہنچا سکے کچھ بھی ضرر آتش

(۳)

سب مغاں کے دیکھ اڑ جاویں گے ہوش
آن نکلا گر کبھی وہ بادہ نوش

چیخ ہی اٹھے جہنم اس قدر
آتشِ الفت کا ہے سینے میں جوش

گلشنِ دنیا کی نیرنگی کو دیکھ
گل ہنسے ہے اور ہے غنچہ خموش

لاکھ ٹالے گر کوئی ٹلتے ہیں کب
شمع کی[2] مانند جو ہیں سر فروش

عیشؔ ابنائے جہاں ہیں یک قلم
سب کے سب گندم نما و جو فروش

---

[1] ک : بارود
[2] ک : شمع کے

(۱)

رکھے ہے جیسے کہ عاشق کے دل سے غم اخلاص
جہان میں کوئی رکھتا ہے ایسا کم اخلاص
ہزار جان سے رکھتے ہیں اُس سے ہم اخلاص
ستم ہے غیروں سے رکھتا ہے وہ صنم اخلاص
وفا سرشتوں کے حق میں، بتانِ بے دیں کی
بلا ہے بدمزگی اور ہے ستم اخلاص
بس ایک سورہ ہے قرآن میں فقط، ورنہ
مٹا جہان کے صفحے سے یک قلم اخلاص
جو صاف دل ہیں زمانے میں عیش، ہاں اُن کے
زیادہ ہوتا ہے آپس میں دم بدم اخلاص

(۲)

ہیں حضرتِ عشق بھی عجب شخص | ملتے ہیں جہاں میں ایسے کب شخص
کیوں کھیلے نہ جان پر، بتاؤ | بیزار ہو زندگی سے جب شخص
کہلاتے ہیں جو کہ حضرتِ غم | واقف ہیں جہاں میں ان سے سب شخص

شکوہ یہ عبث ہے، کیوں کسی سے　　ناحق دبے، کوئی، بے سبب شخص
رکھتا ہے جہاں میں حکمِ عنقا　　وہ دے جو کسی کو بے طلب شخص
رکھتے ہیں کمال وہ بھی کیا جو　　ہر اک سے نکالے ہیں ڈھب شخص
کہتے ہیں جہاں میں جن کو معشوق　　دل لیتے ہیں سب کے وہ غضب شخص
کہتے تھے یہ رِند شیخ جی سے　　ہیں آپ بھی سخت بے ادب شخص

پیدا نہیں میرؔ و مرزاؔ سے
اے عیشؔ سنا جہاں میں اب شخص

نہ خوشی سے ہمیں، نہ غم سے غرض
ہے مگر ایک اُس صنم سے غرض

نہ ہمیں جام سے نہ خم سے غرض
یار رکھتے ہیں اپنے دم سے غرض

نہیں پروا کوئی جیے کہ مرے
ہے انھیں رت دن ستم سے غرض

جو کہ شاکر ہیں اپنی قسمت پر
نہیں کچھ ان کو بیش و کم سے غرض

ہم رسولِ خدا کی امّت ہیں
ہے ہمیں شافعِ اُمَم سے غرض

اور تصدّق سے اُس کے رکھتے ہیں
اپنے اللہ کے ہم کرم سے غرض

عیشؔ، جو اُس نگہ کے عاشق ہیں
ان کو کیا خنجر دو دم سے غرض

ط

(۱)

آتشِ غم میں گیا دل ہے جو پھنس شمع نمط — رشتۂ جاں کو ہے جلنے کی ہوس شمع نمط

ہے یہ بس غمکدہ اس بزمِ جہاں میں ناداں — دیکھ روے گا کہا مان نہ ہنس شمع نمط

جز خدا دم کو بھی تو اپنے سنا دوست نہ جان — دشمنِ جاں ہے ترا تارِ نفس شمع نمط

آہ اِس بزم میں کیا کیجیے جز سوز و گداز — اور چلتا نہیں کچھ اپنا تو بس شمع نمط

مجلسِ دہر میں آساں نہیں روشن ہونا — پھونک دے گی تجھے[۱] یہ تیری ہوس شمع نمط

چشمِ عبرت[۲] سے تجھے چاہیے رونا اے دل — ہے فنا سر پہ لگی[۳] دیکھ نہ ہنس شمع نمط

آتشِ غم سے چھٹوں کیوں کہ گڑے ہیں دیکھو — عشق کی راہ میں پاؤں مرے دھنس شمع نمط

سوزِ غم میں یہی ثابت قدمی ہے اے دل! — جل کے ہو خاک ولیکن نہ او کس شمع نمط

سوزِ ہجراں میں وہ پایا ہے مزہ دل نے کہ بس — جی میں آتا ہے جلیں لاکھ برس شمع نمط

پھونک اس پردے کو فانوسِ خیالات کے بس — کر رکھا ہے تجھے محبوسِ قفس شمع نمط

گرم جوشی تری اُس شوخ سے دیکھ عیش عدو
سر سے تا پا ابھی جاویں گے بھلس شمع نمط

(۲)

ہے مجھے پاسِ وفا اے بتِ عیار فقط — ورنہ کچھ تو ہی نہیں ایک طرح دار فقط

آرزو اس دلِ شیدا کی یہی ہے کہ ترا — ایک بوسہ کبھی دے دے لبِ سوفار فقط

واعظا خلد کو ہم لے کے کریں کیا ہم کو — رشکِ صد خلد ہے وہ سایۂ دیوار فقط

---

۱ ک : بھون دے گی

۲ ل : غیرت

۳ ک : کھڑی

فخر سمجھے ہیں سب ابنائے جہاں دعوے کو　　ہے اگر عار تو اک مجھ ہی کو ہے عار فقط
اے گل اندام ترے سر کی قسم غیروں کے　　خار ہے ایک یہ نظروں میں گنہگار فقط
اے فلک اور نہیں کچھ ہوسِ دل اُن سے　　حالِ دل اپنا کیا چاہوں ہوں اظہار فقط
چارہ گر سودۂ الماس چھڑک مشک کے ساتھ　　دل کے زخموں پر نہ رکھ مرہمِ زنگار فقط

یوں تو سب مصری کی ڈلیاں ہیں مگر عیشؔ سنا
دل پسند اپنے ہیں اک میرؔ کے اشعار فقط

ظ

جانِ مضطر کو نہ ہو کیوں دلِ بے تاب سے حظ
ہوتا احباب کو ہے صحبتِ احباب سے حظ

نگہِ مست سے پاتا ہے وہ دل کیفیت
ہوئے مخمور کو جس طرح مے ناب سے حظ

کیا کہوں فرقتِ جاناں میں کہ جو گزرے ہے
پوچھے اب اس کا کوئی ماہیِ بے آب سے حظ

اہلِ دل پاتے ہیں جمعیتِ دل سے لذّت
اہلِ دنیا کو ہے جمعیتِ اسباب سے حظ

دیکھ کر روے بتاں جان مزا پاتی ہے
عندلیبوں کو نہ ہو کیوں گلِ شاداب سے حظ

کرتا بد حظ ہے فقط طالعِ بیدار کو خواب
ورنہ ہر جاگنے والے کو ملا خواب سے حظ

جب[1] نہ ہو ساتھ وہ مہ رُو شبِ مہتاب میں عیش!
کیا اٹھے[2] خاک بتاؤ شبِ مہتاب سے حظ

---

[1] ک : جو نہ ہو ساتھ وہ مہ رو شبِ مہتاب میں عیش

[2] ک : کیا ملے خاک بتاؤ شبِ مہتاب سے حظ

ع

(۱)

شب جو روشن ہوئی آہِ دلِ رنجور کی شمع
آئی یاد حضرت موسیٰ کو سنِ طور کی شمع
میں نے اس واسطے بس سامنے سے دور کی شمع
دل میں روشن تھی خیالِ رخِ پُر نُور کی شمع
سرد آہوں سے جلا دل تو اچنبھا کیا ہے
گھر جلا دینے کو کچھ کم نہیں کافور کی شمع
جلوۂ رخ کا جھمکڑا ہے یہ برقع کے تلے
یا چھپی پردۂ فانوس میں ہے نور کی شمع
نور ایماں ہی کفایت ہے مسلماں کے لیے
میری انگشت شہادت ہے مری گور کی شمع
یہ ہی کہتے ہیں سنا رندِ سبوکش سارے
مے گل رنگ ہے بزم طربِ دستور کی شمع
مانگ کو یار کی سب کہتے ہیں ظلمات کی راہ
پر مرے ذہن میں ہے یہ شبِ دیجور کی شمع

سہ ک : یہ ہے

گرمِ بازاری اسی سے ہے کہ پروانہ ہے
عیشؔ، بس شعلہ (ہے ورنہ) بتِ مغرور کی شمع

(۲)

اس طرح کہنا یہ بھی ہے تحقیرِ پائے شمع — موجِ سرشکِ شمع ہے زنجیرِ پائے شمع
یہاں تک ہے راہِ عشق میں توقیرِ پائے شمع — پروانہ[1] دل میں رکھے ہے تصویرِ پائے شمع
پروانہ شمع کے رہا جل کر بھی زیرِ پائے — تقدیر اس کی کہیئے[2] نہ تقدیرِ پائے شمع
گل گیر پاؤں شمع کے پڑ تلے یوں کہ اب — سر کاٹ کر ہے درپئے تدبیرِ پائے شمع
[3]پروانہ جل کے شمع کے پاؤں نہیں پڑا — خاک اس کی اب ہوئی ہے گلوگیرِ پائے شمع[3]

پروانے کی نظر میں، سنا[4] تو یوں ہیں عیشؔ!
صد رشکِ آفتاب ہے تنویرِ پائے شمع

---

[1] ک : پروانے دل میں رکھتے ہیں

[2] ک : کہتے

[3] یہ شعر بنیادی نسخے میں شامل نہیں۔ "ل" میں موجود ہے

[4] ک : سچ تو یوں ہے عیشؔ

فرقت میں تیری دل سے ہے تا بہ جگر داغ
اور اس پہ نئے دے ہے تو اے رشکِ قمر داغ
گردے ہے تجھے یہ فلکِ شعبدہ گر داغ
ایک آہ کی، دل تو بھی، ہوائی کو، تو دھر داغ
عالم میں یہ روشن ہے کہ اس بزمِ جہاں سے
پروانے کا لے دل پہ گئی شمعِ سحر داغ
اے ہم نفسو، یاد میں اُن شعلہ رُخوں کے
ہر اک مرے سینے کا ہے لبریزِ شرر داغ
مانندِ چراغ آہ شبِ ہجرِ بتاں میں
روشن رہا سینے میں مرے تا بہ سحر داغ
گلزارِ محبت میں، سنا، لالۂ حمرا
کہتا ہے کہ ہے نخلِ محبت کا ثمر داغ
سو جان سے، اے عیشؔ، لکھے خطِّ غلامی
لالہ مرے سینے کا سنا دیکھ لے گر داغ

ے ک: احمر

ف

دل کو دہشت ہے جگر سے اور جگر کو دل سے خوف
یہ تماشا ہے نیا بسمل کو ہے بسمل سے خوف

معدنِ سیماب کھاتا ہے ترے بسمل سے خوف
اور بجلی کو ہے اُس کے اضطرابِ دل سے خوف

بارِ خنجر سے نہ رنجیدہ ہو کیوں نازک ہے وہ
آئے ہے رہ رہ کے یہ ہی بازوے قاتل سے خوف

اِس لیے آتا دبے پاؤں پسِ ناقہ ہے قیس
سُن نہ لے آوازِ پا، ہے صاحبِ محمل سے خوف

رستم و سہراب کے اس رہ میں چھکّے چھوٹ جائیں
کیوں کہ راہِ عشق میں ہے پہلی ہی منزل سے خوف

حضرتِ منصور نے ہے جان دی اس واسطے
تا کہ ہو اہلِ جہاں کو دعویٰ باطل سے خوف

بخشنے والا ہے اللہ، اور محمدؐ ہیں شفیع
حشر کا تو عیشؔ ہاں کر دور اپنے دل سے خوف

نہ تو پستے ہی[1] سے رغبت ہے نہ بادام سے شوق
ہے مگر چشم و لبِ ساقیِ گلفام سے شوق

جو گرفتار ہیں اس زلفِ مسلسل کے سُنا
نہ انھیں کام قفس سے ہے نہ کچھ دام سے شوق

کون سا ہووے گا کمبخت وہ عاشق جس کو
ہوگا فرقت میں دل آرام کے آرام سے شوق

مثلِ آئینہ تکے گا تری صورت کو مدام
یہ تو جلنے کا نہیں اس دلِ ناکام سے شوق

جو کہ اُس چشم سیہ مست کے دیوانے ہیں
ان کو کیوں ہووے گلِ نرگس و بادام سے شوق

پھاڑ کر خط کو وہ کہنے لگے قاصد سے، مجھے
اب نہ سنتا ہے، نہیں نامہ و پیغام سے شوق

اس توقع پہ کہ شاید وہ سحر کو نکلے
گھر سے باہر لیے پھرتا ہے سرِ شام سے شوق

زلف اس رُخ پہ چھُٹی رہتی ہے، حیران ہے عقل
کیوں نہ حیران ہو، ہندو کو اور اسلام سے شوق

پھرنا[2] اس کوچے میں، یا پلکوں سے جھاڑو دینی
رات دن ہم کو ہے اے عیش اسی کام سے شوق

---

[1] ک : نہ تو پستے سے ہے رغبت نہ ہے بادام سے شوق

[2] ک : پھرتا اس کوچے میں ان پلکوں سے جھاڑو دیتے

(۱)

اُس[1] راہ سے جس راہ میں آوے مرے گھر تک
قربان کروں سب جاں تلک اور جان سے سر تک

ہوں غرقِ بخوں تا بہ دل و دیدۂ تر تک
پہنچے ہے دعا دیکھیے کب آہِ اثر تک

خجلت لبِ میگوں سے ہے یاقوت کو تا لعل
اور لعل سے شرمندہ ہے برگِ گلِ تر تک

خورشید ہے اُس آہ سے ترساں نہیں لرزاں
ہے برق سے شعلہ تلک اور اُس سے شرر تک

مرتے ہیں تری وضع پہ خوبانِ جہاں سب
لے سرو سے تا شمع و گل، گل سے قمر تک

یہاں ظاہر و باطن مرا سب وقفِ جنوں ہے
دامن سے گریباں تلک اور دل سے جگر تک

---

[1] ل : آُس راہ میں جس راہ سے آوے مرے گھر تک

ہیں تودوں پہ تودے پڑے کشتوں کے تمھارے
بازار سے کوچے تلک اور کوچے سے در تک

زلف و رخِ دلبر کا تصوّر مرے دل پر
ہے صبح سے بس شب تلک، اور شب سے سحر تک

اک زلف کا بل ہو تو کہوں، سیکڑوں بل ہیں
پیشانی سے ابرو تلک، ابرو سے کمر تک

ہو آنکھ تو دیکھے کوئی قدرت ہے نمایاں
ہر شاخ سے ہر گل تلک، گل سے ثمر تک

اے غنچہ دہن، بُو سے تری زلف کی، خوشبو
ہے مشک سے عنبر تلک، عنبر سے اگر تک

محرم کا میں شاگرد، وہ بیدار کے شاگرد
ہے عیش سلاسل مرا یوں درد و اثر تک

(۲)

بوئے زلف اُس کی صبا گر اُس کے دیوانوں تلک
لے کے پہنچا دے، تو دے دیں وہ ابھی جانوں تلک

یہ نقط گردش نہیں کچھ ایک پیمانوں تلک
دورِ چشمِ یار میں ہلچل ہے میخانوں تلک

مان، آ، مت کھول زلفیں، سنتے ہی مر جائیں گے
گر خبر پہنچی ترے خاطر پریشانوں تلک

بزم میں اس شمع رو کی ہو گر اپنا اختیار
غیر کیا، آنے نہ دیویں ہم تو پروانوں تلک

بس ادب شوقِ طپیدن، ہو چکے ہیں شور بور
ہاتھ اُس قاتل کے خوں میں سب کے سب شانوں تلک

زلف اُن گالوں پہ چھوٹی ہے قیامت کا نشان
دب گئے کفار سے اے لو مسلمانوں تلک
رشتۂ الفت نے بندھوائے ہیں لاکھوں دل یوں ہی
یہ نہیں موقوف کچھ تسبیح کے دانوں تلک
دخترِ رز کی دیکھنا سب مستیاں جھڑ جائیں گی
گر کبھی پہنچی وہ اُن آنکھوں کے مستانوں تلک
پاؤں تک جس کے نہ پہنچا ہو کبھی پیکِ خیال
ہاتھ پہنچے کس طرح اُس شوخ کی رانوں تلک
تیرے جانبازوں کو کیا وحشت چکھائے گی مزے
یہ ہی نا، جانا پڑے گا ان بیابانوں تلک
اُن کے سوفاروں کا بوسہ کیونکہ لے زخمِ جگر
کامِ دل پہنچا نہ جن تیروں کے پیکانوں تلک
واعظا کیا خاک مانے کوئی اُس انسان کی
جس کی باتوں پر کہ سب ہنستے ہوں حیوانوں تلک
عیشؔ کس دستِ حنائی کا تصور ہے کہ یوں
دیدۂ تر خون میں ڈوبی ہیں مژگانوں تلک

(۳)

جرس و نالۂ دل کی مرے آواز ہے ایک
وادیٔ عشق میں ان دونوں کا انداز ہے ایک
قتلِ عشاق میں جیسے نگہِ ناز ہے ایک
ویسے ہی عشق میں یہ عیشؔ بھی جانباز ہے ایک[س]
مرغِ دل پنجۂ مژگاں میں دبا بیٹھا ہے
نگہِ مست ہے اُس شوخ کی کیا باز ہے ایک
اُس کی ہر بات میں اعجاز ہیں وہاں ٹھروں ٹوں
حضرتِ عیسیٰ مریم کا بس اعجاز ہے ایک

س ک: یہ عاشقِ جاں باز ہے ایک

چھین لے دل وہ ابھی باتوں ہی باتوں میں سنا　　تم تو کیا مال ہو، ستم سے وہ دم باز ہے ایک

بن بلائے ہوئے وہ آپ مرے گھر آئے　　بن گئی بات یہ قسمت سے خدا ساز ہے ایک

عشق میں دو نہ سمجھنا جگر و دل کو کہیں　　نام کو دو ہیں مگر ایک کا ہمراز ہے ایک

اُس نے کچھوے کو دغا دی ہے یہ مشہور ہے تم　　شیخ کے دم میں نہ آنا کہ وہ دم باز ہے ایک

عیشؔ دو دل کو بہم جمع سپہر کج رو
دیکھ کب سکتا ہے، یہ تفرقہ پرداز ہے ایک

(۴)

لگاؤں اشک کو میں اپنے اعتبار نمک　　اٹھائے گا مرا آنسو کبھی نہ عار نمک

جو ہو گیا مرا آنسو کبھی دوچار نمک　　تو زخم دل پہ نہ ہوگا نمک سے[1] کار نمک

نہیں یہ اُس لب شیریں سے گالیاں کھائیں　　لیا ہے قند مکرر سے ہم نے کار نمک

جہاں میں شور مچا دے گا میرے رونے کا　　یہ طفل اشک ہے پروردۂ کنار نمک

وہ کون کان ملاحت ہے جس کی یاد میں یہاں　　ہر ایک زخم جگر کو ہے انتظار نمک

نمک چھڑک دے مرے زخم دل پہ او ظالم　　جو دیکھنی تجھے منظور ہو بہار نمک

تصور لب شیریں رہے گا عیشؔ جسے
نہ ہوگا اُس کا لب زخم شرمسار نمک

---

[1] ک : سے

گر یہی رہویں گے چندے دلِ بیتاب کے ڈھنگ
تو بدل جاویں گے سب آہ خور و خواب کے ڈھنگ

چین عاشق کو کہو آئے تو کیوں کر آئے!
جب اڑا ائے دلِ مضطر نے ہوں سیماب کے ڈھنگ

یہاں کی دولت پہ نہ گھمنڈ ایئو تو اے دل کیوں
ایک وطیرہ پہ نہیں عالمِ اسباب کے ڈھنگ

فرقتِ یار میں مژگاں کے یہاں پر نالے
رات دن صاف پڑے ٹپکے ہیں میزاب کے ڈھنگ

لائے گردش میں نہ کیوں اہلِ جہاں کو یہ چرخ
رات دن آپ ہے چکر میں یہ دولاب کے ڈھنگ

آ گئے رندوں کے گر ہاتھ تو تم سن لینا
شیخ صاحب کو بتا دیویں گے آداب کے ڈھنگ

شکوہ غیروں کا ہے اے عیش عبث کیا کہیے
اُن سے بدتر ہیں اگر دیکھیے احباب کے ڈھنگ

ے ل: وتیرہ

ل

(۱)

ہے خفا ہم سے گر تمھارا دل — پھیر دو ہم کو بس ہمارا دل
مان، آ اُن سے کر کنارا دل — اِن بتوں کا ہے سنگِ خارا دل
جس طرف اُس نے پھینکا تیرِ نگاہ — آئی آواز، اے وہ مارا دل
مدد اے آہ ضعف یہاں تک ہے — ڈھونڈتا ہے ترا سہارا دل
وہ اُچکا ڈرے ہے کس سے، مرا — لے گیا عالم آشکارا، دل
جو ہو آرامِ جاں بھلا اُس کی — کیونکہ فرقت کرے گوارا، دل
اُس طرف تو وہ[1] فوجِ غم کا ہجوم — اِس طرف ایک یہ بچارا دل
اُس کے بھرّے میں آ نہ پھنس جانا — دیکھنا دے ہے وہ بھپارا دل
کج کُلاہانِ حضرتِ دہلی — لے کے کب دیں ہیں ایک بارا دل

عیشؔ، دیکھ اُس سے تو نہ لگ چلنا
ہے تجھے اپنا گر پیارا دل

(۲)

جاؤں نہ کیونکر کوچۂ جاناں میں سر کے بل — یاد آئے ہیں اجی مجھے اُس کی کمر کے بل
شاید اثر ہوا دلِ جاناں میں آہ کا — کچھ بے سبب نہیں ہیں یہ دردِ جگر کے بل
کہہ دوں اگر میں جنبشِ ابروے یار کو — اک دم میں سب نکال دے تیغ و سپر کے بل

---

[1] ک : ہے

کل یادِ شام زلف میں بس دل کی آگ سے — مثلِ چراغ داغ اُٹھے سب جگر کے بل
کیا زلف یار سے کہیں منھ بھیڑ ہو گئی — ڈھیلے ہیں جو یہ موجِ نسیمِ سحر کے بل
گلشن میں اس کو دیکھ کے سنبل نے یہ کہا — لونڈی غلام ہیں تری زلفوں کے گھر کے بل
روشن دلوں کے ربط سے آتی ہے راستی — صاف اس لیے ہیں رشتۂ سلکِ گہر کے بل
بل دے رہے ہیں رشتۂ جاں کو پڑے ہوئے — زلف وجبین وابروے موے کمر کے بل
دشمن تو مال کیا ہے، کسی روز دیکھنا — تکلے کی طرح نکلیں گے اُس کے پدر کے بل

کچھ زور و زر نہیں ہے یہاں سارے کام عیش!
کرتے ہیں ہم تو خالقِ جن و بشر کے بل[1]

(۳)

گل چیں نے صبح دم جو چمن میں اٹھائے گل — بلبل نے مونھ کو پیٹ لیا کہہ کے ہائے گل
فصلِ خزاں کو آگ لگے کیا ستم کیا — آنے لگے ہیں خار نظر اب بجائے گل
روتی پھرے ہے اب جو نصیبوں کو عندلیب — پہلے ہوئی تھی سوچ کے کیا آشنائے گل
بلبل کرے ہے فصلِ بہاری میں یہ دعا — یا رب چمن میں یوں ہی سدا دندنائے گل
اعجازِ گل سے دور نہیں، دم میں جی اٹھے — گر عندلیبِ مردہ کو کوئی سنگھائے گل
لگتی ہے عندلیب بہت گل کے کان سے[2] — ایسا نہ ہو کہیں اسے سیدھی سنائے گل
روکے سے تیرے رک نہیں سکنے کے باغباں! — سو جان سے ہے[3] بلبلِ شیدا فدائے گل
کہتی تھی عندلیب، تو کس منھ سے بادنما — کی ہے جو گل نے تجھ سے یہی ہے وفائے گل
دیکھا ہو جب وہ جلوۂ رخسار اُس نے آہ — بلبل کے کہیے کیونکہ نظر میں سمائے گل
بلبل سی جاں نثار کو رُلوائے رات دن — اس بات میں تو راست نہیں کچھ ہے رائے گل

---

[1] مقطع ل میں نہیں ہے

[2] ک : سر

[3] ل : میں

اے باغباں سنا رُخِ جاناں وہ ہے جسے — بلبل کی طرح دیکھتے ہی بلبلائے گُل
بس انقباضِ خاطر و پژمردگیِ طبع — اک ابتدائے گل ہے اور اک انتہائے گل
اے عندلیب نالہ نہ کر بد دماغ سا — بیٹھا چمن میں آج ہے کچھ منھ بنائے گل
ان بلبلوں کے کیسے سناتے ہیں چہچہے — وہ دن خدا کرے کہ چمن میں پھر آئے گل
بلبل کا ان دنوں میں فلک پر دماغ ہے — کیا حال ہو جو اس کو کبھی منھ لگائے گل
یہ کام عندلیب کا ہے مر ہی جائے گی — تو اے صبا نہ کھولیو بندِ قبائے گل

رکھتی ہو گل کو جاں سے جب اپنی عزیز تر
بلبل کے دل میں کیونکہ نہ ہو عیش جائے گل

(۴)

زیب دیتے ہیں جو تیری کان کی بالی میں پھول
خوشنما ہوتے نہیں ویسے کبھی ڈالی میں پھول

کیا لگا کر چشمِ فتّاں جھانکتی ہے کوئی پری
یا یہ نرگس کے کہیں برقع کی ہے جالی میں پھول

چشمِ تر سے اشک کی جا لختِ دل جھڑنے لگے
واہ کیا ارزاں ہوئے ہیں اس گراں سالی میں پھول

صبحدم سونگھے تو سارے عطر آگیں ہو گئے
باندھ رکھے شب جو اس نے اپنی رومالی میں پھول

کیا ہی کیفیت ہوئی ساقیِ گل اندام نے
دے دیا بھر کے مے گلگوں کی جب پیالی میں پھول

سبزۂ خط میں رخِ گلگوں جو دیتا ہے بہار
لطف ایسا دے ہے کب گلشن کی ہریالی میں پھول

باغ میں جب سے گیا وہ غنچہ لب، اے ہمدمو!
دیکھتا حیرت سے ہے، اس لب کی ہاں لالی میں پھول

تھی وصیت سب سے اس ناکامِ الفت کی یہی
میں کبھی مر جاؤں لیکن کیجیو خالی میں پھول

رند سب کہتے ہیں ہاں کھا کھا کے لقمے چرب چرب
کیا گدھا سا ہو گیا ہے[1] شیخ خوش حالی میں[2] پھول

لشکرِ فصلِ بہاری نے، دیئے بلبل کو، عیش!
آئے تھے فوجِ خزاں کی جو کہ پامالی میں پھول

(۵)

اک تو اُس شوخ کے ہے سامنے جانا مشکل
اور جو پہنچے[3] بھی تو ہے حال سنانا مشکل

عرضِ حالِ دلِ شیدا کوئی وہاں کیونکر کرے
ہو جہاں بات تو کیا ہونٹ ہلانا مشکل

جائے کوچے سے ترے کیونکہ یہ[4] افتادہ، جسے
ہو وے یوں نقشِ قدم پاؤں اٹھانا مشکل

کیونکہ پہنچائے[5] وہ اُس تک کہو حرفِ مطلب
دل سے لب تک جسے ہو بات کا لانا مشکل

زلف کو مکھڑے پہ کیوں دیتے ہو تکلیف عبث
مرغِ دل کا ہے مرے دام میں لانا مشکل

چشم و لب میں ترے اعجاز وہ ہیں کہ نہیں
قتل کر ڈالنا اور اُن کو جلانا مشکل

کوچۂ یار میں جاتے تو ہو تم حضرتِ دل
ہو گا پر آپ کو وہاں جا کے پھر آنا مشکل

---

[1] ل : کیا گدھا سا بن گیا ہے
[2] ل : میں
[3] ک : ہیں
[4] ک : بھیجے
[5] ک : وہ
[6] ک : لے جائے

قدۂ دل مرا کھولے تو بھلا کام بھی ہے — غنچۂ گل کا صبا کیا ہے کھلانا مشکل
غ کے سامنے آنا تو ہے آسان، مگر — بننا اس تیرِ مژہ کا ہے نشانا مشکل
ں سے نکلے مرے کس طرح تصوّر تیرا — دلنشیں بات کا دل سے ہے اٹھانا مشکل

بات بن آئے تو ہیں سارے مطالب آساں
ہے مگر بات ہی کا عیش! بنانا مشکل

(۶)

ل چیں یہ نہ ہو کیونکہ عتابِ گل و بلبل — کمبخت ہے[1] وہ خانہ خرابِ گل و بلبل
ے فصلِ بہار اور شبابِ گل و بلبل — شبنم نہ بنے کیونکہ شرابِ گل و بلبل
یہ سے صبا اُن کے چلے بچ کے نہ کیوں کر — ہیں ذاتِ شریف ایک جنابِ گل و بلبل
شق کے نیرنگ ہیں سب، سنتے ہو، ورنہ — ظاہر میں نہیں کوئی حجابِ گل و بلبل
ا تو بتا دے مجھے تو، اے فلکِ پیر! — جائے گا یوں ہی مفت شبابِ گل و بلبل

اُن دونوں کے دل جانتے ہوئیں گے، صبا تک
معلوم نہیں عیش حسابِ گل و بلبل

(۷)

ے بادشاہ کون و مکاں، اے[2] خدائے دل — جانے ہے کون تیرے سوا ماجرائے دل
بنے کرم پہ کیجیو نظر اے مرے خدا — کیجیو نگاہ تو نہ شہا بہ خطائے دل
مصقلہ کو فیض کے فرمائے کام تو — بہتر ہو آئینے کی صفا سے صفائے دل
ل شریف ہے یہ گرہ در گرہ، مگر — کھولے نسیم فیض تری عقدہ ہائے دل
یشے کو دل کے ٹھیس لگی گر صبا، تو بس — ٹھہرے گی جا کے عرش کے نیچے صدائے دل

دے زاہدانِ خشک کو، اے عیش، یہ خبر
بہتر ہے طوفِ کعبہ سے طوفِ بنائے دل

---

[1] ک : وہ ہے

[2] ل : اے فدائے دل

(۸)

چین کرتے تھے[1] تہ خاک کس آرام سے گل — یہاں کے رنجوں کے تو واقف بھی[2] نہ تھے نام سے گل

اس کا باعث نہیں معلوم صبا کہہ تو سہی — بدمزا رہتا ہے کیوں بلبلِ ناکام سے گل

عندلیب اس لیے مکیش اسے رکھتے ہیں عزیز — چشم بددور مشابہ ہے بہت جام سے گل

پر تو اُس میں رخِ یار کا کہتے ہیں کہ ہے — گلشنِ دہر میں بکتا ہے اسی نام سے گل

بلبلو یوں ہی وہ گلشن میں ہوا باندھتے ہیں — دیکھیں گلرو کو تو جاتے ہیں سب کام سے گل

اُس میں اے عیش کہاں پایئے وہ رنگ وہ بو
ہووے شرمندہ نہ کیوں تیرے[3] گل اندام سے گل

---

[1] ک: میں

[2] ک: ہی

[3] ل: تیرے

م

(۱)

ترے فراق میں اے شوخ، جاں بلب ہیں ہم — اٹھاتے کیا کہیں کیا رنج اور تعب ہیں ہم
خیالِ زلف و رخِ یار، دل سے دور نہ ہو — دعائیں مانگتے بس یہ ہی روز و شب ہیں ہم
اب ان کو کیا کہیں، ہوتے ہیں اور بھی وہ خفا — جو پوچھتے خفگی کا کبھی سبب ہیں ہم
کھُبا[۱] ہے دل میں کچھ ایسا ہی وہ کہ جی غش ہے — وگرنہ یار بناتے کسی کو کب ہیں ہم
عوض میں پاتے ہیں دشنام اس کی یا قسمت[۲] — جو ایک بوسہ بھی کرتے کبھی طلب ہیں ہم
حصولِ مطلبِ دل آہ ہو نہیں سکتا — لگاتے یار سے لاکھوں طرح کے ڈھب ہیں ہم
خدا کے واسطے ناصح کسی کا دل نہ دکھا — چل اپنی راہ لے، کرتے ترا ادب ہیں ہم
نہ چھیڑنا ہمیں بادِ صبا کبھی، تو جان — جو چھیڑ بیٹھے تو چھیڑے پہ بس غضب ہیں ہم

صفائیِ دلِ آشفتہ کی بدولت، عیش!
جہاں میں نامِ خدا خسرو طلب[۳] ہیں ہم

(۲)

کچھ کم نہیں ہیں شمع سے، دل کی لگن میں ہم
فانوس میں وہ جلتی ہے، یہاں پیرہن میں ہم
ہیں تفتہ جاں مفارقتِ گل بدن میں ہم
ایسا نہ ہو کہ آگ لگا دیں چمن میں ہم
گم ہوں گے بوئے زلفِ شکن در شکن میں ہم
قبضہ کریں گے چین کو لے کر ختن میں ہم

۱؎ ل : کہا
۲؎ ل : قیمت
۳؎ ک : قلب

گریہ ہی چھیڑ دستِ جنوں کی رہی، تو بس
مر کر بھی سینہ چاک کریں گے کفن میں ہم

محوِ خیال زلفِ بتاں عمر بھر رہے
مشہور کیوں نہ ہوں کہو دیوانہ پن میں ہم

ہونگے عزیزِ خلق کی نظروں میں، دیکھنا
گر کر بھی اپنے یار کے چاہِ ذقن میں ہم

چھکّے ہی چھوٹ جائیں گے غیروں کے دیکھنا
آنکلے ہاں کبھی جو تری انجمن میں ہم

اے عندلیب، دعویٔ بے ہودہ پر کہیں
ایک آدھ گل کا منھ نہ مَسل دیں چمن میں ہم

عاشق ہوئے ہیں پردہ نشیں پر بس اس لیے
رکھتے ہیں سوزِ عشق نہاں جان و تن میں ہم

ظالم کی سچ مثل ہے کہ رسی دراز ہے
مصداق اُس کا پاتے ہیں چرخِ کہن میں ہم

عنقا کا عیش نام تو ہے، گو نشاں نہیں
یہاں وہ بھی کھو چکے ہیں تلاشِ دہن میں ہم

(۳)

دُو بدو ہو دیں اگر اس فلکِ پیر سے ہم
دیں بکھیر اس کے دھوئیں نالۂ شبگیر سے ہم

جستجو میں تری غافل نہیں تدبیر سے ہم
آہ پر کیا کریں لاچار ہیں تقدیر سے ہم

رشکِ صد خضر ہو جب کشتہ ترا اے قاتل!
کیوں گلا اپنا نہ رگڑیں تری شمشیر سے ہم

ڈھب کوئی یار سے ملنے کا نکلتا نہیں، آہ
مشورہ کرتے ہیں ہر روز دلِ دلگیر سے ہم

خاک واعظ! ترے منھ ہیں وہ خدا دن نہ کرے
بدلیں جو خاکِ در یار کو اکسیر سے ہم

ناصحا! تو مجھے آ آ کے جو دم دیتا ہے
یہ تو کہہ کیا نہیں واقف تری تزویر سے ہم

کیا عداوت ہے[1] خدا جانے کہ کل ساری رات / کشتیاں شمع کی سنتے رہے گلگیر سے ہم
غیر جلاّد ہے، ہرگز نہ رکے، چھٹتے ہی / کوچۂ یار میں سیدھے گئے ہاں تیر سے ہم
گر تصوّر نہیں اُس آئینہ رُو کا ہمیں، آہ / منھ کو کیوں تکتے ہیں بیٹھے ہوئے تصویر سے ہم
اختلاط آپ کے غیروں ہی سے پائے صاحب! ق / بھولے بھٹکے کبھی آ نکلے جو تقدیر سے ہم
سو وہ مکراتے ہو اور آنکھوں میں گم کرتے ہو / ہوں گے کب عہدہ برآ آپ کی تقریر سے ہم

کیوں چھپاتا ہے غم دل ترا یہاں پہلے ہی
عیش پہچان گئے رنگ کی تغیّر سے ہم

(۴)

دعاے بد جو کسی دل جلے کی لوگے تم / تو لکھ رکھو اسے، سرسبز ہاں[2] نہ ہوگے تم
یہ بات حق میں تمھارے زبوں ہے یاد رہے / ہنسائے جاؤ گے، گر اور پر ہنسوگے تم
ڈرو خدا سے نہیں خوب اتنی لاف زنی / کہوگے کس کو رہے جب نہ کہنے جوگے تم
جلاؤ گے جو تم عاشق کو مثلِ پروانہ / تو خود بھی شمع کی مانند ہاں جلوگے تم
تمھیں خبر نہیں گنبد کی یہ تو ہے آواز / کہوگے جیسی میاں، ویسی ہی سنوگے تم
جو دل ہوا کسی گرمیِ حسن کا مائل / تو دیکھو ٹھنڈی ہی سانسیں سدا بھروگے تم
تمھارے پاس سوا اس کے کیا ہے دینے کو / کسی کو دوگے تو بس گالیاں ہی دوگے تم

یا دل آہ گر ان کافروں کو عیش، تو بس
نہیں[3] سہیں کبھی جن کی، سنا، سہوگے تم

(۵)[4]

گو کہ واقف نہ تھے پوشیدہ ترے راز سے ہم
لیک سب تاڑ گئے بات کے انداز سے ہم

---

۱ ک: تھی
۲ ک: بھی
۳ ل: سہیں نہیں
۴ غزل ۵ و ۶ ل میں موجود نہیں

دلِ شیدا کو بچائیں تو بچائیں کیوں کر
عقل حیران ہے اس کی نگہِ باز سے ہم

اس میں اندازِ جفا ملتے ہیں تیرے، ورنہ
اب سمجھ لیں فلکِ شعبدہ پرداز سے ہم

جو فرشتے کی نہ سنتا ہو، بتاؤ تو سہی
حالِ دل کیونکہ کہیں اس بتِ طناز سے ہم

خانۂ غیر کو جاتا تھا وہ شب مایۂ ناز
گئے پہچان، وے پاؤں کی آواز سے ہم

آج جو عشق میں ہے عیشؔ سو یہ پہلے ہی
جانتے تھے دلِ بیتاب کے انداز سے ہم

(۶)

طلب کریں گے نہ اس طرح سفلہ خو سے ہم
اب ہاتھ اٹھائیں گے دل ہی کی آرزو سے ہم

عبث چھپاتا ہے جو کچھ کہ دل میں ہے تیرے
وہ پا گئے ہیں تری طرزِ گفتگو سے ہم

ہماری اس کی بتاؤ بنے تو کیونکہ بنے
وہ اپنی خو سے ہے لاچار، اپنی خو سے ہم

بجان آئے ہیں اے چرخ کچھ بھی غیرت ہے
فریب و مکر و دغا بازیٔ عدو سے ہم

نہ کیوں ہو ہم کو پریشان طبیعتی مطبوع
لگا کے رکھتے ہیں اس زلفِ مشکبو سے ہم

یہی دعا ہے کہ ہو عافیت بخیر وہاں
اور اس جہاں میں رہیں یا رب آبرو سے ہم

رقیب کرتے ہیں باتیں سب اس کی بزم میں عیشؔ
بس ایک ہوتے ہی وہاں سرمہ در گلو سے ہم

ن

(۱)

ایسی صاحب نہ کیا کیجیے چھل کی باتیں — بھاری بھر کم ہو، یہ چھوڑ دو ہلکی باتیں
آج دل لینے کو پھر ہم سے لگاوٹ ہے وہی — یاد کیجیے تو ذرا دل میں وہ کل کی باتیں
ایک ہو وے تو کوئی کہوے اُسے لغو ہے یہ — ایسی ہی ہوتی ہیں سب اہلِ دغل کی باتیں
روبرو اُس لبِ شیریں کے پڑے سب پھیکے — بس نبات و شکر و قند و عسل کی باتیں
ہم کہے دیتے ہیں صاف آپ سے، اے حضرتِ عیشؔ!
آپ ہم سے نہ کیا کیجیے بل کی باتیں

(۲)

کرکے ویران ہوا آباد ہے کون — رکھ کے ناشاد، ہوا شاد ہے کون
سنتا اس کوچے میں اے حضرتِ دل! — ہم سے بے چاروں کی فریاد ہے کون
مجھ سوا، اور نہ تمھارا شب و روز — ہدفِ ناوکِ بیداد ہے کون
دشتِ وحشت میں ہمارے آگے — قیس کیا مال ہے، فرہاد ہے کون
دام میں لائے ہے آب و دانہ — یوں ہی بدنام ہے، صیاد ہے کون
جو کیا اس نے ستم، خوب کیا — قطعہ — اُس کا یہاں شاکیِ بیداد ہے کون
پر یہ غم ہے کہ نہ پوچھا اس نے — ہو گیا عشق میں برباد ہے کون
عشق میں سرو قدوں کے، اے عیشؔ!
ہم سا فرماؤ تو، آزاد ہے کون

(۳)

مجھ کو یارا ے عرضِ حال نہیں
اور اس کو مرا خیال نہیں

گو زباں ہے یہ شمع کی مانند
بات کرنے کی وہاں مجال نہیں

سامنے اس لعلِ لب کے لعل
ہم نے دیکھا تو کچھ بھی مال نہیں

دم میں اس کے کہیں نہ آجانا
کیوں وہ دل نے کے پھر دوال نہیں

یادِ حسنِ ملیح یار میں عیش
کون کہتا ہے مے حلال نہیں

(۴)

اس در پہ جبہہ سائی کی جو آرزو کریں
لازم ہے پہلے خونِ جگر سے وضو کریں

ہو کر خفا وہ لاکھ کڑی گفتگو کریں
پر یہ نہیں مجال جو ہم تم سے تو کریں

ہم قصدِ میکشی اگر اے شعلہ خو کریں
خالی بس ایک دم میں سبو کے سبو کریں

جاتا ہے ساتھ جان کے واعظ بتوں کا عشق
ہم کیونکہ ترکِ عشقِ بتِ خوبرو کریں

دنیا میں آکے ہم نفسِ چند کے لیے
اس چرخِ دوں سے کیا طلب آرزو کریں

خاطر ہو اک جہاں کی پریشاں ابھی اگر
ہم وصفِ زلفِ یار بیاں مو بمو کریں

گر ایک ہو تو رو دیئے ہم تجھ سے ہم نشیں!
جورِ فلک بیاں کہ جفاے عدو کریں

جو دل پھٹا ہو ہاتھ سے بیدادِ یار کے
اس چاکِ دل کو کیونکہ رفو گر رفو کریں

کب چھوٹتا ہے دامنِ خاطر سے داغِ عشق
اے عیش ہزار اسے شست و شو کریں

(۵)

کس کو ملنے کا اس کے چاؤ نہیں
کس کو اس شوخ سے لگاؤ نہیں

کون سا دل ہے وہ کہ جس دل میں
اس کے تیرِ نگہ کا گھاؤ نہیں

مصحفِ رخ پہ کیونکہ ٹھہرے نظر
اس میں مطلق کوئی رہاؤ نہیں

دل تھا اپنا دیا جسے چاہا
کچھ کسی کا ہمیں دباؤ نہیں

اہلِ غیرت کو نانِ خشک اپنی
بخدا کچھ کم از پلاؤ نہیں

بس کہا مانو، آؤ، حضرتِ دل — جھوٹے وعدوں پہ اس کے جاؤ نہیں
قول ہے اہلِ تجربہ کا یہی — آزمائے کو آزماؤ نہیں
آتشِ غم میں تیری فرقت نے — دل کو کس دن دیا تپاؤ نہیں

اس کے رُخ کی وہ آب و تاب ہے عیشؔ!
مہ و خورشید جس کے پاؤ نہیں

(۶)

میری اور اُس کی جو رستے میں گئیں مل آنکھیں
لے گئیں مجھ سے مرا چھین کے وہ دل آنکھیں
شوقِ نظارہ میں وا تھیں دمِ بسمل آنکھیں
نہ ہوئیں بند تکا کیں سوئے قاتل آنکھیں
دل کو معشوق پہ کرواتی ہیں مائل آنکھیں
جاں پہ سب کرتی بلائیں ہیں یہ نازل آنکھیں
دے کے دل، پڑ گئے ہیں جان کے لالے اب تو
کیونکہ دل لے کے رہی ہیں وہ سنابل آنکھیں
دیکھتے دیکھتے ان آنکھوں کے اُس نے سب کے
دل لیے چھین، لڑا کر سرِ محفل آنکھیں

عیشؔ کس منھ سے بتا نرگس و آئینہ و ماہ
لائیں اُس دیدۂ حیراں کے مقابل آنکھیں

(۷)

جان ہم اپنی دیے بیٹھے ہیں — سر ہتھیلی پہ لیے بیٹھے ہیں
بول سکتے نہیں اُس کے ڈر سے — ہونٹھ[2] ہم اپنے سیے بیٹھے ہیں

---

۱ ک : اِس
۲ ک : ہونٹ

مئے وہ گر غیروں میں پیتے ہیں پیئیں — ہم بھی خون اپنا پیے بیٹھے ہیں
دے کے دل، اس بتِ بے مہر کو ہم — ہاتھ پر ہاتھ دیے بیٹھے ہیں
عیشؔ ہم کوچۂ قاتل میں فقط
سر فروشی کے لیے بیٹھے ہیں

(۸)

ہے بھلا زیرِ فلک کون جو چکّر میں نہیں — کچھ مزا رہنے کا اس گنبدِ بیدر میں نہیں
جس کے جھیلے ہیں ستم ہم نے ستم کا اس کے — ایک شمّہ بھی تو اس چرخِ ستم گر میں نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے تھے مسیحا زندہ — کیا یہ اعجاز مرے یار کی ٹھوکر میں نہیں
ظلم سے ہاتھ اٹھا اب نہیں ہو گا بد نام — کیوں وہ اب طاقتِ ضبط اس دل مضطر میں
کیا کہوں تجھ سے میں، اس لب کی نزاکت بلبل! — جو کہ اس لب میں ہے، سو برگِ گل تر میں نہیں
اعتبار اُس کے ہو کیا قول و قسم پر جو شخص — ابھی دم بھر میں کہے ہاں ابھی دم بھر میں نہیں
نامۂ غم کو مرے دیکھ، کبوتر نے کہا — اس کو لے جاؤں یہ طاقت مرے شہپر میں نہیں
تیرے سودا زدہ عشق کا افسانۂ غم — کون سا گھر ہے وہ عالم میں کہ جس گھر میں نہیں
رنگ و بو اس کے رخ و زلف میں جو ہے وہ صبا! — مشک میں عطر میں، عنبر میں، گلِ تر میں نہیں
کیوں ڈراتے ہو مجھے سنگ دلی سے اُس کی — کیا اثر کرتے یہ نالے مرے پتھر میں نہیں
کس طرح ہووے بھلا عیشؔ بتا وہ حاصل
جو لکھا کاتبِ قدرت نے مقدّر میں نہیں

(۹)

دوست جب دل سا آشنا ہی نہیں — اب ہمیں غیر کا گلا ہی نہیں
جس کا دل درد آشنا ہی نہیں — اس کے جینے کا کچھ مزا ہی نہیں
ایک دم ہم سے وہ جدا ہی نہیں — گر جدا ہو تو وہ خدا ہی نہیں
آشنائی پہ اُس کی مت جانا — لے کے دل پھر وہ آشنا ہی نہیں

ہے ک: بات جو اس میں (رہے)

خاک چھانی جہان کی، لیکن — دلِ گم گشتہ کا پتا ہی نہیں
لاکھ معشوق ہیں جہاں میں مگر — آہ وہ ناز، وہ ادا ہی نہیں
سعیِ بے فائدہ ہے چارہ گرو! — مرضِ عشق کی دوا ہی نہیں
دردِ دل اُن سے ہم کہا ہی کیے — پر انھوں نے کبھی سُنا ہی نہیں
سر پھراتا ہے کیوں عبث ناصح! — میرا کہنے میں دل رہا ہی نہیں
اب وہ آئے، تو آئیں، کیا حاصل — طاقتِ عرضِ مدعا ہی نہیں

میں تو کیا گوشِ چرخ نے بھی عیشؔ
ایسا بیداد گر سُنا ہی نہیں

(۱۰)

بُری ہی کرتے ہیں ہر چند خوبرو باتیں — مگر نہ ایسی کہ کرتا ہے جیسی تو باتیں
نصیب ایسے کہاں ہیں جو بیٹھ کر تنہا — کروں میں اُن سے جو ہیں دل میں آرزو باتیں
ہم اُن سے کرتے ہیں سب راستی کی باتیں پر — وہ ہم سے کرتا ہے ٹیڑھی ہی جنگجو باتیں
کہیں تو جب کہ جو ہو کچھ بھی بات کا سر پاؤں — عجیب کرتا ہے وہ شوخِ تند خو باتیں
خبر بھی ہے تمھیں سنوار رہا ہے کس کس کی — تمھارے عشق میں یہ چرخِ نیلگوں باتیں
عیاں ہے سب نہیں حاجت بیاں کی کچھ اُن کے — بھری ہیں کانوں میں جا جا کے جو عدو باتیں

ہوا خطوں میں جواب و سوال عیشؔ تو کیا
مزا یہ جب ہے کہ ہوں ان سے دُوبدُو باتیں

(۱۱)

کبھی سنی نہ میری آہ اس نے دو باتیں — رہیں بھری مرے دل میں بھری تھیں جو باتیں
گیا تھا میں تو انھیں دردِ دل سنانے کو — لگے سنانے وہ الٹی مجھی کو، لو، باتیں
یہ پند اوروں کو دو جا کے حضرتِ ناصح! — یہاں تو یار کے ملنے کی کچھ کرو باتیں
وہ باتیں کرتے ہیں ایسی کہ میں تو کیا اُن کی — جو تم بھی سُن لو تو بس سُن کے تم ہنسو باتیں
زیادہ بڑھتی ہے باتوں ہی سے کدورتِ دل — بہے یہ ہی دیں ہیں کدورت کی دل سے دھو باتیں
بلا مبالغہ ہے تیرے تفتہ جانوں کی — جو سُن لے شمع تو دے وہ بھی سن کے رو باتیں

صریح غیروں سے ملتے ہو اور مکرتے ہو — بنا نی آتی ہیں کیا خوب آپ کو باتیں

کہا یہ دل نے بے شکوہ عبث ہوئیں سو ہوئیں — نہ منھ پہ لاؤ وہ جانے دو بس چلو باتیں

سنے وہ یا نہ سنے، عیش، ہو سو ہو لیکن

تم اپنے دردِ غمِ دل کی کہیو دو باتیں

(۱۲)

حال اپنا تفتہ جاں ہوں کیا کہوں — جل رہا چپ شمع ساں ہوں کیا کہوں

شمع ساں ہر چند رکھتا ہوں زباں — اس پہ بھی پھرتی زباں ہوں کیا کہوں

ہوں میں اس جانِ جہاں کا مبتلا — اس سے محسودِ جہاں ہوں کیا کہوں

سینۂ سوزاں میں رکھتا، ایک ایک — نالہ وہ آتش فشاں ہوں، کیا کہوں

ناخنوں میں جس کے ہیں بیداد چرخ — اس کا وقفِ امتحاں ہوں کیا کہوں

ضعف سے کروٹ بھی لے سکتا نہیں — اس قدر میں ناتواں ہوں کیا کہوں

میں ہوں مثلِ معنیٔ الفاظ، آپ — اپنے غم کی داستاں ہوں کیا کہوں

شمع جلتی ہے مری سُن بول چال — ہاں میں وہ آتشِ زباں ہوں کیا کہوں

ضبطِ دل مانع ہے ورنہ مثلِ نے — میں وہ لبریزِ فغاں ہوں کیا کہوں

عیش، میں اس چرخِ کج رفتار کو

کشتۂ جورِ بتاں ہوں کیا کہوں

(۱۳)

تم سوا ہم کہیں تو کس سے کہیں — قصۂ غم کہیں، تو کس سے کہیں

غم فرقت سے جان میں باقی — نہیں ہے دم کہیں تو کس سے کہیں

دیکھ کر اس پری کو ہوش و حواس — کر گئے رم کہیں تو کس سے کہیں

سن پریشانیوں کو زلف تری — ہوئی برہم کہیں تو کس سے کہیں

عیش، جب دردِ دل سے اپنے کوئی

نہیں محرم، کہیں تو کس سے کہیں

(۱۴)

لے کے دل جب وہ نگاہیں دشمنِ جاں ہوگئیں
سن کے یہ افسانہ عقلیں سب کی حیراں ہوگئیں

گر نہیں دستِ جنوں کو لاگ، ہاں تجھ سے تو پھر
دھجیاں کیوں تیری اے جیب و گریباں، ہوگئیں

عشق میں اُس آفتِ جاں کے نہ پوچھو، ہمدمو!
حسرتیں کیا کیا مرے آ، دل میں مہماں ہوگئیں

کیا غضب ہے دیکھنا شورابِ اُلفت کا اثر
بوٹیاں خوں ہو کے دل کی صرفِ مژگاں ہوگئیں

ت کو مجلس میں غیروں سے بتاؤ تو سہی
آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں، کیا مری جاں ہوگئیں

بخیاں اک پل میں جھڑ جائیں گی ہاں آنکھیں مری
گر کبھی تجھ سے دوچار، اے ابرِ نیساں، ہوگئیں

یکھ کر حالِ پریشاں اُس پریشاں حال کا
منھ پہ معشوقوں کی[1] زلفیں بھی پریشاں ہوگئیں

جائیاں عشّاق کے داغوں سے فرقت کی سنا
اے صبا، رشکِ پرِ طاؤسِ بستاں ہوگئیں

عاشقوں کو چاہیے کیا راہِ الفت میں انھیں
بے سرو سامانیاں ہی ساز و ساماں ہوگئیں

آہیں گو ہم دل جلوں کی بے اثر تھیں، اس پہ بھی
باعثِ گرمیِ بازارِ حسیناں ہوگئیں

---

[1] ک: کے

عیشؔ کہنے کو تو اک دل تھا، و لے اس دل کے ساتھ
حسرتیں سب پائمالِ نازِ خوباں ہو گئیں

(۱۵)

میرا شکوہ تری محفل میں عدو کرتے ہیں
اس پہ بھی صبر ہم، اے عربدہ جو کرتے ہیں

مشقِ بیداد و ستم کرتے ہیں گر وہ، تو یہاں
ہم بھی بیداد و ستم سہنے کی خو کرتے ہیں

جاں ہوئی ہے نگہِ ناز پہ اُن کی عاشق
چاکِ دل، تارِ نظر سے جو رفو کرتے ہیں

بے ثباتیِ چمنِ دہر کی ہے جن پہ کھلی
ہوسِ رنگ، نہ وہ خواہشِ بو کرتے ہیں

ہے رچی جن کے دماغوں میں تری زلف کی بو
عنبر و مشک کی کب بو کو، وہ بو کرتے ہیں

آج شمشیر بکف نکلے ہیں وہ، دیکھیے تر
آبِ شمشیر سے کس کس کے گلو کرتے ہیں

مشک و عنبر کا انھیں نام بھی لینا ہے ننگ
یار کی زلفِ معنبر کو جو بو کرتے ہیں

چاک کرتے ہیں گریبان کو وحشت میں کبھی
چاکِ دل میں کبھو ناخن کو فرو کرتے ہیں

دیکھ سودا زدۂ الفتِ خوباں اے عیشؔ!
وادیِ عشق میں کیا کیا تگ و پو کرتے ہیں

(۱۶)

کیا اک خلق کو پامال انداز اس کو کہتے ہیں ہزاروں مر گئے پوچھا نہیں ناز اسکو کہتے ہیں

زاروں شعبدے دن رات میں تازے اٹھائے ہے[1]
اٹھائے کیوں نہ چرخِ شعبدہ باز اُس کو کہتے ہیں

چھوڑا اس نگاہ و پنجۂ مژگاں نے مرغِ دل
اسے کہتے ہیں باز اور چنگل باز اُس کو کہتے ہیں

را دیکھو تو دم دے دے کے دل لاکھوں کیے غارت
بہت قصّے سنے تھے لیک دم باز اُس کو کہتے ہیں

ہدلے پا کسی کی عندلیبو! دل کو کھینچے ہے
تمھارا نغمہ کیا ہے، دلکش آواز اُس کو کہتے ہیں

کافر، جان و دل، نیم نگہ میں چھین لیتا ہے
یہ کیا جادو ہے یلا اُس کو فسوں ساز اُس کو کہتے ہیں

غلط دعوے ہیں سب جاں بازیوں کے عیش، یاروں کو
نظر کر جانبِ پروانہ، جانباز اس کو کہتے ہیں

(۱۷)

سے نالے، خوں کے فوّارے جگر سے آئے ہیں
حضرتِ غم دیکھنا کس شور و شر سے آئے ہیں

چھیڑ دے پھر ہاں ذرا او کاوشِ مژگانِ یار!
زخمِ دل اپنے سنا کچھ آج بھر سے آئے ہیں[2]

رنگ زرد ہو باختہ، چھکّے سے ہیں چھوٹے ہوئے
آپ گھبرائے ہوئے ایسے کدھر سے آئے ہیں

ہم کو دھمکاتے ہو کیا، جوں شمع پہلے ہی یہاں
ہاتھ اٹھا کر ہم تری محفل میں سر سے آئے ہیں

۱؎ ک. ہیں
۲؎ ک: زخمِ دل کچھ کچھ ہمارے

گر نہیں در پہ دہ کاوش اُس کی مژگاں کو تو پھر
آج کیوں ٹکڑے جگر کے چشمِ تر سے آئے ہیں
اُس کی کل مجلس میں ہم بھی، دیکھنا اے ہمدمو!
دے کے دم درباں کو اُس کے کس ہنر سے آئے ہیں
دم میں واعظ کے نہ آنا عیشؔ، تو بھی یاد رکھ
بات یہ لکھتے ہوئے سب آبِ زر سے آئے ہیں

(۱۸)

رکھتا دل اُس کا کر کے میں تسخیر ہات میں
ہوتا جو میرے خامۂ تقدیر ہات میں
رکھیں نہ کیوں سر، عاشقِ دلگیر ہات میں
نکلا ہے آج لے کے وہ شمشیر ہات میں
کرنے سے قتل میرے، بتا تو سہی، بھلا
کیا آیا تیرے، او بتِ بے پیر، ہات میں
اس غنچہ لب کا گر میں لکھوں وصفِ رخ تو بس
خامہ ہو گلفشاں، دمِ تحریر، ہات میں
یہاں تک ہوں ناتواں مری تصویر گر کوئی
لیوے اٹھا تو رنگ ہو تغییر ہات میں
وہ بے وقوف ہیں جو لکیروں کو ہات بیچ
کہتے ہیں ہے نوشتۂ تقدیر ہات میں
وہ تفتہ جاں ہوں گر کوئی کھینچے مری شبیہ
ہو جل کے خاک خامۂ تصویر ہات میں

ل : کی

آہن کو موم، حضرت داؤد نے کیا
اللہ نے دی تھی اُن کے یہ تاثیر ہات میں
بتلاتا تجھ کو تیری درازی شبِ فراق
آجاتی گر وہ زلفِ گرہ گیر ہات میں
قسمت درست ہووے تو اے عیشؔ، یاد رکھ
بن جائے آ کے خاک بھی اکسیر ہات میں

(۱۹)

وہ اگر آوے، تو یہاں تک آج تیاری کروں
پہلے دل صدقے کروں پھر جان کو واری کروں
وہ خماری انکھڑیاں دیکھے تو زاہد بھی کہے
زہد و تقویٰ چھوڑ دوں ہے جی میں میخواری کروں[1]
مجھ کو اے ضبطِ فغاں، اتنی بھلا رخصت تو دے
ایک دم اس کی گلی میں نالہ و زاری کروں
جس طرح تو نے جلایا ہے مجھے اے شعلہ رُو
تو بھی تجھ کو جلاؤں، اور سے یاری کروں
آپ کی چیتون کو میں پہچانتا ہوں، ہاں جی ہاں
تم نے ٹھانی ہے کہ بس دل لے کے عیّاری کروں
عشق میں دونوں پھنسے ہیں جان و دل اب میں بھلا
جان کو روؤں کہو، یا دل کی غم خواری کروں
ابرِ تر پر اپنے تو گھمنڈ ارہا ہے اے فلک!
کیوں بجا ہے شرط، میں بھی اشکِ خوں جاری کروں

---

[1] ک: جی میں ہے

وہاں تو ہیں ناز و ادا و عشوہ اور یہاں ایک دل
عیش کس کس کی میں اس پر ناز برداری کروں

(۲۰)

ہر چند ملا شمع نے کافور بدن میں
لیکن نہ ہوئی خاک بھی تخفیف جلن میں

ملتی ہوئی اس شوخ ستم گر کے چلن میں
کچھ بات جو پائی ہے تو اس چرخ کہن میں

ڈھونڈے نہ ملی نام کو اوروں کے بھبن میں
جو بات ہے ظالم ترے بے ساختہ پن میں

تدبیر بتا چارہ گر عشق کچھ ایسی!
آرام پڑے جس سے مرے دل کی کلن میں

چین پائے ابھی تیری درازی شب ہجراں
آجائے گر اس زلف معنبر کی شکن میں

یہ شمع کا اعجاز تو دیکھو کہ دم صبح
گل ہو کے رلانے لگی بلبل کو چمن میں

سمجھا نہیں اس زلف کی بو باس پہ جھگڑا
اک عمر سے عنبر میں ہے اور مشک ختن میں

قسمت کے جلوں کو کہیں آرام ہوا ہے
کیوں راکھ ملی شمع نے پروانے کے تن میں

نیرنگی عشق آہ نہ پوچھو کہ یہ کافر
دل لینے کو پھرتا ہے پڑا لاکھ برن میں

کچھ لکھ کے نہ رکھنا مری چھاتی پہ مگر ہاں
اس شوخ کی تصویر کو رکھ دیجو کفن میں

اے باد صبا کہیو یہ اس پردہ نشیں سے
پھر ٹھیر کے چلنے لگے تم آگے چمن میں

ایسا نہ ہو یہ آپ کی بے ہودہ سرائی
باعث ہو تکدر کا کہیں آپ کے من میں[1]

در پردہ جو پڑھواتے ہو اوروں سے غزل تم
طوطی پس آئینہ کی طرح چمن میں

کہتا ہوں تمہارے یہ بھلے کی اسے مانو
سیدھے رہو ٹیڑھے نہ ہو یاروں سے چلن میں

کس واسطے گر ٹیڑھے ہو گے تو تمہاری
بس دھجیاں لی جائیں گی یہاں شعر کے فن میں

اور قطع نظر اس سے یہ سمجھو کہ تمہارا
بخیہ نہ بکھرتا پھرے میدان سخن میں

کیا کام دل و حوصلہ تنگ عدو سے
ہے غور سدا عیش کو مضمون دہن میں

---

[1] ل: باعث ہو مکدر

[2] ل: ٹھیر

(۲۱)

بے وجہ زُلفیں چھوٹی ہوئیں شکل لا نہیں — مطلب ہے یہ کہ اس کی کمر کا پتا نہیں
اُن کے پھلا سروں[1] میں نہ آنا وہ ہیں بلا — دل لے کے اپنے باپ کے بھی آشنا نہیں
کیوں اس قدر دراز ہے تو اے شبِ فراق! — میں نے تو زلفِ یار کو اب تک چھوا نہیں
دھمکاتے کیا ہو مجھ کو زمانے کے رنگ سے — کچھ آسماں نیا نہیں، کچھ میں نیا نہیں
وہ زخم ہیں جگر میں بہ کثرت کہ جس میں آہ — نوکِ مژہ پاؤں بھی رکھنے کو جا نہیں
آئینہ صاف دھوکے کی ٹٹی ہے، دیکھنا — باطن میں کوئی اس سا کدورت بھرا نہیں
کچھ گومگو ہی رہنے دو، جانے دو، چپ رہو[2] — مضمون آج تک تو دہن کا کھلا نہیں
باز آؤ اب بھی، جلنے دو، مانو کہا سنا — اس طرح دل جلانا کسی کا بھلا نہیں
سر پر ہمارے اس کی نزاکت نے وقتِ ذبح — احساں کیا کہ بازوے قاتل دکھا نہیں
بس شیخ صاحب آپ کے نزدیک ہم اگر — بد وضع ہیں، تو آپ بھی کچھ پارسا نہیں
صبر و قرار، طاقت و تاب و توان و دل — سب لے چکے ہو اب تو یہاں کچھ رہا نہیں
نامِ خدا نظر نہ لگے اللّٰہُمَّ فزد — ہے خوب صاف برسرِ ہر مدعا نہیں
کھینچے ہے دور آپ کو اتنا شبِ فراق — شاید کہ اس پہ زلف کا عقدہ کھلا نہیں
کیوں زخم دل کو دیتے ہو تازہ ابھی تو یہاں — زخمِ جگر کا ٹانکا بھی میلا ہوا نہیں

حیراں ہوں کیوں زباں میں کانٹے پڑے ہیں عیش!
میں نے تو نام اس کی مژہ کا لیا نہیں

---

[1] پھلا سروں بمعنی حیلہ، فریب

[2] غزل ۲۱ میں ۸ شعر اور مقطع بنیادی نسخے میں نہیں، لندن کے نسخے سے پورا کیا گیا ہے۔

(۲۲) [۱]

نسیم صبح سے اس واسطے ہم پیار رکھتے ہیں
کہ امیدِ وصالِ بوے زلفِ یار رکھتے ہیں

محبت اُن سے بس اس واسطے میخوار رکھتے ہیں
کہ وہ نامِ خدا گردن صراحی دار رکھتے ہیں

نہ پرواے گل و نہ خواہشِ گلزار رکھتے ہیں
سدا پیشِ نظر ہم جلوۂ دلدار رکھتے ہیں

بھلے چنگے ہیں پر یہ عشق کا آزار رکھتے ہیں
کہ اس دل کو سدا وقفِ نگاہِ یار رکھتے ہیں

بہم یہ کاوشِ دستِ جنوں سے ربط پہنچا ہے
کہ ہم تارِ نظر کے نام سے بھی عار رکھتے ہیں

کہو برگِ گلِ تر اٹھ سکے کب اُن سے جو گل رو
اٹھانا ہاتھ میں رنگِ حنا کا بار رکھتے ہیں

بھلا ڈھب وصل کا کیوں کر بنے اُن سے بتاؤ تو
کہ جو گھر کے بھی آنے کا مرے انکار رکھتے ہیں

چھپا کر زلف سے مارا نگہ نے دل بچے کیوں کر
یہ تنہا اور وہ سو سو طرح کے وار رکھتے ہیں

ہمیں ہونے لگا کیوں عیش، دھڑکا روزِ محشر کا
رسول اللہؐ سا ہم قافلہ سالار رکھتے ہیں

(۲۳)

وہ نالہ لائے چرخ کو جو انقلاب میں
مسکن ہے اُس کا اس دلِ خانہ خراب میں

بے پردہ آئے گر وہ شبِ ماہتاب میں
مہتاب دیکھ منہ کو چھپالے سحاب میں

دیکھا تھا کس کی کاکلِ پیچاں کو خواب میں
جو جان اب تلک ہے اسی پیچ و تاب میں

قاتل میں عاشقِ مژہ و چشمِ مست ہوں
خنجر گلے پہ پھیر بجھا کر شراب میں

زاہد سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ بدنصیب
لذت ملی ہے کیا تجھے، کہ اجتناب میں

اُس کی گلی میں لاکھوں کی جائیں ہیں پائمال
اے [۲] حضرتِ دل آپ ہیں وہاں کس حساب میں

افشاے رازِ عشق کے باعث تمھیں تو ہو
سو بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

رندوں نے تیری گر نہ سنی تو برا نہ مان
سنتا ہے کون شیخ کسی کی شباب میں

۱؎ پوری غزل بنیادی نسخے میں شامل نہیں۔ لندن کے نسخے سے شاملِ مجموعہ کی گئی ہے۔

۲؎ ک : اے دل بھلا ہیں آپ وہاں

سنتی ہے اے صبا، تجھے جانے کا گر کبھی ق ہو اتفاق معرکۂ شیخ و شاب میں
کہہ دیجو شعر حضرتِ آزردہ جو پڑھے پہلے زبان کو اپنی وہ دھوئے گلاب میں
پڑھ اس زمیں میں اور غزل عیشؔ اب وہ تو
گوشِ فلک نے بھی جو سنی ہو نہ خواب میں

(۲۴)

کیفیت[1] ایسی ہے نگہِ مستِ خواب میں زاہد بھی دیکھ لے تو نہاوے[2] شراب میں
کیوں کیا کہیں گے حضرتِ یوسف جواب میں چوری کیا ہے دل جو زلیخا کا[3] خواب میں
ہونٹوں کو تر تو کرتے ہو قدحِ شراب میں ایسا نہ ہو کہ آگ لگے آفتاب میں
ہے جوشِ گریہ اب بھی وہ چشمِ پُر آب میں دریا کے دم کو بند کیا ہے حباب میں
لکھا ہے عاشقوں نے یہ دل کی کتاب میں ہیں پند منع سننے محبت کے باب میں
چیں بر جبیں ہو، کس کا پڑا عکس آب میں اس طرح موجِ بحر جو ہے پیچ و تاب میں
بو اور مزہ وہ ہے ترے منھ کے لعاب میں گویا گھلا ہے قندِ مکرّر گلاب میں
شاید کہ عزم کوچۂ جاناں ہے دل کو آج بھیجا ہے پہلے جان کو جو پا تراب[4] میں
گردش ہے اس کی چشم کو مستی میں یا کہیں نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں
اپنا تو وقت یاد کرو، تم نے شیخ جی! کیا کیا مزے اڑائے ہیں عہدِ شباب میں
سنتا ہے ہم نشیں نگہِ ناز بے طرح گھر کر گئی ہے اس دلِ خانہ خراب میں
چیچک کے داغ اس رخِ تاباں پہ دیکھ لو تارے کھلے نہ دیکھے ہوں گر آفتاب میں
مت غسل دیجو دستِ حنائی کا ہوں شہید نہلا چکا ہے دشنہ مجھے خونِ ناب میں

---

[1] غزل ۲۴ کے ابتدائی ۸ اشعار بنیادی نسخے میں نہیں ہیں، ل سے لیے گئے

[2] ک: نہائے

[3] ک: چوری گیا ہے دل جو زلیخا کے خواب میں

[4] ک: اضطراب

ے چکھ تو شوخیِ لب و نمکینیِ ذقن ‏ — ‏ کیا خوب نون مرچ ہیں دل کے کباب میں
اس کی سی کچھ بیں نہیں کہتے ہیں دادگر ‏ — ‏ سب مل کے وہاں بھی چینڈ کرینگے حساب میں
اب یہاں سے کعبے خاک اڑانے چلے ہیں شیخ ‏ — ‏ بہرِ ثواب خاک پڑے اس ثواب میں
باتیں سنا سنا کے ڈرائیں گے اپنے ساتھ ‏ — ‏ زاہد نہ سانیو تو کسی کو عذاب میں
ملتا نہیں کچھ اور اگر اے چارہ گر تجھے ‏ — ‏ لاچار کچھ تو چین پڑے اضطراب میں
زخموں پہ دل کے سودۂ الماس ہی چھڑک ‏ — ‏ حل کر کے ہو سو ہو نمک و مشکناب میں

ضبطِ فغاں میں ڈر ہے مجھے عیشؔ دل کہیں
سینے سے باہر آنہ پڑے اضطراب میں

(۲۵)

دل کو سیماب نمط عشق میں آرام نہیں ‏ — ‏ بے قراری کے سوا اور اسے کچھ کام نہیں
جز نہیں خاک کہوں ہاں سے اسے کام نہیں ‏ — ‏ ہے غرض وردِ زباں صبح سے تا شام نہیں
مے و میخانہ کو کیا چوٹھے ه میں ڈالیں لے کر ‏ — ‏ لطف ہے جس مے سو وہ ساقیِ گلفام نہیں
لطف دیتا ہے عجب زلف کے نیچے خطِ سبز ‏ — ‏ ایسا دیکھا ہی کبھی دام تہہِ دام نہیں
تیری بیداد پہ گر دل نے کوئی نالہ کیا ‏ — ‏ تو فلک میری طرف دیکھ کچھ الزام نہیں
آہ دنیا میں ہر آغاز کو انجام ہے پر ‏ — ‏ اک شبِ ہجر کے آغاز کو انجام نہیں
ساغرِ چشم کے مستوں کو ترے اے ساقی ‏ — ‏ ہوسِ مے نہیں اور آرزوے جام نہیں
ڈھونڈ لے میکدۂ دہر میں گر لے کے چراغ ‏ — ‏ اُن سا ساقی نہیں اور مجھ سا مےآشام نہیں
مجھ سے منظور ہے اخفا انھیں صاحب ورنہ ‏ — ‏ ہوتے کس دن کہو خط غیروں کو ارقام نہیں
منھ دکھانے کا ہے اک خاص مجھی سے انکار ‏ — ‏ ورنہ یہ فیض ترا کس کے لیے عام نہیں
گردشِ چشم کے چکرائے ہوؤں کے آگے ‏ — ‏ کچھ حقیقت تری اے گردشِ ایام نہیں

مُرغِ دل زلف میں اے عیشؔ نہ تڑپے کیوں کر
تو گرفتار ہے، آیا یہ تہہِ دام نہیں

ه ل : جھولی

(۲۶)

ابرو کو اُس کے کیا کہوں تلوار بھی نہیں
اور خالی جاتا اس کا کوئی وار بھی نہیں

توبہ تو کی ہے ہاتھ پہ واعظ کے، ہاں مگر
ساقی پلا دے مئے تو کچھ انکار بھی نہیں

دستِ جنوں کرے گا گریباں سے چھیڑ کیا
باقی رہا اب اس میں تو اک تار بھی نہیں

کہنے کو ہے بغل میں دل اپنے وگرنہ یہاں
رکھتے کچھ اُس سے ہم تو سروکار بھی نہیں

فصلِ خزاں نے کی ہے صفائی وہ اب کہ آہ
گلشن میں گل تو خیر ہے، اک خار بھی نہیں

دعویٰ کچھ ابر کو ہے، تو آ جائے سامنے
منہ پھیرنے کا دیدۂ خونبار بھی نہیں

وہ ایک بوسہ دینے پہ لاتے ہیں لاکھ ردّ و کد
کی ہم نے دل کے دینے پہ تکرار بھی نہیں

عشقِ بتاں میں جاں پہ بنی ہے وہ اب کہ آہ
اپنا شریکِ حال، دلِ زار بھی نہیں

قسمت سے زخمِ دل بھی ملا ہے تو وہ ملا
جس کو نصیب مرہمِ زنگار بھی نہیں

کس منھ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ
ہم کو تو عیشؔ شکوۂ اغیار بھی نہیں

(۲۷)

دل میں جو آپ نے ٹھانی ہے، وہ ہم جانتے ہیں
کیوں چھپاتے ہو عبث ہم تو وہ پہچانتے ہیں

دل کیا پہلے ہی ہم نے ہدفِ تیرِ نگاہ
آپ کیوں ہم پہ یہ بے وجہ بھویں تانتے ہیں

راہ میں دوڑ کے اُس شوخ کے لگ جائیں گلے
اب جو ہونی ہو سو ہو، دل میں یہی ٹھانتے ہیں

ان سے ہم پوچھتے ہیں گر خفگی کا باعث
تو ستم یہ ہے کہ وہ اور بُرا مانتے ہیں

---

[1] ک : ہونی ہے

دے کے دل اپنا یہ حاصل ہے ہمیں عیشؔ کہ ہم
کوچۂ یار کی خاک آج تلک چھانتے ہیں

(۲۸)

اے باغباں بہارِ گلستاں تو دیکھ لیں
چلتے ہیں، جوشِ بلبلِ نالاں تو دیکھ لیں

اے چارہ گر، نہ روک مجھے، دم تو لے ذرا
ہوتا ہے کیونکہ چاک گریباں تو دیکھ لیں

میں رک رہا ہوں، وہ نہ ہوں بدنام اور یہاں
وحشت کہے ہے خارِ بیاباں تو دیکھ لیں

تیر نگاہ زندہ نہ چھوڑے پر اے خدا
اتنا تو ہو کہ صورتِ یہاں تو دیکھ لیں

زخمِ جگر کہے ہے یہی دل سے، ہو سو ہو
مرنا تو ہے، یہ کاوشِ مژگاں تو دیکھ لیں

سیبِ ذقن نے شور مچایا ہے کس کے جو
ہر زخمِ دل کہے ہے نمکداں تو دیکھ لیں

فرصت دے اتنی عیشؔ ہمیں اضطرابِ دل
ہم پیچ و تابِ کاکلِ پیچاں تو دیکھ لیں

(۲۹)

ترے گرد جس دن سے اے یار ہم ہیں
گنہ گار ہم ہیں گرفتار ہم ہیں[1]

جہاں میں یہ معلوم ہے سب کے دلبر
دل آزار تو ہے، تو غم خوار ہم ہیں

نہیں دو جہاں کی خبر ہم کو ساقی
شرابِ محبت کے سرشار ہم ہیں

ترے گلشنِ حسن میں وائے قسمت
نظر میں رقیبوں کی بس[2] خوار ہم ہیں

وہاں خوش ہو تم ساتھ غیروں کے ہر دم
یہاں زیست سے اپنی[3] بیزار ہم ہیں

اگر نام کو جان عاشق ہوں لاکھوں
ولیکن ترے ناز بردار ہم ہیں

کہا کل یہ چشموں نے رو رو کے دل سے
سنا ہو جو ابرِ گہر بار، ہم ہیں

بھلا عیشؔ کیا خوفِ محشر ہے تم کو
وہ بخشندہ ہے اور گنہگار ہم ہیں

---

۱ ک: ہیں ہم ۲ ک: جوں ۳ ک: اتنے

(۳۰)

کچھ اس روش سے ہوا ہے یہاں جلوسِ چمن
کہ شاخِ گُل بھی ادب سے ہے پائے بوسِ چمن
ہوئی ہے فندقِ غنچوں سے[1] بلبلِ شیدا!
چمن میں آج حنا بندیِ عروسِ چمن
شگوفۂ[2] فوجِ بہاری کے واسطے ہر دمِ صبح
صدائے غنچۂ و گُل ہے بجائے کوسِ چمن
شکست دینے کو فوجِ خزاں کے گلشن میں
نہیں یہ غنچۂ گُل، ہے یہ کار توسِ چمن
یہی دعا ہے ترے حق میں عیش تجھ کو مدام
بہ عہدِ امن رکھے خالق نقوشِ[3] چمن

(۳۱)

کان میں غیروں نے پھونکے ان کے انجیر اور ہیں
آج کیوں بدلے ہوئے کچھ ان کے تیور اور ہیں
تشنہ کامانِ محبت کی حقیقت کیا کہیں
وہ[4] ہیں سرگرداں شریکِ دورِ ساغر اور ہیں
ایک زخمِ دل کو کیا پیٹے ہے تو اے چارہ گر!
زخم سینے میں کئی اس کے برابر اور ہیں
جنبشِ مژگانِ قاتل سے رگِ جاں پر مری
متصل ٹوٹا کیے نشتر پہ نشتر اور ہیں

---

[1] ل: کی
[2] ک: شگوفہ
[3] ل: کی
[3] اصل: نفوس
[4] اصل: وہ ہیں سرگرداں، شریکِ رندِ ساغر اور ہیں، متن میں ل کا مصرع دیا گیا ہے۔

آب و تاب اُن مہ وشوں کے رُخ کی اپنی سی نہ جان
کیوں جھمکڑے اُن کے، اے خورشیدِ خاور اور ہیں

دل جلوں کو کیوں جلاتا ہے، وہ تیری بزم میں
یہہاں بس مثلِ شمعِ صبح، دم بھر اور ہیں

دعوے ہی دعوے سُنو غیروں کے، جوں نقشِ قدم
یاد رکھ، مر مٹنے والے تیرے در پر اور ہیں

آئینہ رویوں سے کیا مشکل بنی ہے، حالِ دل
صاف گر کہیے، تو وہ ہوتے مکدّر اور ہیں

کیوں نہ عاشق کو ہو شغل سینہ کوبی، اُس کا آہ
روز آ آ کر ہلاتے حلقۂ در، اور ہیں

ہے گرہ میں اُن کے ہر قطرے کے طوفانِ ابر تر
اِن سے مت بھڑنا، یہ میرے دیدۂ تر اور ہیں

رنگ ہے اے دورِ چشمِ یار ہاں تو نے بھی کیا
آسمانوں کو دیے چکّر پہ چکّر اور ہیں

سیکڑوں سر کٹ چکے اس در پہ جس پر اور بھی
ٹکٹکی باندھے کھڑے وہاں جانبِ در اور ہیں

تیغِ ابرو، ناوکِ مژگان و دامِ زلفِ یار
یہ سب آفت ہیں پہ کچھ آنکھیں فسوں گر اور ہیں

دل جلوں کا حال کچھ اوّل تو وہ سنتے نہیں
اور سنا بھی تو جلاتے اُن کو ہنس کر اور ہیں

نالۂ دل تو اثر پتھر میں کرتا ہے، مگر
ہیں بنے جس سے بتوں کے دل، وہ پتھر اور ہیں

لے کے آئے نکہتِ گل کی اگر لپٹیں تو کیا
عیشؔ وہ جھونکے صبا کے روح پرور اور ہیں

(۳۲)

کوئے قاتل میں جو بے خوف چلے جاتے ہیں
ہم نے جانا کہ یہ کٹوانے گلے جاتے ہیں

جلوہ ایک آن جو دے کر وہ چلے جاتے ہیں
دل اِدھر خلق کے تلووں سے مَلے جاتے ہیں

ٹلنے والے ترے دروازے سے ہوں گے کوئی اور
ہم کہیں کیا ترے ٹالے سے ٹلے جاتے ہیں

سرد مہریِ فلک کی ہے یہ الٹی تاثیر
کہ دل عشّاق کے لیے آگ جلے جاتے ہیں

شانہ وہ زلفوں میں کرتے ہیں وہاں اور یہاں
دل پہ عشاق کے آرے سے چلے جاتے ہیں

لے کے ساتھ آتے ہیں غیروں کو مرے گھر دیکھو
اب یہ چھاتی پہ مری مونگ دلے جاتے ہیں

کہیں دیکھی نہ سنی اُن سے تو کوڑی کیری
دل دہاڑے مرا دل اے لو چھلے جاتے ہیں

آتشِ غم سے ہے سینے میں یہ دل کا عالم
ہاں بڑے جیسے کڑاہی میں تلے جاتے ہیں

اس قدر راہِ عدم سیدھی ہے اے عیشؔ کہ وہاں
کیے بند آنکھ، برے اور بھلے جاتے ہیں[1]

(۳۳)

خونِ عاشق سے تو کر رنگِ گلِ احمر پانوں
رشکِ مقتول ہے رنگیں بہ حنامت کر پانوں

جو قدم آگے رکھوں ہوئی سو پڑے ہے پیچھے
اس کے کوچے سے بھلا کیونکر رکھوں باہر پانوں

شعلہ زن ہے دلِ بیتاب تہِ خاک ہنوز
شمع، تو گور پر عاشق کی سنبھل کر دھر پانوں

قصۂ بے سروپائی کو مری سُن کے کہا
بات وہ کہیے کہ جس بات کا کچھ ہو سر پانوں

---

[1] مقطع ل میں نہیں

[2] ک : بھی

نامہ بر خط مرا پہنچا دیا گر یار تلک !
عمر بھر میں تو پیوں گا ترے دھو دھو کر پاؤں

بھولی باتوں پہ نہ جانا کہیں اُن کی، رند و!
شیخ صاحب کے سنا پیٹ کے ہیں اندر پاؤں

کاوشِ خارِ مغیلاں تھا رگِ گل مجھ کو
عیش اُس غنچہ دہن بن جو پڑا گل پر پاؤں

(۳۴)

گر یہ دل شعلۂ جوالہ و سیماب نہیں
اُس پہ بھی وہ ہے کہ اُس سا کوئی بیتاب نہیں

دنیا غفلت ہے حقیقت میں یہ جز خواب نہیں
چھوڑتے کیوں اُسے تم یا اولی الالباب نہیں

خشک لب تر نہیں آبِ دمِ خنجر سے ترے
تشنہ کامانِ محبت ہوئے سیراب نہیں

ہجر میں ہاں مددِ آئینہ و نرگس ہیں گواہ
ایک پل بند ہوئے دیدۂ بے خواب نہیں

مانتے ہم تری سو جان سے ناصح، لیکن
کیا کریں قابو میں اپنا دلِ بے تاب نہیں

دل سلامت رہے عاشق کا نہیں مے تو نہ ہو
عوض مے اُسے کیا پینے کو خونِ ناب نہیں

یہ ہی فتوائے مغاں ہے کہ ہے مے اس پہ حرام
آتے جس شخص کو مے پینے کے آداب نہیں

شکر صد شکر کہ جمعیتِ خاطر تو ہے یاں
کیا ہوا زینتِ دنیا کے گر اسباب نہیں

کچھ نہ پوچھو فلکِ تفرقہ پرداز کے ڈھنگ
دیکھ سکتا وہ بہم صحبتِ احباب نہیں

مبتلائے مرضِ عشق کا اپنے احوال
کر قیاس اس پہ بیاں کی مجھے اب تاب نہیں

تیری فرقت میں جن آنکھوں سے بھے دریا جاری
ان میں اب نام کو پیدا اثرِ آب نہیں

جس کی محراب خمِ ابروئے قاتل ہے عیشؔ!
جان دے گا خمِ شمشیر کو محراب نہیں

(۳۵)

رفعت جز اپنے غیر کو حاصل یہاں نہیں
اپنا ہی دودِ دل ہے کچھ اور آسماں نہیں

ك ک : تھی
ك ک : دیناہے

ملنے کا ہم سے وہ اگر آرامِ جاں نہیں
تو تو بھی چین پانے کا اے آسماں نہیں

اس کی جفا[1] و جور کا شکوہ کہاں نہیں
باز آئے گر ستم سے، تو یہ آسماں نہیں

عاشق کے غم کو حاجتِ شرح و بیاں نہیں
کیوں اُس کے زنگ رخ سے عیاں ہے نہاں نہیں

اے مہر وش، فراق میں تیرے بتا تو دے
وہ نالہ کون سا ہے جو آتش فشاں نہیں

گو جھوٹ ہی ہو، سچ نہ ہو وعدہ تو ہو سو وہاں
نکلی کبھی نہیں کے سوا مُنھ سے ہاں نہیں

اے سردمہریِ فلکِ پیر! چین کر
قسمت سے تیری کوئی رہا تفتہ جاں نہیں

اُس ظلم پیشہ کے یہ کوئی کان کھول دے
تو جان اس میں طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

بے دیکھے مہ وشوں کے ہو ٹکڑے بغل میں دل
حاصل کبھی یہ بات تجھے اے کتاں نہیں

واعظ خدا کا نام لے کعبہ کو جائیں ہم
بہرِ طواف کیا ہمیں کوئے بتاں نہیں

ہو اس سے کیا امیدِ وفا، وعدہ کر کے جو
کہہ دیوے صاف، میں نے تو دی کچھ زباں نہیں

زاہد نہ کر گڑگڑا، تجھے مے دیں تو کیونکہ دیں
قسمت تری، اجازتِ پیرِ مغاں نہیں

کہتا ہے کوئی شعلۂ جوالہ، کوئی برق
اس دل پہ میرے لوگوں کو کیا کیا گماں نہیں

کہنے کو یوں تو چرخ پہ لوٹے ہے برق بھی
پر اس میں اپنے دل کی سی بے تابیاں نہیں

عاشق کو کوئے یار سے بہتر جہان میں
لے کر چراغ ڈھونڈئے، تو دارالاماں نہیں

یہ آسماں تو کیا ہے جو عالی دماغ ہیں
پڑتی نگاہ عرش پہ بھی، اُن کی ہاں نہیں

ہم موردِ جفا ہیں ازل سے اسی طرح
ہم پر نیا کچھ آج یہ جورِ بتاں نہیں

اے دورِ چشمِ یار دھرا[2] آتا ہے وہ ہمیں
گردش میں کیا ہمیں ہیں فقط آسماں نہیں

دکھلاتے دردِ دل کا اثر عیشؔ کیا کریں
اُس نے ہمارے غم کی سنی داستاں نہیں

(۳۶)

جہاں میں بے وفا کیوں، میری جاں، ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ سُن[3] مطلب کی اپنی تو لے، ہاں ایسے بھی ہوتے ہیں

---

۱ ک: کے   ۲ ل: ڈراتا

۳ ل: کہ ہوں مطلب کے اپنے پورے

کوئی تو جان سے اپنی گیا گزرا، وہاں آن کو
بناوٹ کا گماں ہے، بدگماں ایسے بھی ہوتے ہیں
جو ہو ہم دل جلوں کو ایک دم فرصت تو اے گردوں!
دکھا دیں نالۂ آتش فشاں، ایسے بھی ہوتے ہیں
جو نسبت بلبلوں کے تو ستم کرتا ہے، تو ہی کہہ
ستم بائغ جہاں میں، باغباں، ایسے بھی ہوتے ہیں
بہت ہوتے ہیں خوش کو دیکھ کر خوش اور سب ناخوش
نہیں یکساں سب ابنائے جہاں ایسے بھی ہوتے ہیں
جو کہیے دردِ دل ان سے، تو کرتے ہیں ستم اُلٹے
بشر بے درد زیرِ آسماں، ایسے بھی ہوتے ہیں
خدا نا خواستہ[1] غیروں سے تم ملتے ہو کب، لیکن
اسے کیا کیجیے، چرچے یہاں ایسے بھی ہوتے ہیں
اسی دنیا میں ہیں لاکھوں حریص اور ہاں نہیں رکھتے
اُمیدِ سود اور بیم زیاں ایسے بھی ہوتے ہیں
کہا مجنوں نے مجھ کو دیکھ کر، اے عیش[2] حیرت ہے
خداوندِ جہاں آشفتہ جاں ایسے بھی ہوتے ہیں

(۳۷)

یوں بات کسی کی ہم کب، یار اٹھاتے ہیں
دل تم کو دیا اس سے لاچار اُٹھاتے ہیں
ہم مطلبِ دل چاہیں گردوں سے یہ کیا ممکن
آزاد منش اس کے کب عار اُٹھاتے ہیں

---

[1] ل: خدا نخواستہ
[2] ل: ے

بہکانے سے غیروں کے کیا کیجے علاج اس کا ۔۔۔ ہر بات میں وہ مجھ سے تکرار اٹھاتے ہیں
منھ کیا ہے فلک تیرا کوہِ غمِ ہجراں کا ۔۔۔ یہ حضرتِ دل ہی ہیں جو بار اٹھاتے ہیں
ہم تفتہ جگر ظالم ہے کچھ بھی خبر تجھ کو ۔۔۔ الفت میں تیری کیا کیا آزار اٹھاتے ہیں
اک جنبشِ ابرو ہی عشاق کو کافی ہے ۔۔۔ کیوں قتل کو وہ ان کے تلوار اٹھاتے ہیں

کچھ عیش[1] سنا تونے اس بزم میں عاشق پر
طوفان نئے کیا کیا اغیار اٹھاتے ہیں

(۳۸)

ابل رہا ہے پڑا یہاں دل و جگر سے خون ۔۔۔ بہے نہ اشک کی جا کیونکہ چشمِ تر سے خون
اثر نہیں ہے مری آہِ دل میں اس پر بھی ۔۔۔ عدو کا دل ہے مری آہِ بے اثر سے خون
شفق نہیں ہے مرے زخمِ دل کا حسن کر حال ۔۔۔ بہا ہے دیکھ دل[2] چسو خ کینہ ور سے خون
ترے فراق میں آنکھوں نے خون یہ برسایا[3] ۔۔۔ کہ خلق ادیچ کے پھینکے ہے رہ گزر سے خون
لگا ہے ہاتھ یہ اس چشمِ خوں فشاں کے تو کھیل ۔۔۔ میں لاؤں روز بہانے کو کس کے گھر سے خون
مژہ یہ دیکھ کے اشکوں کو عقل حیران ہے ۔۔۔ کیا ہے آب ان آنکھوں نے کس ہنر سے خون

پڑا جو عکسِ رخِ گلبدن گہر میں، تو عیش!
بجائے آب ہوا[4] جلوہ گر گہر سے خون

(۳۹)

قدرِ عشق اہلِ وفا جانتے ہیں ۔۔۔ بوالہوس عشق کو کیا جانتے ہیں

---

[1] ل: ک میں مقطع نہیں ہے
[2] ک: بہا ہے دیکھ کے دل
[3] ل: ترے فراق میں آنکھوں نے خون برسایا
[4] ک میں ''ہوا'' کی جگہ ''ہے'' تحریر ہے جس سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے اگر ''ہے'' کے بعد ''اب'' کا اضافہ کیا جائے تو مصرع موزوں ہو جائے گا یعنی ع بجائے آب ہے اب جلوہ گر گہر سے خون

جو کہ اپنے کو بُرا جانتے ہیں — وہ بُروں کو بھی بھلا جانتے ہیں
ایک دل عاشق کا دُکھا جانتے ہیں — اور سوا اس کے وہ کیا جانتے ہیں
دلِ مضطر کو ترے عاشق کے — اہلِ دل قبلہ نما جانتے ہیں
منہ کو عاشق سے چھپائے رکھنا — اس کو معشوق حیا جانتے ہیں
مرضِ عشق کی اے ہم نفسو! — کب طبیب آہ دوا جانتے ہیں
مژۂ یار کو، اہلِ تحقیق! — پوچھ لو، تیرِ قضا جانتے ہیں
نکہتِ زلف کی ہے گھات میں تو — ہم ترے پیچ صبا، جانتے ہیں
حضرتِ عشق کا، یا حضرتِ دل! — آپ ہی کچھ خوب مزا جانتے ہیں
اور کیا جانتے ہیں یار، ایک فقط — باندھنی اپنی ہوا جانتے ہیں
مذہبِ عشق میں معشوقوں کے — بے وفائی کو وفا جانتے ہیں
قولِ سودا زدۂ زلف ہے یہ — جو کہ آئینِ وفا جانتے ہیں
مُشک کا زلفِ بتاں کے آگے — نام لینا بھی خطا جانتے ہیں

شعلۂ شمع کو ہم بزم میں، عیشؔ!
یار کی فندقِ پا جانتے ہیں

(۴۰)

دل کو فرقت کی ترے تاب نہیں — جھیل سکتا وہ یہ عذاب نہیں
کہ تصور میں اس کی زلفوں کی — کب رہا دل کو پیچ و تاب نہیں
کیا کروں آہ میرے قابو میں — یہ دلِ خانماں خراب نہیں
آتشِ غم میں اس کی جل بھن کر — کون سا دل ہوا کباب نہیں
ایک پردہ مجھی سے ہے، ورنہ — کس سے ہوتے وہ بے حجاب نہیں
مفتیِ عصر[1] افصح الفصحا، ق — وہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں

---

[1] مفتیِ عصر سے مراد غالباً مفتی صدرالدین آزردہ کی ذات ہے۔

روبرو اُس کے لب بلاغت میں ‏ ‏ کھولے سحبان، یہ اُس کی تاب نہیں
ڈھونڈیے گر جہاں میں لے کے چراغ ‏ ‏ اُس سوا اور انتخاب نہیں
وہ محیط علوم ہے اُس سے ‏ ‏ اور کو نسبتِ سراب نہیں
شاعری اُس کا ننگ ہے اُس سے ‏ ‏ مائل اس فن کا وہ جناب نہیں
لیکن اس پر بھی وہ بقولِ عیشؔ
وہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں

(۱۴)

اُس کو یہاں سمجھا کے لائے کوئی یار اتنا کہاں
رحم کھائے آہ مجھ پر، غمگسار اتنا کہاں
اُس کے کوچے میں نہ جاؤں ناصحا! میں تو مگر
مجھ کو اس کمبخت دل پر اختیار اتنا کہاں
دل نے تو تاریکیاں دیکھی ہیں اُن زلفوں کی آہ
ہے اندھیرا تم میں اے شبِ ہائے تار اتنا کہاں
دوسرا مجھ سا نہیں عالم میں کوئی دل فگار
کہتے ہیں خامہ کو بھی، پر دل فگار اتنا کہاں
سامنے میرے دلِ مضطر کے ذکرِ برق کیا
سچ تو یہ ہے کہ اس میں اضطرار اتنا کہاں
اشک کے دانے سے میرے، آ ملا کے دیکھ لے
اے صدف گوہر ترا ہے آبدار اتنا کہاں
دیدۂ تر کرتے ہیں پل میں یہاں جل تھل سنا
جوشِ گریہ تجھ میں کہہ، اے ابرِ زار اتنا کہاں

۱؎ ک۔ ل: بھی

۲؎ ل: دیدۂ تر کرتے ہیں اک پل میں یہاں جل تھل سنا

اس دلِ بسمل کی جو بے تابیاں ہیں گی بھلا
شعلۂ جوّالہ کہیے بے قرار اتنا کہاں
انتظار، اے عیشؔ، جو ہے چشمِ عاشق میں بھرا
دیدۂ نرگس نے پایا انتظار اتنا کہاں

(۴۲)

رکھتا بر یہ اثر نالۂ شبگیر تو ہوں
پر مُقِر میں تو جب اُس دل میں ہو تاثیر تو ہوں
آگے قسمت ہے کُھلے یا نہ کُھلے عقدۂ دل
بیٹھا میں تیز کیے ناخنِ تدبیر تو ہوں
دے دیا تاب و تواں سب نے اسے مل کے جواب
ایک میں شاملِ حالِ دلگیر تو ہوں
یوں تو سب مصری کی ڈلیاں ہیں پہ قائل نہیں میں
ہاں مگر ایک فقط معتقد میر تو ہوں
دل نہیں قابو میں اب اور کروں کیا واعظ!
تیری خاطر سے میں سنتا تری تقریر تو ہوں
وہ پڑھے یا نہ پڑھے اپنی طرف سے اس کو
نامۂ شوق کیا کرتا میں تحریر تو ہوں
اب جو ہو نا ہو سو ہو عیشؔ درِ جاناں کی[1]
دل کڑا کر کے ہلا دیتا میں زنجیر تو ہوں

(۴۳)[2]

کیا کہوں[3] ہم کہ حضرتِ غم ایسے شخص ہیں
القصّہ ہیں وہ ایک رقم ایسے شخص ہیں
کہتے ہیں جو غرور سے ہم ایسے شخص ہیں
ہوتے ذلیل تیری قسم، ایسے شخص ہیں
سر ہاتھ پر جو رکھتے ہیں میدانِ عشق میں
موجود ہوتے ٹھونک کے خم، ایسے شخص ہیں
ہم نے سنے ہیں حاتمِ طائی و برمکی
ہوتے جہاں میں اہلِ کرم ایسے شخص ہیں
مجنوں نے اس گلی میں مجھے دیکھ کر کہا
مر مٹتے مثلِ نقشِ قدم، ایسے شخص ہیں

---

[1] ل : ہیں بھی

[2] ک : اب جو ہوتا ہے سو ہو

[3] یہاں سے آخر تک ردیف ن کی پانچ غزلیں ل میں نہیں۔

[4] ک : کیا ہم کہیں

دعویٰ عشق و بوالہوسی وقتِ امتحاں
مطبوعِ طبع تیری صنم ایسے شخص ہیں

دل جن کے پاس آپ ہے جامِ جہاں نما
کب گنتے عیش شوکتِ جم ایسے شخص ہیں

(۴۴)

خیال وہ ہے تمھیں جس کا یہاں گماں بھی نہیں
تو اس کی داد تو صاحب کسی کے ہاں بھی نہیں

جگر شگاف ہوا خامہ، لو ابھی میں نے
کیا یہ حالِ دلِ خستہ کچھ بیاں بھی نہیں

کسی پہ سوزِ دل اپنا کھلے تو کیوں کہ کھلے
زباں تو شمع کی ہے یہاں تو وہ زباں بھی نہیں

عبث سو چکتی ہو نسیم نگہ پہ لے لو دل
جو فائدہ نہیں اس میں تو کچھ زیاں بھی نہیں

یہ ڈر ہے اس کو کہ ہاں سے نہ آشنا ہو جائے
زباں وہ اس سے کہے ہے بجائے ہاں بھی نہیں

اب اس کو پیٹیے کیا حال سب کا کھل جاتا
پہ کیا کریں کہ اسے شوقِ امتحاں بھی نہیں

زبوں ہے نخوت و پندار یا اولی الالباب!
مناسب اس کا تو کرنا تمھیں گماں بھی نہیں

بڑے بڑے متکبر تھے الغرض اُن کا
جہاں میں نام کو باقی رہا نشاں بھی نہیں

سنائے ہے یہ سمجھ چرخِ کج ادا مجھ کو
کہ کیا کرے گا یہ باقی کچھ اس میں جاں بھی نہیں

یہ واقعی ہے یہ آہوں کا اس طرف سے بھی
جو چل پڑا کوئی چھرّا تو آسماں بھی نہیں

کہاں کا دل لیے پھرتے ہو، عیشؔ خیر ہے کچھ
دریغ اس سے، وہ مانگے تو ہم کو جاں بھی نہیں

(۴۵)

غم کھانے میں دل اور جگر دونوں ایک ہیں
رونے میں ابر و دیدۂ تر دونوں ایک ہیں

نازاں[1] ہیں کس پہ اہلِ تکبّر یہاں تو آہ
ہستیِ بے ثبات و شرر دونوں ایک ہیں

جو جانتے ہیں حق کی طرف سے ہے خیر و شر
نزدیک اُن کے نفع و ضرر دونوں ایک ہیں

سب میں ظہورِ جلوۂ حق دیکھتے ہیں وہ
روشن دلوں کو شام و سحر دونوں ایک ہیں

فیضانِ حق کو کچھ نہیں پابندیِ ہنر
واں بے ہنر اور اہلِ ہنر دونوں ایک ہیں

شاگرد و استاد میں ہوتا ہے فرق، پر
طرزِ سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں

قالین و بوریا و سمور و گلیم، عیشؔ!
کرنے کو آہ عمر بسر دونوں ایک ہیں

(۴۶)

یہ دلِ بے تاب ایک دم چین دیتا ہی نہیں
اور یہ دے تو ترا غم چین دیتا ہی نہیں

سانپ سا لوٹے نہ کیوں چھاتی پہ عاشق کی ترا
پیچ و تابِ زلفِ پرخم چین دیتا ہی نہیں

کوئے قاتل میں نہ جائیں کس طرح اے ہمنشیں!
دل ہمارا کیا کریں ہم چین دیتا ہی نہیں

کیجیے جمعیّتِ دل کیونکہ حاصل اے صبا!
ہونا اُن زلفوں کا برہم چین دیتا ہی نہیں

کیوں نہ ہوں جوشِ جنوں کی تیز یاں اے عندلیب!
یہ بہارِ گل کا موسم چین دیتا ہی نہیں

تو ہی کر انصاف اے ظالم غمِ فرقت ترا
دردِ دل ہو کس طرح کم چین دیتا ہی نہیں

رازِ دل ہم تو چھپاتے ہیں، ولیکن کیا کریں
یہ ہمارا دیدۂ نم چین دیتا ہی نہیں

---

[1] ک : نازاں یہ کس پہ اہلِ تکبّر یہاں تو آہ

شکوہ بیجا ہے کسی کو عیش پر چرخ کینہ ور
ہے پریشاں ایک عالم چین دیتا ہی نہیں

(۴۷)

اپنی آہیں برقِ آتش ریز ہیں — اور آنکھیں ابرِ طوفاں خیز ہیں
اے دل، اِن میٹھی نگاہوں پر نہ جا — یہ نگاہیں مصلحت آمیز ہیں
بخیہ گر سئ[1] چاکِ دل پر دیکھے — ناخنِ دستِ جنوں بھی تیز ہیں
فنِ خوں ریزی میں پلکیں یار کی — رشکِ نادرؔ، غیرتِ چنگیز ہیں

گل کے پیالے بادۂ عشرت سے عیش!
مست ہو بلبل نہ کیوں لبریز ہیں

---

[1] ک : ہیں

و

(۱)

جو دل آویز ہے اُس زلفِ گرہ گیر کی بُو
ایسی عالم میں کسی کی نہیں تاثیر کی بو

اہلِ جوہر[1] کو مٹا سکتے ہیں کب بے جوہر
مشک کی بو کو مٹا دیتی ہے کب[2] سیر کی بو

دم ہمیں دینے کو آیا ہے، ارے جا، واعظ!
منھ سے آتی ہے چلی تیرے ابھی شیر کی بو

اس زمانے کے امیروں سے نہ رکھ چشم حصول
کس نے سونگھی ہے جہاں میں گلِ تصویر کی بو

آہ کی سیخ پلٹ آتشِ غم پر جلدی
چلی آتی ہے کبابِ دلِ دلگیر کی بو

پہنچی یعقوب کو ہاں پیرہنِ یوسف کی
مصر سے دم میں جو اللہ نے تقدیر کی بو

دم میں ڈالے گا مرا نالۂ شبگیر، نکال
ناک کی راہ دماغِ فلکِ پیر کی بو

سچ تو یہ بات ہے اے عیشؔ کہ پاتے ہیں یہاں
تیرے اشعار میں طرزِ سخنِ میر کی بو

(۲)

جو جبیں اُس کی ہے حُسن اے مہ جبیں، اتنی تو ہو
اس سے بہتر ہو گی کیا، پہلے کہیں اتنی تو ہو

پاؤں کیا وحشت نکالے، عرصۂ صحرا ہے کم
دو قدم دل کھول کر چلیے، زمیں اتنی تو ہو

نکہتِ زلفِ بتاں سے دل کھنچا جاتا ہے آہ
بوئے دلکش جس میں ہو، اے ہمنشیں اتنی تو ہو

---

[1] ل: بے ہنر اہلِ ہنر کو نہ دبائیں کیونکر   [2] ل: ہاں

اور کچھ ہو یا نہ ہو، اُس دل میں کچھ ہوئے اثر
تجھ میں تاثیر آہ، آہِ آتشیں اتنی تو ہو
رکھ کے اوروں پر سنا آواز، در پردہ مجھے
چھیڑ چھاڑ عاشق سے، اے پردہ نشیں اتنی تو ہو
مر مٹا عاشق، رہا انکار ملنے کا تجھے!
آفریں صد آفریں ظالم، نہیں اتنی تو ہو
عیشؔ سن یہ شعر، روحِ میرؔ بولی قبر میں
اے جزاک اللہ زباں سحر آفریں اتنی تو ہو

(۳)

پھلے پھولے الٰہی پھر کے[1] شاخِ گل، تو اچھا ہو
پھرے پھر اپلے گہلے باغ میں بلبل تو اچھا ہو
یقیں سمجھو نکل جائیں گے بَل اک دم میں سب اُس کے
نہ آوے سامنے اُس زلف کے سُنبل، تو اچھا ہو
کہیں ہیں جس کو دل بس وہ ہی کچھ کانٹا سا کھٹکے ہے
جو مٹ جاوے خلش سینے سے یہ بالکل، تو اچھا ہو
میں توبہ کر چکا ہوں، جانتا ہے سارا میخانہ
الٰہی، دخترِ رز کی نہ اٹھے چُہل، تو اچھا ہو
کہاں تک ضبط بس دم ناک میں آیا ہے عیشؔ اپنا
اب اِس سے رازِ دل یہ سب پہ کھل جائے تو اچھا ہو

(۴)

بے ساختہ دیکھے جو تری جلوہ گری کو انسان تو انسان غش آجائے پری کو

---

[1] ل. س. ک تینوں نسخوں میں "کے" درج ہے (سے) ہونا چاہیے۔

مانع ہے بس، اے پردہ نشیں! ضبط، وگرنہ
کافی ہے مرا نالۂ دل پردہ دری کو

یہ حوصلہ قاصد کا کہ خط لے کے وہاں جائے
قاصد کی جگہ چاہیے دل نامہ بری کو

آنکھوں کو تو میں پونچھ بھی سکتا ہوں ولیکن
پہچانے گا وہ، کیا کروں دامن کی تری کو

گر یار نے کی وا گرۂ زلف، ہمیں کیا
یہ مژدہ مبارک ہو نسیم سحری کو

آسان نہیں اُس بتِ سفّاک سے ملنا
واللہ جگر چاہیے اس بے جگری کو

اے دل، تجھے اُس زلف کا رہتا ہے تصور
کیا کہتے ہیں دیوانے اس آشفتہ سری کو

بلبل کو جو کل دیکھ کے[1] بیتاب قفس میں
ق میں نے کہا، کہ اپنی تو آشفتہ سری کو

وہ رو کے لگی کہنے کہ کیا پوچھو ہو احوال
کیا خاک کہوں اپنی میں خستہ جگری کو

جب نام بھی لینا گل و گلزار کا ہو منع
کیا روئیے صیّاد کی بے داد گری کو

کیا جنسِ گراں مایہ ہے، جاں تک بھی خریدوں
پاؤں میں اگر عیشؔ، کہیں[2] بے ہنری کو

(۵)

جو آہ و فغاں ہیں دلِ دلگیر میں دونو
ہیں کانٹے کی تول، ایک ہی تاثیر میں دونو

کہتے ہیں فسوں جس کو، بتاتے ہیں جسے سحر
ہیں نام خدا اُن کی وہ تقریر[3] میں دونو

خوبی ہے یہی تیر کی، توڑ اور صفائی
سو وہ مژۂ یار کے ہیں تیر میں، دونو

رنگِ رخِ عشّاق زمانے سے نہیں کم
یکساں ہیں یہ بس رنگ کی تغییر میں دونو

سردفترِ عشّاق جو تھے[4] مجنوں و فرہاد
ق ہیں ایسے پھنسے گردشِ تقدیر میں دونو

مر کر بھی کشاکش سے محبت کی نہ چھوٹے
پھرتے ہیں کھنچے کاغذِ تصویر میں دونو

ہو کوچۂ جاناں میں رسائی مہ و خورشید
ہیں عیشؔ، وہ دن رات اسی تدبیر میں دونو

---

[1] ل: ہے
[2] ک: کبھی
[3] ک: تدبیر
[4] ل: ہے

(۶)

خواص تجھ میں یہ، اے آہِ آتشین تو ہو — نہ مہرباں ہو وہ کاش خشمگین تو ہو
نبات و قندِ مکرر نے جان کیا پائی — مقابل اس لبِ شیریں کے انگبین تو ہو
ہمارے غنچۂ دل کا تو کھولنا معلوم — صبا سے وا گرہ زلفِ عنبریں تو ہو
بتانِ ہند تو کیا مال ہیں، بھلا اُن سے — نظر ملائیں یہ تاب بتانِ چین تو ہو
سخی سے سوم بھلا جو کہ جلد دیوے[1] جواب — طلب پہ بوسے کی گر ہاں نہیں، نہیں تو ہو

قطعہ

دل و جگر کے زیاں پر نظر نہ کر، اے چشم! — عیاں جہان میں تیرا ہنر کہیں تو ہو
سرشکِ سُرخ بہا، چل اثر نہیں تو نہیں — بلا سے زینتِ داماں و آستین تو ہو
جو دردِ دل میں سناؤں تو ہنس کے کہتا ہے — ہمارے چاہنے والوں میں اک تمھیں تو ہو
دل[2] و جگر کو مرے چاک کر کے اس کو دکھاؤ — وہ بے یقین ہے بھلا اس کو کچھ یقین تو ہو
جو خوبیاں ہیں زباں کی وہ اور ہیں، پہلے — کسی کی ایسی زباں سحر آفریں تو ہو

یہ جس[3] زمین میں تو نے غزل لکھی، اے عیش!
کسی نے طرح کی ایسی کبھی زمین تو ہو

(۷)

بہم جو پیچ و تاب اُس رُخ پہ ہے گیسوئے گیسو کو
مخالف اس قدر دیکھا نہیں ہندو سے ہندو کو
کیا نیم نگہ میں قتل و نیم ناز میں زندہ
اُتارا دیکھنا کس لطف سے جادو سے جادو کو

---

[1] ک : جو کہ دے ٹکا سا جواب
[2] ل : دل و جگر مرا کوئی چاک کر کے اس کو دکھلائے
[3] ل : یہ جس زمین میں تو نے غزل لکھی ہے عیش

یہ اشکِ[1] سرخ کے آنے سے پیہم بس کھلے ہمدم
خبر دل کی تو اتر پہنچی ہے آنسو سے آنسو کو
عزیزو ابر کی چادر میں مارے شرم کے دیکھو
چھپاتا ہے فلک پر اس مرے مہرو سے مہرو کو
گرا پڑتا ہے سر پاؤں پہ اپنے خود بخود دیکھے
لگا کر بزم میں بیٹھے ہیں اُس زانو سے زانو کو
چمن میں بلبلِ شیدا کہے ہے ہائے دم دے کر
صبا کیا لے اڑی گُل کے تنِ خوشبو سے خوشبو کو
نہیں پیوستہ ابرو عکسِ چشمِ مستِ جاناں پر
لڑایا ہے کسی نے شاخ دار آہو سے آہو کو

(۸)

کھینچ ہی لائی مرے گھر اُس بتِ بے پیر کو
تیرِ مژگاں نے ترے سیدھا بنایا تیر کو
حالِ دل لکھنے[3] نہ پایا تھا کہ سوزِ دل سے یہاں
اے فسادِ عقل ہم نے تو کبھی تقدیر کا
دام کیوں زلفوں کا مکھڑے پہ بچھایا ہے بھلا
نامہ بر کو دیکھتے ہی یہ جواب خط ملا
ذبح کر چک، تشنہ کامِ آبِ خنجر کو کہیں
اے فلک تو کج روی سے اپنی باز آتا نہیں

رشک[2] ہے اے آہ تجھ کو اور تری تاثیر کو
اور خم ابرو نے بس پچکا دیا شمشیر کو
آگ لگ اٹھی زبانِ خامۂ تحریر کو
کھولتے دیکھا نہ عقدہ ناخنِ تدبیر کو
انکھڑیاں نامِ خدا کچھ کم[4] تھیں کیا تسخیر کو
پھونک دو خط اور رے جاؤ اسی تشہیر کو
دیر ہوتی ہے چل اب موقوف کر تکبیر کو
میں بھی ہے اب شرط کہ دوں نالۂ شب گیر کو

---

[1] ل: سرشک

[2] اصل میں رنگ

[3] ل: لکھنے

[4] ک: کچھ کم نہیں تسخیر

اُس سے وہ کُشتی رہے چلتا ہے سدا ہر بزم میں — لاگ ہے کیا جانیے کیا شمع سے گُلگیر کو
دیکھنا کیا دھاک ہے غیروں کے چھکّے چھُٹ گئے — لے گئے اس بزم میں جس دم مری تصویر کو
اے دلِ بے تاب دیوانہ تو ہونا سہل ہے — دیکھ رکھ لیکن ذرا اُس زلف کی زنجیر کو
اس کو شیریں لب کیا اور تلخ کامی مجھ کو دی — اِس مزے داری سے کیا حاصل ہوا تقدیر کو
دل جلا کر خاک کر ڈالا نصیحت نے تری — آگ لگ جائے ارے ناصح تری تقریر کو

کیا زباں پائی تھی اس نے اور وہ کیا شخص تھا
حق تعالیٰ شاد رکھے عیشؔ روحِ میرؔ کو

(۹)

دل کی وحشت نے وہ دیوانہ بنایا مجھ کو — دُور بھاگے ہے مرا چھوڑ کے سایا مجھ کو
ہاتھ اُٹھانے کے نہیں عشقِ بتاں سے ناصح! — لاکھ کی ایک کہی، اور نہ بکوا مجھ کو
ایک تو جورِ بتاں، دوسری یہ اور سنو — چین دیتا نہیں اِک دم دلِ شیدا مجھ کو
ترکِ آداب نہ ہو خنجرِ قاتل کے تلے — جان دے، اُو دلِ بے تاب، نہ تڑپا مجھ کو
غنچۂ گل نہ سمجھنا دلِ عاشق ہوں میں — تو ہی جانے گی صبا دیکھ جو چھیڑا مجھ کو
کچھ بھی غیرت ہے تجھے، دیکھ تو اے خانہ خراب! — لوگ کہتے ہیں ترے عشق میں کیا کیا مجھ کو
شعلۂ عشق کی گرمی نے شبِ فرقت میں — شمع ساں صبح سے پہلے ہی بنیڑا مجھ کو
دل کو لے بھاگے ہیں جب مانگوں ہوں دکھلا رخ و زلف — بس بتاتے ہیں یوں ہی شام و سویرا مجھ کو

عیشؔ اِسے[۱] خوبیِ قسمت کے سوا کیا کہیے
دل ملا ہے سو وہ لب ریزِ تمنا مجھ کو

(۱۰)

کس کام کا بیہودہ جو نالہ یوں ہی سر ہو
گر کچھ نہ ہو اتنا تو ہو اس دل میں اثر ہو

---

۱ ل: اس کو اب خوبیِ قسمت کے سوا کیا کہیے

اُس لب سے خجالت زدہ برگِ گلِ تر ہو
اور آپ سے دانتوں کی خجل آبِ گہر ہو
بن سعی و تردّد مرے گھر آپ وہ آئے
کیونکر نہ مری بے ہنری رشکِ ہنر ہو
ہے تیرے مریضِ غمِ ہجراں کی یہ حالت
مانگیں ہیں دعا سب کہ اِدھر ہو کہ اُدھر ہو
وہ تفتہ جگر ہوں کہ دمِ گرم سے جس کے
دم بند ہو بجلی کا، جہنّم کو حذر ہو
ہے زُلف کا[1] مکھڑے پہ طلسمات کا عالم
گر چھوڑیں تو ہو شام، اُٹھاویں تو سحر ہو
اے غنچہ دہن، قندِ مکرّر کو نبات آئے
شرمندہ یہ تیرے لبِ شیریں سے شکر ہو
دم ناک میں آیا ہے، دعا اب تو یہی ہے
یارب کہیں جلدی شبِ ہجراں کی سحر ہو
حیراں سا پڑا کیوں نہ تکے شکل وہ جس کا
جوں نقشِ قدم بن کے، ملا خاک میں گھر ہو
ہو جس کو تصوّر مژۂ یار کا ہر دم
اُس کا اجی، اچھا کہو، کیا زخمِ جگر ہو
دل لے چکے، اچھا کیا، انکار ہے کس کو
لو جان بھی حاضر ہے، اگر مدِّ نظر ہو

---

[1] ک : سے

میں چاہیے اُس بزم میں اِس طرح سے جاؤں
دربان تو کیا اُس کی فلک کو نہ خبر ہو
تو دھوکے کے ٹٹی ہی اُسے عیشؔ سمجھنا
آئینہ صفت جس کی صفائی میں کدر ہو

(۱۱)

چمن میں ہیں بلبلوں کے جھرمٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
اسی سے ہے گل کو بھی لگاوٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
یہ کہیو دیکھا کیا ہوں ظالم اُٹھا کے بالیں سے سر کو ہر دم
سمجھ کے پاؤں کی تیرے آہٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
تری جدائی میں رات ساری صبا یہ کہنا بہ آہ و زاری
بدلتے گزری ہے مجھ کو کروٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
بھلا بتاؤ تو خلق کیوں کر دو رستہ رکھیں نہ ہات دل پر
لڑاتا ہے انکھڑیاں وہ نٹ کھٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
گیا جو گلشن میں میرا گلرو تو کلیاں پھولوں کی پا کے قابو
بلائیں لیتی ہیں اس کی چٹ چٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
کبھی یہ بیدل کبھی وہ بیدل صفائی ہونی ہے اُن میں مشکل
رہے گی باہم یوں ہی رکاوٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
یہ کہہ دو عاشق کا اُس صنم سے دل و جگر اب خراشِ غم سے
گرے ہے اشکوں کے ساتھ کٹ کٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
یہ ہے نشیب و فرازِ دنیا عبث ہے اُس کا خیال کرنا
جہاں میں ہوتے ہیں یوں ہی جمگھٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو
جو دیکھے کالا تو کہا مرے سنم یہ اس کے مکھڑے پہ عیشؔ جس دم
ہوا سے ہوتی ہے زلف کی لٹ کبھی اِدھر کو کبھی اُدھر کو

(۱۲)

کہیں ہیں باغ میں یہ بلبل و بادِ صبا دونو
نہ جانا رنگ و بوے گل پہ، ہیں یہ بے وفا دونو

کہوں چشمِ سیاہ و زلف پیچاں میں ہیں کس کس کی
خدا محفوظ رکھے ہیں غرض کالی بلا دونو

نگاہِ مست و مژگانِ سیاہِ یار، ہاں وہ ہیں
ہدف دونو کا ہو گر دیکھ لے تیرِ قضا دونو

نہیں پایا پتا اُس کی کمر کا اُس کی زلفوں نے
اسی سے بن گئے ہیں مل کے دیکھو شکلِ لا دونو

ہمیں معلوم ہے ظاہر میں جوں لب گرچہ وہ دو ہیں
مگر ہیں ایک وقتِ عرضِ حرفِ مدّعا دونو

رکھے ہے عاشقِ شیدا ترا وہ جذبِ دل جس سے
خجل ہوں جذبِ مقناطیس و جذبِ کہربا دونو

ترا نالہ نہ ہوا اُس دل کا وہ نالہ ہے، اے بلبل!
ہلا دے چھٹتے ہی اک دم میں بس ارض و سما دونو

وہاں رُخ کے آگے یار کے، ہاں غنچہ و گل کی
بندھے ہے کب ہوا گو لاکھ باندھیں وہ ہوا دونو

ستانے والے اوروں کے بھلا کب چین پاتے ہیں
رہیں ہیں دیکھ لو سرگشتہ چرخ و آسیا دونو

نتیجہ سرکشی کا کیا ملا ہے، اُن سے پوچھو تو
حباب بحر و سروِ باغ جو تھے خود نما دونو

حنا و آئینہ کا ظاہر و باطن نہیں یکساں
منافق پیشہ ہیں، جانے ہے یہ خلقِ خدا دونو

جو وہ بے پردہ آجاوے فقط نرگس ہے کیا حیراں
ٹھٹھک رہ جائیں یوں ہی عیشؔ رند و پارسا دونو

(۱۳) ے

پاس غیروں کو نہ تم اپنے بٹھاؤ، دیکھو
ہو گے بدنام کہا مانو بس آؤ دیکھو

جاؤ توبہ کرو، تم دل نہ دکھاؤ، دیکھو
گھر خدا کا ہے اُسے آؤ نہ ڈھاؤ دیکھو

مسّی مل مل کے نہ تم نے پان چباؤ دیکھو
خاک میں شام و شفق کو نہ ملاؤ دیکھو

دل اسی وعدے پہ تھا تم نے لیا کیوں صاحب!
اس طرف کو تو ذرا آنکھ ملاؤ، دیکھو

ساتھ لے کے جو تم آتے ہو غیروں کو یہاں
دل جلوں کو نہ تم اس طرح جلاؤ دیکھو

میں یہ سچ کہتا ہوں، پچھتاؤ گے تم راتوں کو
بزم اغیار میں چھپ چھپ کے نہ جاؤ، دیکھو

دل مرا تم نے اگر یار، چرایا اچھا
پر چرا کر اسے آنکھیں نہ چراؤ دیکھو

ہم کو معلوم ہیں انداز تمھارے سارے
ہم سے باتیں یوں ہی جھوٹی نہ بناؤ، دیکھو

ایک بوسے پہ یہ جھگڑے ہیں، خدا سے ڈریے
بات کیا ہے، اسے ناحق نہ بڑھاؤ، دیکھو

آئینہ کا تو نہیں ظاہر و باطن یکساں
یہ منافق ہے، اسے منہ نہ لگاؤ دیکھو

ڈھونڈتے پھرتے ہو پیری میں جوانی کے مزے
عیشؔ ان باتوں سے اب ہاتھ اٹھاؤ دیکھو

(۱۴)

چھٹے نہ بلبل کا آہ کیونکر بتاؤ تیرِ جفا سے پہلو
پڑی ہے گلشن میں دھوم دیکھو بچا ہے گل کا صبا سے پہلو

کرے وہ جور و جفا ہزاروں، یہ بات اپنی بھی یاد رکھنا
تہی کریں گے نہ حشر تک ہم جو دم میں دم ہے، دعا سے پہلو

یہ دردِ فرقت ہے چارہ گر تو عبث نہ تکلیف کھینچ، باز آ
علاج اس کا ہے وصلِ جاناں، نہ ہوگا اچھا دوا سے پہلو

ے یہ غزل صرف 'س' میں ہے

مریضِ غم تیرا دردِ غم سے، پڑا رہا ہے جو اک ہی کروٹ
تو اب یہ حالت ہوئی ہے اس کی ہوا ہے شق جا بجا سے پہلو

شبِ وصال ایک عمر میں جو ہوئی میسّر تو وائے قسمت
نہیں بدلتے وہ میری جانب ستم تو دیکھو حیا سے پہلو

جو زخم خوردہ ہوا اُس نگہ کا، بچے وہ کیونکر بھلا بتاؤ
چلے ہے تیرِ نگاہ جس کا رگڑ کے تیرِ قضا سے پہلو

نہیں سخن فہم اب کوئی عیشؔ جو میرؔ ہوتا تو داد دیتا
وہی سمجھتا کہ اس غزل میں بندھا رہے کس کس صفا سے پہلو

(۱۵)

صبا نہ چھیڑیو تو اُس کے ناتوانوں کو — یہ وہ ہیں سر پہ اٹھالیں گے آسمانوں کو
چل اپنی راہ لے واعظ، دم اُس کو دے جاکر — نہ جانتا ہو جو کوئی تیرے بہانوں کو
جو کان اس گلِ خوبی کے دیکھ لے بلبل — تو دے ملا ابھی گلشن میں گل کے کانوں کو
کروں میں تیروں کو مژگانِ یار پر صدقے — اُن ابروؤں پہ سے قرباں کروں کمانوں کو
صبا گزر ہو اگر تیرا لکھنؤ کی طرف — ق — تو اتنا کہیو تو وہاں کے زبان دانوں کو
کہ گر ہزار برس اتنی بات یاد رکھو — اس آرزو میں کھپاؤ گے اپنی جانوں کو
کہ اہلِ دہلی کی تقلید ہم زباں میں کریں — سو تم نہ پہنچو گے اُن کی کبھی زبانوں کو
خیالِ بے ہودہ میں صرفِ عمر کیا حاصل — تم آؤ توبہ کرو چھوڑو ان دھیانوں کو

تم ایک مجنوں کو کیا پیٹتے ہو عشق میں عیشؔ
ہزاروں مجنوں سے رو بیٹھے اپنی جانوں کو

۱؎ ل: نہیں سخن فہم کوئی یہاں، عیشؔ، میرؔ ہوتا تو داد دیتا

۲؎ اصل: بھلا، ل: ہلا

(۱۶)

بد عمل کرتے ہو اور نیک جزا چاہتے ہو
دل میں سوچو تو کہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو

اُس کے بندوں کا ستانا ہے نہایت ہی بُرا
اُن کو آرام دو، گر اپنا بھلا چاہتے ہو

ناخدا ترسوں کو جب تم نے کیا اپنا ندیم
ہوا معلوم کہ تم اپنا بُرا چاہتے ہو

بدمعاشوں سے تو کرواتے ہو عالم کو تباہ
اس پہ یہ لطف ہے آباد ہوا چاہتے ہو

حاجتیں اور غریبوں کی تو کرواتے ہو بند
اور حاجات کو تم اپنی روا چاہتے ہو

سارے عالم کو تو رُلواتے ہو اور اُس کے عوض
یہ تماشا ہے کہ تم آپ ہنسا چاہتے ہو

بات کیوں کر بنے، ظاہر میں تو فرماتے ہو لطف
قتل باطن میں غریبوں کو کیا چاہتے ہو

عیش کر عرض یہی اُن سے کہ بس توبہ کرو
مرضِ غم سے اگر اپنی شفا چاہتے ہو

(۱۷) ؎

بظاہر کچھ تو باعث چاہیے آپس کی اَن بن کو
عداوت اہلِ فن سے کس لیے ہے صاحبِ فن کو

نہیں پامال کرنا ملکِ دل، تو ترکِ چشم اُس کی
رکھے ہے ساتھ اپنے کیوں سیہ پوشوں کی پلٹن کو

اڑائے دامنِ صحرا کے ٹکڑے جس نے وحشت میں
سیے گا اس کے کیا اے بخیہ گر، تو جیب و دامن کو

جہاں میں یاد رکھنا ایک مرغِ دل نہ چھوٹے گا
کبھی گر آ گیا شوقِ شکار اس ناوک افگن کو

کسی کو باغ میں گر جھانکتے دیکھا تو بس بلبل!
کرے گی آنکھ کے ڈھیلوں سے بند اس در کے روزن کو

دلِ ناداں کو میں سمجھا چکا تھا عشق مت کرنا
نہ سمجھا، کوئی سمجھاوے کہاں تک ایسے کودن کو

؎ یہ غزل صرف 'س' میں ہے، 'ل' میں نہیں

دکھا کر زلف و رُخ دیر و حرم میں اُس پری وش نے
مسخّر کر لیا کیا دیکھنا شیخ و برہمن کو
ہمارے زخمِ دل کو کون سی سکتا ہے جز اُس کے
کہ دیوے حکم تو تارِ نظر مژگاں کی سوزن کو
سنا ہے عندلیبِ تفتہ جاں گر باغ میں بولی
تو دے گی پھونک برقِ آہ اس کی گل کے خرمن کو
تمھاری خاطرِ نازک سے ڈر ہے، ورنہ یہ آہیں
ہلا دیں چھٹتے ہی قصرِ فلک کے ساتویں گھن کو
بدن میں راکھ مل کر قمریوں نے سرو کے غم میں
سنا وہ جوگ سادھا ہے کہ رشک آتا ہے جوگن کو
تکبّر، سرکشی، نخوت یہ[1] مغروروں کا شیوہ ہے
جو ہیں اہلِ تواضع وہ جھکا رکھتے ہیں گردن کو
جہاں میں عیشؔ یاں قدرِ تواضع کیا کوئی جانے
تواضع وہ ہے دم میں دوست کر لیتی ہے دشمن کو

(۱۸)

پھر اکسی کا الٰہی کسی سے یار نہ ہو
کوئی جہان میں برگشتہ روزگار نہ ہو
ہم اُس کی چشمِ سیہ مست کے ہیں مستانے
یہ وہ نشے ہیں کہ جس کا کبھی اُتار نہ ہو
جہاں میں کوئی کہتا نہیں خدا لگتی
وہ کیا کرے جسے دل پر بھی اختیار نہ ہو
نہ پھاڑے دامنِ صحرا کو کیونکہ دستِ جنوں[2]
رہا جب اپنے گریباں میں ایک تار نہ ہو
نہ کھیل جان پر اپنی تو اے دلِ ناداں!
خدا کو یاد کر اتنا تو بے قرار نہ ہو

---

[1] ک : تو
[2] ل : دیوانے

نہ بھول زہد پہ لذّت سے بخشش حق کی — وہ بے نصیب ہے جب تک گناہ گار نہ ہو
تمھارے سر کی قسم کھا کے، درد دل کا کہوں — جو میرے لکھنے کا یوں تم کو اعتبار نہ ہو
جناب شیخ جی صاحب، میں ایک عرض کروں — ق اگر مزاج مقدس پہ ناگوار نہ ہو
جناب رندوں سے ملتے تو ہیں، پہ ڈر ہے مجھے — کہ دشمنوں کا کسی دن وہاں اجار نہ ہو

بہت ہے خیمۂ گردوں کے پھونکنے کو تو عیشؔ!
اس آہِ تفتہ جگر میں اثر ہزار نہ ہو

(۱۹) ؎

تم عاشق کسی پر اگر ہو، تو جانو — کسی کو مری طرح دل دو، تو جانو
ہو تم جیسے خوش خو میں ہی جانتا ہوں — ملے تم کو جب تم سا خوش خو تو جانو
تمھیں کیا خبر کیا گزرتی ہے ہم پر — جو دم بھر یہاں آ کے ٹھہرو تو جانو
کوئی اتنا واعظ سے کہہ دو کہ حضرت! — یہ بارِ گراں سر پہ تم لو تو جانو
سدا گھر میں کھاتے ہو پکّی پکائی — یہ پاپڑ محبّت میں بیلو تو جانو

یونہی عیشؔ باتیں بناتے ہو تم بھی
جو اس آفتِ جاں کو دیکھو تو جانو

(۲۰)

چُپ رہو بد زبانیاں نہ کرو — ایسی باتیں دِوانیاں نہ کرو
حق میں رندانِ نیک طینت کے — شیخ جی، بدگمانیاں نہ کرو
دیکھو ہم دل جلوں سے برق وَشو! — نہ کرو، چھیڑ، نمانیاں، نہ کرو
ایک بوسے پہ اے بتو! تکرار — ایسی باتیں سنانیاں نہ کرو
قاتلو، ابروؤں کی تم پہ قتل — آ دُ، تیز اصفہانیاں نہ کرو
ہو کے مستِ شرابِ حسن، ذرا — ہم سے یہ سرگرانیاں نہ کرو
کہے واعظ تمھیں جو، حضرت عیشؔ — ؎ عشق میں جاں فشانیاں نہ کرو

؎ یہاں سے آخر تک ردیف 'و' کی بقیہ غزلیں صرف س، ایس، یا، ل میں موجود نہیں

اُس کو بکنے دو اپنے کام لگو[1]

تم سنا یہ کہانیاں نہ کرو

(۲۱)

سب عشق میں کہتے ترے کیا کیا نہیں ہم کو ۔۔۔ کہتے ہیں کہیں اس کی بھی پروا نہیں ہم کو

رندانِ سبکوش کو بُرا کہتے ہیں زاہد ۔۔۔ کمبخت سمجھتے ہیں کہ مرنا نہیں ہم کو

اک جرعۂ مے کے لیے ہونا اجی منظور ۔۔۔ شورابہ کشِ منتِ اعدا نہیں ہم کو

ہم جرعہ کشِ چشمِ سیہ مست ہیں اے عیش!

کچھ بادۂ گلرنگ کی پروا نہیں ہم کو

(۲۲)

ہر ایک ذرّے میں ہاں جلوہ گر تمھیں تو ہو ۔۔۔ یہ کون دیکھے ہے، نورِ نظر تمھیں تو ہو

تمھیں ہو باغ تمھیں ہو چمن، تمھیں غنچہ ۔۔۔ تمھیں صبا و نسیم سحر تمھیں تو ہو

حرم میں، دیر و خرابات و خانقاہ میں، آہ ۔۔۔ دکھاتے جلوے بس آٹھوں پہر تمھیں تو ہو

تمھیں پتنگ، تمھیں بلبل، اور تمھیں ہو کتاں ۔۔۔ تمھیں ہو شمع، تمھیں گل، قمر تمھیں تو ہو

ہر ایک رنگ میں دیتے ہو بس تمھیں جلوے ۔۔۔ نہ بے ہنر ہو، نہ اہلِ ہنر تمھیں تو ہو

نہ نفع دے ہے کسی کو کوئی، نہ دے ہے ضرر ۔۔۔ یہ جس کو دیتے ہو نفع و ضرر تمھیں تو ہو

تمھیں دوا و رنج، تمھیں درد و محن، تمھیں درد و غم ۔۔۔ جہاں میں راحتِ جان و جگر تمھیں تو ہو

قصور اپنی نظر کا ہے بس نہیں ہر جا ۔۔۔ ظہور کرتے برنگِ دگر تمھیں تو ہو

یقیں ہے عیش کہ بس اس میں کچھ خلاف نہیں

ہر ایک شخص کی لیتے خبر تمھیں تو ہو

---

[1] ک : کرو

د

(۱)

جو دل لگی ہے اُس بتِ نا آشنا کے ساتھ
اے کاش یہ معاملہ ہوتا خدا کے ساتھ

امید پائے بوسِ بتاں میں، میں عمر بھر
پیسا کیا ہوں لختِ جگر کو حنا کے ساتھ

دل ایک خوں کی بوند ہے گل اُس پہ دیکھنا
مٹھ بھیڑ ہے اسی المِ جاں گزا کے ساتھ

یہ پیچ و تاب دل کو مرے بے سبب نہیں
آتی ہے بوئے زلفِ معنبر صبا کے ساتھ

یہ جذب کاہ کرتا ہے وہ جذبِ قلبِ یار
نسبت نہ دیجیے دل کو مرے کہربا کے ساتھ

انجام اس کا دیکھیے کیا ہو، کچھ ان دنوں
دل لگ چلا ہے اُس بتِ کافر ادا کے ساتھ

اوروں کی لاکھ اداؤں پہ بھاری ہے بس فقط
اک مسکرا کے دیکھنا اُس کا حیا کے ساتھ

دل میں تصورِ مژۂ یار کیا بسا
بھرنا پڑا ہے جان کو تیرِ قضا کے ساتھ

ناصح میں مانتا ترا کہنا، پہ کیا کروں
کھنچتی ہے جان یار کی آوازِ پا کے ساتھ

ہے جیسی عقل چرخِ جفا جو کی چرخ میں
دل جا لڑا ہے اُس نگہِ فتنہ زا کے ساتھ

دل دے دیا امیدِ وفا پر بتوں کو حیف
سمجھے نہ یہ کہ کام انھیں کیا وفا کے ساتھ

بنتے ہیں صاف دھوکے کی ٹٹی مثلِ آئینہ
رکھتے ہیں یار ہم سے کدورت صفا کے ساتھ

کیا بے تمیزیِ شعرا کی ہے دیکھنا
تشبیہ زلفِ یار کو دیتے ہیں بلا کے ساتھ

شیطاں کے وسوسوں پہ نہ جانا کھلے گا عیش
درِ امید کلیدِ دعا کے ساتھ

(۲)

تیرِ مژگان یار، واہ جی واہ — کیا ہوا دل کے پار، واہ جی واہ
تیغ ابروے یار نے دیکھو — کیا کیا دل پہ وار، واہ جی واہ
نہ ملا نام کو کبھی ڈھونڈے — ایک دنیا میں یار، واہ جی واہ
لشکرِ نازِ یار سے، یہ دل — کیا لڑا ہے گنوار، واہ جی واہ
دل سے نیم نگہ میں چھین لیا — اس نے صبر و قرار، واہ جی واہ
کیا ہی دستِ جنوں نے وحشت میں — ہے دکھائی بہار، واہ جی واہ
گر ملا بھی تو کیا ملا مجھ کو
عیش قسمت سے یار، واہ جی واہ

(۳)

سب مرے ظاہر و باطن کا خبردار ہے تو، اے مرے یارِ الٰہ!
گرچہ عاصی ہوں، دلے خوش ہوں کہ غفار ہے تو، ہے ترے ہاتھ پناہ
نفس و شیطان نے گھیرا ہے مجھے اے مرے رب، تجھ سوا کس سے کہوں
رات دن تجھ ہی سے کہتا ہوں مددگار ہے تو، نہیں بجز تیرے پناہ
گرچہ ناکارہ و ناچیز ہوں پر تیرا ہوں، تو ہے معبود مرا
بندہ تیرا ہوں میرا پیدا کرن ہار ہے تو، رکھیو رحمت کی نگاہ
اے خطا پوش مرے، بہرِ رسول الثقلین، تیرے قربان ہوا
نام پر اپنے نظر کیجو کہ ستار ہے تو، ڈھانکیو میرے گناہ
ہے ہمیشہ سے تو ہی اور رہے گا تو ہمیشہ نہیں کوئی تیرا شریک
بندہ تیرا ہوں میرا داور دادار ہے تو اے شہنشاہوں کے شاہ
ارحم الراحمین ایسا ہے خدا عیش، نہ ڈر، اور محمد ہیں شفیع
بارِ عصیاں سے ہر چند گراں بار ہے تو، پر وہ بخشندہ ہیں آہ

(۴)

دکھایا پردے سے کیا شوخ نے نکال کے ہاتھ — کہ جان لی ہے مری چھین کر دل میں ڈال کے ہاتھ

جس نے کھینچی ہے تصویر اُس پری رُخ کی | ملے تو چوموں میں اُس صاحبِ کمال کے ہاتھ
یہ تشنہ کامِ محبت ہے نیم جان نہ رہے | لگا یہ وار ارے قاتل ذرا سنبھال کے ہاتھ
ہوا ہے خوں جو تمام آب بحر و دریا میں | گیا ہے کون یہ مہندی بھرے کھنگال کے ہاتھ
کلال خاک سے میری بنا کے پیمانہ | تجھے خدا کی قسم بیچنا کلال کے ہاتھ
فلک نے سر جو چڑھایا اسے، خدا جانے | لگا ہے ناخنِ پاکس کا اس ہلال کے ہاتھ

کسی طرح کا نہ رکھ فکر، عیشؔ دل میں سُنا!
نباہ تیرا ہے بیچونِ ذوالجلال کے ہاتھ

(۵)

دل کو لگا کے یار کی چینِ جبیں کے ساتھ | کرتے ہیں ہم بسر دلِ اندوہگیں کے ساتھ
ہر بات پر کہا نہ کرو تم نہیں، نہیں | جاتی رہے نہ جان کسی کی نہیں کے ساتھ
گر دردِ دل سناؤں، تو کہتے ہیں ربط تم | پیدا کرو اب اور کسی نازنیں کے ساتھ
بے رونقیِ دل نہ ہو کیوں بن خیالِ یار | مشہور ہے کہ شرفِ مکاں ہے مکیں کے ساتھ
یہ جذبِ عشق تھا نہیں لیلیٰ سی نازنیں | بدنام ہوئے قیس سے صحرا نشیں کے ساتھ
ناصح نصیحتوں کی اجازت ہے، شوق سے | سمجھا مجھے مگر سخنِ دل نشیں کے ساتھ
فرقت میں تیری یا تو رہا غم انیسِ دل | یا ربطِ چشمِ تر کو رہا آستیں کے ساتھ
اے ہم نشیں معاملہ تو چاہیے تھا یوں | ق | ہو مہر اہلِ مہر سے کیں اہلِ کیں کے ساتھ
یہاں برخلاف اس کے ہے اہلِ جہاں کی رسم | ہے کینہ اہلِ مہر سے، مہر اہلِ کیں کے ساتھ

اے عیشؔ ربط بوجھ زلیخا کی دیکھنا
گر عشق بھی کیا تو جوانِ حسیں کے ساتھ

(۶)

ہے عیاں اس سے صریحاً ہنرِ آئینہ | ورنہ وہ شوخ پری زاد و سرِ آئینہ

ل: پری وش
ل: کسی طرح کا نہ رکھ غم تو

عکسِ گل رو ہو اگر، جلوہ گرِ آئینہ
کھیت بلبل کا پڑیگا بدرِ آئینہ

چشم بد دور، اجی اُس رخِ زیبا کو کہیں
ہو نہ جاوے مجھے ڈر ہے، نظرِ آئینہ

حیرتِ دل مری باعث ہی نہیں، ممکن تھا
جلوۂ حسنِ رخ و چشمِ ترِ آئینہ

اُس کی استادی کا قائل ہوں میں سبحان اللہ
کیا صفائی سے چھپا ہے کدرِ آئینہ

سرد مہری سے تو عاشق کا ہو یہاں دل ٹھنڈا
اور وہاں گرم ہو یوں منت برِ آئینہ

آہ عاشق تو شبِ ہجر میں تڑپیں اور وہاں
جلوۂ حسنِ بتاں ہو سحرِ آئینہ

ایک دھوکے کے سوا اور صفائی ہے وہاں
کھاؤ موجود ہے یہ ماحضرِ آئینہ

اُس کی اس بے پروبالی میں تو یہ صورت ہے
قہر تھا ہوتے اگر بال و پرِ آئینہ

دیکھ دھوکے میں نہ آجانا صفا سے اُن کی[1]
کیوں ہے ابنائے جہاں میں اثرِ آئینہ

روبرو اس کے ہوا کی یہ بڑی بے ادبی
عیش لازم ہے کہ ہو سنگ وسرِ آئینہ

(۷)

ہند کہتے ہیں جسے ملکِ سلیمان ہے یہ
مل گیا خاک میں جس پہ کبھی پرستان ہے یہ

بلبلیں کہتی ہیں صیاد کا احسان ہے یہ
کہ ہمیں چھوڑ دے یہ کہہ کے گلستان ہے یہ

قطرۂ اشک کو میرے نہ سمجھنا اتنا
ہے تو اتنا سا، مگر کیا کہوں طوفان ہے یہ

ہوا کبھی دیکھتے ہی شام و شفق کا دم بند
لبِ جاناں پہ بہارِ مسی و پان ہے یہ

دہنِ یار کو دل عقل سے پوچھے ہے کہ کہہ
دُرجِ یاقوت ہے یا چشمۂ حیوان ہے یہ

تلوے اس شوخ کے آنکھوں سے ملوں وصل کی رات
اے فلک دل میں مرے ایک بس ارمان ہے یہ

کیوں نہ عالم میں ہو سیبِ ذقنِ یار کا شور
زخمِ دل کے لیے عاشق کے نمکدان ہے یہ

مو سے دیے ہیں کمرِ یار کو شاعر تشبیہ
کیا ستم ہے کمرِ یار پہ طوفان ہے یہ

آدمیت نہ ہوئی شیخ کو حاصل افسوس
اب تلک ویسا ہی حیوان کا حیوان ہے یہ

---

[1] ل: صفا سے

منع سو دفعہ نصیحت سے کیا ناصح کو — پھر بکے جاتا ہے کس شوق کا افسان ہے یہ

لے کے دل آنکھ بھی اب ہم سے ملاتے نہیں وہ
عیشؔ دیکھو تو کہ اللہ کی کیا شان ہے یہ

(۸)

بے قراری میں یہ دل کم نہیں سیماب سے کچھ — اور نہیں برق کی نسبت دلِ بیتاب سے کچھ
بوسۂ لب نے نہ کی دل کی حرارت زائل — نہ گھٹی آہ یہ تپ شربتِ عناب سے کچھ
کچھ تو ہے دال میں کالا کہ جو اس طرح سے آپ — آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں بیتاب سے کچھ
شیخ کو بزم میں رندوں کی نہ آنے دینا — کیوں وہ واقف نہیں اس بزم کے آداب سے کچھ

عیشؔ بے خواہشِ تقدیر سنا یاد رہے
لاکھ اسباب ہوں، ہوتا نہیں اسباب سے کچھ

(۹)

بکتا ہر ایک غم و حسرت و حرمان کے ہاتھ — خلق کا نفع و ضرر ہوتا گر انسان کے ہاتھ
نیم بسمل ہوں نہ جا چھوڑ کے سسکتا مجھ کو — تیرے قربان، لگا اور بھی اک تان کے ہاتھ
کیجے تو کیجے کیا کہیے تو کس سے کہیے — ناک میں آیا ہے دم اس دلِ نادان کے ہاتھ
مژدہ اے جوشِ جنوں فصلِ بہار[1] پھر آئی — چھیڑ کرنے لگا پھر ساتھ گریبان کے ہاتھ
ہم نشیں خاک کہوں تجھ سے حقیقت وہاں کی — ق — میں نے خط بھیجا تھا لکھ کے اک انجان کے ہاتھ
اس نے درباں کو دیا لے لیا درباں نے خط — اسے لو کٹوائے ہیں اس جرم پہ درباں کے ہاتھ

کام عیشؔ ایسی[2] بھی نادانی کا کرتا ہے کوئی
دے[3] دیا شیشۂ دل کس بتِ نادان کے ہاتھ

---

[1] ک: فصلِ بہار آئی ہے
[2] ک: ایسے بھی نادانی کے
[3] بنیادی نسخے میں مقطع کا دوسرا مصرع درج نہیں صرف کراچی کے نسخے میں ہے۔

(۱۰)[۱]

خوش رہو تم صنم، آمین اللہ — دور ہو تم سے غم، آمین اللہ
پھر وہ دن ہو کہ ہم اور تم خوش خوش — ہوویں یکجا بہم، آمین اللہ
ہو نہ دشمن کے بھی دشمن کو نصیب — ہجر کا رنج و الم، آمین اللہ
جام کوثر کا تجھے حشر کو عیشؔ!
دیں شفیعِ الامم، آمین اللہ

(۱۱)

تو اپنے عاشقِ شیدا کا حالِ زار تو دیکھ — دم اس میں باقی ہے، یا مر گیا پکار تو دیکھ
مری طرف ہے اگر دیکھنے کی قسم کھائی[۲] — نہ دیکھ اِدھر، ستمِ چرخِ فتنہ کار تو دیکھ
عیاں ہر اک پہ ہے بے اعتباریِ ہستی — اور اس پہ اس کا ہے کیا ننگِ اعتبار تو دیکھ
عنایتیں ہیں یہ ہم سے گناہ گاروں پر
تو عیشؔ وسعتِ الطافِ کردگار تو دیکھ

---

[۱] غزل (۱۰ - ۱۱) صرف کراچی کے نسخے میں ہے بنارس اور لندن کے نسخوں میں موجود نہیں۔

[۲] یہ مصرع وزن سے ساقط ہے۔ اگر "کھائی قسم" لکھا جائے تو موزوں ہو جاتا ہے

ی

(۱) ؎

گر نامہ بر نہیں، نہ ہو، پیکِ صبا تو ہے
اور یہ بھی گر نہ ہو، دلِ بے مدعا تو ہے

عاشق کو پیچ و تاب بلا سے ہوا، تو ہو
مکھڑے پہ اُس کے زلفِ سیہ خوشنما تو ہے

اُس آہِ بے اثر کو بھی رکھتے ہیں ہم عزیز
اس واسطے کہ سینے میں شورشِ فزا تو ہے

قسمت کا آگے دیکھیے کیا اور گُل کھلے
اُلفت میں تیری خونِ دل اپنا پیا تو ہے

گر ہو پسند خاطرِ عالی، تو آپ لیں
اپنی بساط میں یہ دلِ مبتلا تو ہے

ہر چند عاشقی میں ہیں رنج و تعب بہت
پر آہ اُس کے رنج میں بھی اک مزا تو ہے

اہلِ حسد کو گر نہیں پاداشں اُس کی ہاں
اچھا نہ ہو، نہیں سہی، روزِ جزا تو ہے

وہ شوخ بے وفا سہی، بے داد گر سہی
یہ سب سہی بلا سے مگر دل ربا تو ہے

زاہد تو چشمِ کم سے نہ دیکھ عیشِ خستہ کو
عاصی ہے، پھر غلامِ رسولِ خدا تو ہے

(۲)

آنسوؤں سے کیا فقط تر آستیں ساری رہی
عیشؔ نالوں سے مرے ہلتی زمیں ساری رہی

؎ غزل (۱ ۔ ۲ ۔ ۳) بنیادی نسخے میں شامل نہیں، یہ لندن کے نسخے سے شاملِ مجموعہ کی گئی ہیں۔ اور کراچی کے منتخب مجموعہ سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

جب ہوا مذکور جس مجلس میں وحشت کا مری
کیا کہوں مجلس کی مجلس شرمگیں ساری رہی

سب پہ روشن ہے تپِ دوری سے اُس کی شمع ساں
عمر صرفِ سوزِ غم اے ہم نشیں ساری رہی

کنجِ تنہائی میں ساری رات آنکھوں کے تلے
پھرتی بس صورت تری اے مہ جبیں ساری رہی

تھا دماغوں میں بھرا جن جن کے دولت کا غرور
حیف وہ سب چل بسے یہ سب یہیں ساری رہی

دیکھ کر اُس بُت کو بے خود ہوگیا یوں ہی دھری
طاق پر ناصح کی عقلِ دوربیں ساری رہی

یاد میں اُس زُلف کی مصروف ہمت اپنی عیش!
درپے تسخیرِ ملکِ ہند وچیں ساری رہی

(۳)

جب کہ گلشن میں خزاں سے گل خنداں نہ رہے
دل گرفتہ کہو کیوں بلبلِ نالاں نہ رہے

ایک ناکام رہا، عاشقِ شیدا، ورنہ
خانۂ غیر میں کس روز وہ مہماں نہ رہے

دلِ صدچاک ہے اُس کانِ ملاحت پہ فدا
لب ہر زخم سے کیوں شور نمکداں نہ رہے

اُس کماں ابرو پہ سو جان سے میں قربان ہوا
دل مرا کیوں ہدفِ ناوکِ مژگاں نہ رہے

کاوشِ دستِ جنوں چھیڑ اسے کہتے ہیں
چاہیے نام کو اک تارِ گریباں نہ رہے

جو پریشان کرے اور کو، یہ یاد رکھو !

غیر ممکن ہے کہ وہ آپ پریشاں نہ رہے

ہنس کے دکھلادے اگر وہ لبِ لعلیں اپنے

قدر و منزل تری اے لعل بدخشاں نہ رہے

جو سخن سنج و سخن فہم تھے عالم میں سنا

حیف صد حیف کہ اے عیشؔ وہ انساں نہ رہے

(۴)

دم مجھے دیتا ہے ہر روز وہ دم باز نئے
مجھ سے ہر روز برتتا ہے وہ انداز نئے

اس جفا پیشہ کو دل لائے کہاں سے کوئی
اُس کے ہر لحظے ہیں انداز نئے ناز نئے

کوچۂ یار کی جانب کو اُڑا جاتا ہے
طائرِ دل نے نکالے پر پرواز نئے

جل کے دل خاک نہ ہو کیونکہ بھلا بتلاؤ
سامنے آنکھوں کے جب اُن کے ہوں ہمراز نئے

آنکھ شرما گئی اور بات نہ آئی اُس کو
جب گلے میں نے کیے رات کو آغاز نئے

کس سے سیکھا ہے نگاہوں میں بتا تو مجھ کو
دل اُڑا لینے کے ڈھب اوبتِ طناز نئے

کام جو ہوتا ہے تقدیر میں ہوتا اُس سے
عیشؔ بن جاتے ہیں اسباب خدا ساز نئے

(۵)

پھول اللہ نے بنائے ہیں جھکنے کے لیے
اور بلبل کو بنایا ہے چہکنے کے لیے

آتشِ غم سے بنایا ہے مرے سینے میں
دل کو انگارے کی مانند دہکنے کے لیے

بچے کم بخت وہ دل کیونکہ بھلا جس دل کے
مستور ہونگے شوخ آ چکنے کے لیے

رند کہتے ہیں کہ خالق نے کیا ہے پیدا
رات دن ناصحِ بے ہودہ کو بکنے کے لیے

رحم اے چشم، بنایا ہے کہیں کیا دل کو
قطرۂ اشک ہو مژگاں سے ٹپکنے کے لیے

ک : رہے
۱ے غزل (۴) کے ابتدائی دو اشعار بنیادی نسخے میں نہیں ہیں یہ لندن کے نسخے سے شامل کیے گئے

۲ے ل : آن

شیخ کو رندوں سے کہہ دو کہ نظر میں رکھیں　　کیونکہ اب ڈھونڈے ہے قابو وہ کھسکنے کے لیے

عیش بتلا تو بنا ہے دلِ حیراں تیرا
مثلِ آئینہ یہ کس شکل کے تکنے کے لیے

(۶)

تیر مژگاں تو ہیں ابرو کی کمانوں کے لیے　　اور دلِ عشاق کے ہیں اُن کے نشانوں کے لیے
کیونکہ تڑپیں کہ دمِ ذبح تڑپنا ہے ہے　　سخت ہے، تنگ ہے، ہم قاعدہ دانوں کے لیے
شیخ، پیری میں یہ بدمستی و رندی، باز آ　　کیونکہ یہ باتیں تو زیبا ہیں جوانوں کے لیے
خوش رہے آپ محبت میں بتوں کی کس دن　　قطعہ　　دکھ سہے کب نہیں ان آفتِ جانوں کے لیے
یاد میں زلف کی تھے آگے پریشاں خاطر　　تنگ دل رہتے ہو اب غنچہ دہانوں کے لیے
شمع شب بزم میں رو رو کے کہے تھی سب سے　　ق　　یہ بیاں کرتی ہوں میں تم سے دوانوں کے لیے
مجھ پہ پروانوں کے جلنے کا اچنبھا کیا ہے　　میں سدا جلتی ہوں ان سوختہ جانوں کے لیے

سرخیِ پان ہے زیبِ لبِ جاناں اے عیش!
رشک کی جا ہے کہ رتبہ ہو یہ پانوں کے لیے

(۷)

خدا کے واسطے مجھ میں نہیں ہے جاں اتنی　　جفائیں کرتے ہو کیوں بہرِ امتحاں اتنی
کہے تھی بلبلِ شیدا کہ دیکھ لوں گل کو　　چمن میں مجھ کو اجازت ہو[1] باغباں اتنی
ملے ہوئے ہیں تصور میں اُس سے حالتِ دل[2]　　کہیں کسی سے سو فرصت ہمیں کہاں اتنی
ہوا حصول نہ مانندِ شمع جز نقصاں　　یہ عمر یوں ہی گئی آہ رائیگاں اتنی
قفس میں کہتی تھی[3] رو رو کے عندلیبِ چمن　　ق　　جو دیوے یاری بھی مجھ کو مری زباں اتنی
کہ گل کے آگے کروں عرضِ حال سو کمبخت　　نہیں ہے آہ مرے غم کی داستاں اتنی

---

[1] ک: ہووے
[2] ک: دل
[3] ل: ہے

مریضِ ہجر کو اُس کے بھلا سبب کیا ہے
جو آئیں ہچکیاں اس طرح ناگہاں اتنی

شعور حق نے دیا ہے تمھیں، اگر کچھ بھی
تو بات دل میں یہ تم سوچو، اے میاں، اتنی

جو یہ، سچ ہے نہیں اُس نے اُس کو یاد کیا
تو اُس کو آئی ہیں کیوں آج ہچکیاں اتنی

کسی طرح کی نہیں دل میں کچھ ہوس باقی
ق یہ آرزو ہے مرے دل میں میکشاں، اتنی

کہ اپنے ہاتھ سے فصلِ بہار میں لاکر
پلا دے بس مے گلگوں مجھے مغاں اتنی

تڑپ ہے جو دلِ عاشق میں تیرے شیدا کے
کہاں ہے برق، بتا تو سہی طپاں اتنی

خدا نے کی ہے عنایت زبان جو عیشؔ تجھے
کسی نے ہند میں پائی کہاں زباں اتنی

(۸)

آئے تھے پیغام جو جو جانبِ اغیار سے
کھل گئے سب ہم پہ اندازِ نگاہِ یار سے

مانگے ہے جاں کے عوض کہنا خدنگ یار سے
میرا ہر زخم جگر بوسہ لبِ سوفار سے

جو رہے سینہ سپر اُس ابروئے خم دار سے
آہ کب جھپکے ہے آنکھ اُس کی بھلا تلوار سے

دھجیاں اڑتی پھریں گی گل کی صحنِ باغ میں
نالہ گر کوئی ہوا سرِ عندلیب زار سے

ابرِ تر کی آبرو سب خاک میں مل جائے گی
ہو گئی مٹھ بھیڑ گر اس چشم دریا بار سے

شیشۂ دل میں بھرا ہو جس کی اُن آنکھوں کا کیف
کام کیوں رکھنے لگا وہ خانۂ خمار سے

جو نگہ رکھتا ہو جادو، سحر باتیں، دام زلف
دل بچائے کوئی کیونکہ اُس بتِ عیار سے

راست بازوں سے بھی وہ اے عیشؔ رہے ہے ٹیڑھ کی
دیکھیے بنتی ہے کیا اس چرخِ کج رفتار سے

(۹)

اک تو وہ رکھتے ہیں مژگاں کی سپاہیں ایسی
دل بچے خاک، ہوں جب اُس پہ نگاہیں ایسی

آدمی کیا ہے، فرشتے سے وہ لیں چھین ابھی
دل کے لینے کی انھیں یاد ہیں راہیں ایسی

ضبط مانع ہے فقط، ورنہ ترے تفتہ جگر
پھونک دیں چرخ کو ہاں، رکھتے ہیں آہیں ایسی

وہ ہمیں چاہے، یہ ہم چاہتے ہیں اللہ سے
بات اللہ سے ہم کیونکہ نہ چاہیں ایسی

اب تو دل لینے کو کرتے ہیں وہ سو قول و قسم
پھر کبھی جائیں، وہ جب ہم سے نباہیں ایسی

گُل کے غُنچے نہ ہوں یہ عقدے ہیں دل کے بتلا
اے صبا کھولی ہیں کب تو نے گرہیں ایسی

دل مجھ کا جاتا ہے عالم کا اُدھر آپ سے آپ
آہ کج رکھتے ہیں وہ شوخ کلاہیں ایسی

قیس و فرہاد نے دی عشق میں جاں تک اپنی
آگے ہوتی تھیں اجی سنتے ہو، چاہیں ایسی

ق

بات میں بات نکالے ہے وہ پرچول بھلا
کس کو معلوم ہیں جز اُس کے گناہیں ایسی

آپ بخشندۂ محشر ہیں، محمدؐ ہیں شفیع
واں گنہگاروں کی خاطر ہیں رفاہیں ایسی

عیشؔ اللہ ہے غفار بڑا نکتہ نواز
خوفِ عصیاں ہے کیا جب ہوں پناہیں ایسی [1]

---

[1] بنیادی نسخے میں مقطع درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ لندن سے لیا گیا ہے۔ کراچی کے نسخے میں بھی مقطع درج نہیں۔

(۱۰)

خزاں سے آہ حالِ گلستاں کیا تھا، ہوا کیا ہے
کہیں ہیں بلبلیں، اے باغباں کیا تھا ہوا کیا ہے

وداعِ جاں کیا عاشق نے تیرے آہ اُس پر بھی
نہ نکلا تیرے منہ سے میری جاں کیا تھا ہوا کیا ہے

سنایا حالِ دل اوّل سے آخر تک، تو سب سُن کر
لگا کہنے وہ ہو انجان، ہاں کیا تھا، ہوا کیا ہے

جوانی کے نشے میں کچھ نہیں اب سوجھتا اُن کو
بڑھاپے میں کہے گا ہر جواں کیا تھا ہوا کیا ہے

سبب آزردگی کا کچھ تمھاری میں نہیں سمجھا
خفا کس بات پر ہو تم یہاں کیا تھا ہوا کیا ہے

جہاں تھا آگے میخانہ اُڑے ہے خاک وہاں دیکھو
کہے ہے پیٹ سر اپنا مغاں کیا تھا، ہوا کیا ہے

پھنسی جب دام میں صیّاد کے بلبل، تو بس دل میں
کہے تھی دیکھ سوے آسماں کیا تھا ہوا کیا ہے

قریبِ صبح شمعِ تفتہ جاں کہتی تھی رو رو کر
میں ہوں اب دم کے دم مہماں، کیا تھا ہوا کیا ہے

اثر اُس دل میں ہو چلا تھا سو اب جل بجھے آپ ہی
ارادہ اپنا اے ضبطِ فغاں کیا تھا ہوا کیا ہے

مژہ تک آتے آتے اے لوخوں کا بن گیا پانی
دلِ شیدا نے بھیجا ارمغاں کیا تھا ہوا کیا ہے

سلہ ل : میہماں

بڑھی وہاں سرد مہری نالۂ دل سن مرا تجھ میں
اثر اے نالۂ آتش فشاں کیا تھا ہوا کیا ہے

دیے تو قصرِ جنت عاصیوں کو اپنی رحمت سے
تعالیٰ اللہ حالِ عاصیاں کیا تھا ہوا کیا ہے

تصور میں ترے اے ماہرو کچھ چپ ہی بہتر ہے
کہیں کیا حالِ دل مثلِ کتاں کیا تھا ہوا کیا ہے

اثر دپر ہو سفیدی جتنی اس ظالم نے اتنا بھی
نہ جانا سن کے غم کی داستاں کیا تھا ہوا کیا ہے

فسانے عیش شاہانِ سلف کے سن کے سوچو تو
مہیا ان کو سامانِ جہاں کیا تھا ہوا کیا ہے

(۱۱)

کب کہا میں نے مرا دل تم چرا کرے گئے
تھا پڑا کوچے میں تم آئے تھے پا کرے گئے

بے سبب کب ہم کو وہ صاحب منا کرے گئے
ہم نے چاہا غیر کو جب خار کھا کرے گئے

لے کے دل کہتے ہیں دیکھو تو ڈھٹائی آپ کی
کیوں جی کیوں کیا دل تمھارا ہم چرا کرے گئے

ایک کوڑی باز ہیں وہ آہ سب کے سامنے
دل مرا آنکھوں ہی آنکھوں میں اڑا کرے گئے

زعم میں اپنے ہمیں تھا دل نہ دینے کا گھمنڈ
سو وہ اک آفت ہیں اے لو منہ چڑا کرے گئے

بزم میں اس شمع رو کی ہے یہ معشوقوں کا حال
شمع کو لائے جلا کر، اور رلا کر لے گئے

عیش، تو اپنے گناہوں کو بتاتا تھا بہت
وہ تو بس اشکِ ندامت ہی بہا کرے گئے

(۱۲)

عاشقی میں دل کو کہنا چاہیے
جو کرے وہ ظلم سہنا چاہیے

مثلِ دریا غم میں اس کے رات دن
دیدۂ تر تجھ کو بہنا چاہیے

ننگِ سرکارِ جنوں ہے یہ لباس
وہاں تو مجنوں سا برہنا چاہیے

گر خدا دیوے، تو بلبل کے لیے — بھیجنا پھولوں کا گہنا چاہیے
فصلِ گل میں، بلبلو، ضبطِ نفس — پھونکنی اب تم کو شہنا چاہیے
شیخ صنعاں سے نہیں کچھ تم بڑے — عشق میں زنّار پہنا چاہیے
عیشؔ، بس جھگڑے میں حسن و عشق کے
یاد رکھ، چپکے ہی رہنا چاہیے

(۱۳)

بلبلو، مژدہ ہو، سبز ایک ایک ڈالی ہو گئی — فصلِ گل آئی، چمن میں نونہالی ہو گئی
دیکھنا، ہو جائے گا خورشید بھی حلقہ بگوش — زیبِ گوشِ یار گر سونے کی بالی ہو گئی
بند کیوں آنا ہوا گلشن میں اس کا باغباں — بلبلِ شیدا سے کیا بے اعتدالی ہو گئی
یاد میں ابروے جاناں کے جو شب لکھی غزل — اس کی اک اک بیت دیوانِ ہلالی ہو گئی
روبرو اس غنچہ لب کے کب ہلا سکتے ہیں کان — منھ کہاں پہلے گلوں کی گوشمالی ہو گئی
کیا کہوں نامِ خدا، ہاں اور بھی اس شوخ کی — خط کے آنے سے تو کچھ سج دھج نرالی ہو گئی
چشمِ تر دولاب کی مانند ساری عمر یہاں — غم میں تیرے اک بھری گر ایک خالی ہو گئی
دخترِ رز سے ملانی اب زباں اچھی نہیں — منھ لگی شہدوں کے، اب وہ بھی رذالی ہو گئی
بات کرتے دل ہچکتا ہے ہر اک کا اس سے عیشؔ!
کیونکہ اب تکیہ کلام اس بت کا گالی ہو گئی

(۱۴)

جو کہ عام مقام ہوتا ہے — خود بخود اس کا نام ہوتا ہے
اپنے منھ سے تعلّیاں اپنی — یہ تو اوچھوں کا کام ہوتا ہے
یارِ بن عاشقوں کے مذہب میں — مے کا پینا حرام ہوتا ہے
عرش پر غل مچے ہے جب وہ شوخ — جلوہ فرمائے بام ہوتا ہے

سے ل : اور

لے کے دل، یہ جفائیں خوب نہیں — اِس کا وہاں انتقام ہوتا ہے
اور اس سے بھی رکھ تو قطعِ نظر ق — مختصر یہ کلام ہوتا ہے
آدمی کو جہاں میں آدمی سے — یار سو دفعہ کام ہوتا ہے

یاد آتی ہے اس کی گردشِ چشم
عیشؔ جب دورِ جام ہوتا ہے

(۱۵)

مرے اشکوں کے آگے سلکِ گوہر کیا ہے؟ یوں ہی ہے
اور آگے لختِ دل کے لعل در کیا ہے؟ یوں ہی ہے

معاذ اللہ یہ وہ ہے، اُڑا دے گا دھوئیں اُس کے
مقابل دُودِ دل کے چرخِ اخضر کیا ہے؟ یوں ہی ہے

کبھی لے کر نہ اُس کا نام اُس کی آبرو کھونا
مری آنکھوں کے آگے حوضِ کوثر کیا ہے؟ یوں ہی ہے

سنے ہے کون، نوبت خانے میں آوازِ طوطی کی
مرے نالوں کے آگے شورِ محشر کیا ہے؟ یوں ہی ہے

لیے پھرتا ہے کیا اے ابرِ تر کچھ ہے خبر تجھ کو
دلِ بسمل کے آگے برقِ مضطر کیا ہے؟ یوں ہی ہے

زمین و آسماں کو دم میں کر دیں درہم و برہم
مری آہوں کے آگے بادِ صرصر کیا ہے؟ یوں ہی ہے

مرے داغِ دلِ روشن کے آگے، عیشؔ گردوں کی
سنے کون، اس کا وہ خورشیدِ خاور کیا ہے؟ یوں ہی ہے

(۱۶)

ایک بھی میداں میں گر وہ ہاتھ قاتل چھوڑ دے
سامنے اس کے اگر رستم بھی ہو، دل چھوڑ دے

نیم جاں چھوڑے ہوئے جاتا ہے جس ناکام کو
دامنِ قاتل کہو کیوں کر وہ بسمل چھوڑ دے

ناصحا ہرگز تو سننے کے نہیں عاشق تری
آ ضلالت میں نہ پڑ، یہ فکرِ باطل چھوڑ دے

چاہنا اِس کا غضب ہے کھینچ لائے گا اُسے
یہ نہیں ممکن مرا دل ہو کے مائل چھوڑ دے

نالہ و فریادِ بلبل ہے عبث کیوں کر بھلا
دام میں لایا ہو جو کوئی بمشکل چھوڑ دے

ہنس کے لیلیٰ نے کہا، جب قیس کو بدتی ہوں مرد
باندھنی وہ ٹکٹکی تو سوے محمل چھوڑ دے

جاتی رہوے گی کسی کی جان ناحق مفت میں
مان تو غیروں کی آنا ہو کے شامل چھوڑ دے

عیش سچ کافر وہ ایسی ہی بلا کا ہے بتا
سامنے اُس کے اگر رستم بھی ہو دل چھوڑ دے

(۱۷)

دب گئی جو زلفِ شب رخسارِ دلبر کے تلے
آ گیا ملکِ حبش سب حکمِ قیصر کے تلے

ہے تصوّر اُن لبوں کا دیدۂ تر کے تلے
چشمۂ حیواں ہے شاید حوضِ کوثر کے تلے

سبزیِ خط ہے نمایاں اُس لبِ تر کے تلے
یا زمرّد ہے دھرا یاقوتِ احمر کے تلے

وہ رُخِ تاباں ہے اُس زلفِ معنبر کے تلے
چاند ہے ابرِ سیہ کی یا یہ چادر کے تلے

دیکھ پاویں اُس قدِ رعنا کو تو گلشن میں آہ
جا نہ پھٹکیں قمریاں سرو صنوبر کے تلے

ہو دو چار اُس شوخ سے واعظ تو عینِ وعظ میں
شرط بدتے ہیں نہ آ رہوے جو منبر کے تلے

قاعدہ دانِ وفا ہے دل مرا، تم دیکھنا — کس ادب سے جان دے گا اس کے خنجر کے تلے

شمع سے گلگیر شب کہتا تھا، میں تو تھک گیا — اور ترے نکلے چلے آتے ہیں سر سر کے تلے

حشر کے دن بھی بحولِ قوتِ پروردگار
عیش ہوگا سایۂ لطفِ پیمبر کے تلے

(۱۸)

جو جہاں میں ہدفِ تیرِ جفا ہوتا ہے — سو وہ عاشق ہی کلول نامِ خدا ہوتا ہے

تم بجا کہتے ہو، عاشق تو بُرا ہوتا ہے — پر ہو تم کو بھی کچھ خوفِ خدا ہوتا ہے

دل اگر سینے میں سرگرمِ بکا ہوتا ہے — تو دکھا دیں گے کہ کیا ہے ابھی کیا ہوتا ہے

درد سے نالۂ بلبل یہ بھرا ہوتا ہے — ہاتھ ہر ایک کا بس دل پہ دھرا ہوتا ہے

اختلاط اوروں سے، وہاں روز نیا ہوتا ہے — اور یہاں بات میں بھی عذرِ حیا ہوتا ہے

دل کو ہر چند بچایا، نہ بچا، پر نہ بچا — کب خدنگِ نگہِ یار خطا ہوتا ہے

نیم بسمل تجھے کر چھوڑ دیا منھ پہ نہ لا — اس میں کیوں بازوے قاتل کا گلا ہوتا ہے

نہیں بے وجہ ہوا وہاں کہیں سبزا آغاز — کہ جہاں زخمِ دل ایک ایک ہرا ہوتا ہے

اُس سے گر پوچھتے ہیں ہم خفگی کا باعث — تو مزا یہ ہے کہ وہ اور خفا ہوتا ہے

کان دھرتا نہیں وہ قصۂ قیس و فرہاد — جس نے افسانۂ غم اپنا سُنا ہوتا ہے

کھیل سمجھے ہے وہ جورِ فلکِ کجرو کو — جورِ معشوق یہاں جس نے سہا ہوتا ہے

مبتلاے مرضِ عشقِ بتاں چارہ کرو! — عقل پکڑو کوئی محتاجِ دوا ہوتا ہے

قیس و فرہاد پہ موقوف نہیں کہیے تو — نالہ کمبخت کس عاشق کا رسا ہوتا ہے

شمع کو کہتے ہیں کیوں ہنستے ہی رو دیتی ہے — کیوں نہ روئے یہی ہنسنے کا مزا ہوتا ہے

کوچۂ قاتلِ سفاک تو چشم بد دور — روز صد غیرتِ بازارِ منیٰ ہوتا ہے

اور بھی سادہ بنا پھرتا ہے، تر دیکھیے آج — آبِ شمشیر سے کس کس کا گلا ہوتا ہے

ے ل : جنا

ہو گیا دستِ دعا گوہرِ مقصود سے پُر
کیوں نہ ہو شکلِ صدف وقتِ دعا ہوتا ہے

قطعہ

نہیں موقوف یہ کچھ شیریں و لیلیٰ پہ کہو
کوئی معشوق بھی عاشق سے بھلا ہوتا ہے

سخت حیران ہوں میں اس سے کہ یہ اُن کا دل
کیا کہیں ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے

ق

میرا ناخن تو وہ ناخن ہے کہ جس سے شبِ وصل
عقدۂ بندِ قبا یار کا وا ہوتا ہے

اُس سے پوچھو چمنِ دہر میں ایسا عقدہ
تجھ سے بھی وا کوئی اے بادِ صبا ہوتا ہے

عقل حیراں ہے ترے تیر کے زخموں سے یہاں
خون جو نکلے ہے تو وہ سبز ہرا ہوتا ہے

یہ تو بتلا دے ترے تیر کا پیکاں قاتل
آہ کس زہر کے پانی سے بجھا ہوتا ہے

دم میں آنا نہ صبا کے، یہ ہوا باندھتی ہے
اس سے کیا اور بھلا اس کے سوا ہوتا ہے

شعلہ سے شمع کے غنچے کو کیا صبح کو گل
یہ دم بادِ صبا عقدہ کشا ہوتا ہے

حضرتِ عشق کے ہیں عیشِ جہاں لاکھوں رنگ
ایک یہ بھی ہے کہ بندے سے خدا ہوتا ہے

(۱۹)

دام میں کہتی تھی یوں بلبلِ نالاں ہم سے
چھوٹا فصلِ بہاری میں گلستاں ہم سے

دیکھ تو سانگ تو اس کے کہ یہ پل پل بھر میں
کاوشیں کرتی ہے کیا کیا تری مژگاں ہم سے

ہم سے پوچھو نہ پریشانیِ دل کا باعث
ہو گئی برہم کہیں وہ زلفِ پریشاں ہم سے

آہ سینے میں؛ نہ خون دل میں نہ اشک آنکھوں میں
تم نے دیکھے ہیں کہیں بے سر و ساماں ہم سے

ہم نے کیا اُس کا بگاڑا ہے تو انصاف تو کر
غم ترا ہوتا ہے کیوں دست و گریباں ہم سے

قصہ کوتاہ، غمِ یار میں تنہا پا کر
لبنیاں لیتی ہے کیا کیا شبِ ہجراں ہم سے

لبِ میگوں سے مرے یار کے نسبت کیا ہے
گفتگو آ کے کرے لعلِ بدخشاں ہم سے

اور جو چاہو سو بیداد کرو پر تم کو
دیکھا جائے گا نہ ہم بزمِ رقیباں ہم سے

ہیں وہ ہم محوِ تحیر کہ ابھی برسوں تک
حیرت آموز ہو آئینۂ حیراں ہم سے

یہاں تو یہاں روزِ جزا کہتے ہیں جس کو نہ ہوا
وہاں بھی بیداد کا اُس کی کوئی پرساں ہم سے

کب بہار آتی ہے کب جوشِ جنوں ہوتا ہے
ہوں گی کب دیکھیے آباد یہ گلیاں ہم سے

دے جلا آئینے کو گرمیٔ خاکستر سے ۔۔۔ سوزِ غم پھر نہ کیا جائے گا پنہاں ہم سے
اس میں کچھ عذر نہیں ہم کو یہ دل حاضر ہے ۔۔۔ بدلیں وہ اپنے اگر تیر کا پیکاں ہم سے
ساتھ لے کے تم آتے ہو یہاں غیروں کو ۔۔۔ دیکھو یہ خوب نہیں چھیڑ مری جاں ہم سے
تم کو اندیشہ ہے کس بات کا یہاں آنے میں ۔۔۔ ق ۔۔۔ کہ جو اس طرح سے رہتے ہو گریزاں ہم سے
گر یہ ڈر ہو کہ یہ لے لیوے گا بوسہ رُخ کا ۔۔۔ تو بس اٹھوالو اسی بات پہ قرآں ہم سے
ابر نیساں سے مرے دیدۂ تر نے یہ کہا ۔۔۔ ق ۔۔۔ نہ ملا آنکھ تو اے ابرِ دُر افشاں ہم سے
تو تو کیا ہے[1] یہ فلک نے بھی نہ دیکھے ہوں گے ۔۔۔ نکلے بن بن کے جو ہیں گوہرِ غلطاں ہم سے
ہمدمو! نشترِ مژگانِ بکاں کی لذّت ۔۔۔ دہنِ زخم سے کہتی ہے رگِ جاں ہم سے

اس قدر ضُعف تھا اک قطرۂ اشک آنکھوں سے
عیشؔ لایا نہ گیا تا سرِ مژگاں ہم سے

(۲۰)

تو ہی انصاف سے کہہ جس کا خفا یار رہے ۔۔۔ اپنے جینے سے نہ کس طرح وہ بیزار رہے
زخمِ دل چھیلے کبھی، اور کبھی زخمِ جگر ۔۔۔ ناخنِ دستِ جنوں کب مرے بیکار رہے
ان جفاؤں کا مزہ تم کو چکھا دیویں گے ۔۔۔ ہاں اگر زندہ ہم اے چرخِ جفاکار رہے
میکدے میں ہے بڑی یہ ہی مغاں کی پیری ۔۔۔ کہ بس اُس چشمِ سیہ مست سے ہشیار رہے
جلتے بھُنتے رہے ہم، بزمِ بتاں میں لیکن ۔۔۔ شمع ساں اُس پہ بھی سر دینے کو تیار رہے
یوں تو کیا خواب میں بھی یار کا ملنا معلوم ۔۔۔ اپنے گر آہ یہی طالعِ بیدار رہے
ایک جا سینے میں ان دونوں کا رہنا ہے محال ۔۔۔ یا یہ دل ہی رہے یا آہ شرر بار رہے
اُس سے دل خاک ہو اُمیدِ حصولِ مطلب ۔۔۔ جس سے اک بوسے پہ سو طرح کی تکرار رہے
لے کے پیکاں سے ترے تیر تبا تو قاتل ۔۔۔ خون میں ڈوبے نہیں کب تالبِ سوفار رہے
جنسِ دل آتشِ الفت میں جلے جو چاہے ۔۔۔ پر کسی طرح تری گرمیِ بازار رہے

---

[1] ل: تو تو کیا چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھے ہوں گے

بازیٔ عشق میں چپکے رہو کیا خاک کہیں — ایک دل رکھتے تھے پاس اپنے سو وہ ہار رہے

ایسا دم ناک میں آیا ہے کہ ہم راضی ہیں
عیشؔ گر سینے میں اس دل کے عوض خار رہے

(۲۱)

اشک کا نکلے وہ قطرا بن کے گوہر چاہیے — دیکھ کر جس کو خجل ہو جائے اختر چاہیے

اے دلِ بیتاب کرنا نالہ، وہ سر چاہیے — چھوٹتے ہی جس کے وہ ہو جائے مضطر چاہیے

ہاں رگِ جاں پر مری سن اُو وصفِ مژگانِ یار! — اب لگانا متّصل نشتر پہ نشتر چاہیے

پھر تری سعی و تردّد سے نہیں ہوتا حصول — حاصلِ ہر شے کو اے ناداں مقدّر چاہیے

تیرے کوچے میں نظر آتے ہیں اک ناکام ہم[1] — اس طرف بھی دیکھنا اے بندہ پرور چاہیے

تنگدستی کا نہ لا شکوہ زباں پر زینہار — یوں بھی ہوتا ہے جہاں میں دل تونگر چاہیے

مر گیا ہے تیری فرقت میں وہ ناکام اس کے آہ — تم کو بھی آنا جنازے پر مقرر چاہیے

خط[2] تجھے اے نامہ بر اس کے لیے کیا لکھ کے دیں — حالِ دل لکھنے کو اپنے ایک دفتر چاہیے

یہ پری رُو بس نگاہوں میں اڑا لیتے ہیں دل
عیشؔ چلنا ان کے سائے سے بھی بچ کر چاہیے

(۲۲)

صلح اُن سے ہمیں کیے ہی بنی — دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی

زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اُن کے مے پیے ہی بنی

لائے وہ ساتھ غیر کو لاچار — پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی!

لے کے دل وہ خفا ہوئے ہم کو — اُس پہ بھی معذرت کیے ہی بنی

---

۱ ل: تیرے دروازے پہ پھرتے ہیں پڑے ناکام ہم

۲ یہ شعر بنیادی نسخے میں شامل نہیں۔ ل سے شامل کیا گیا۔

کس کا تھا پاسِ شوقِ ظلم کہ عیشؔ!
ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی ہی

(۲۳)

واعظ نہ ڈرا ہم کو کوئی بات کر ایسی
مذکور ہو جس میں کہ قد ایسا کمر ایسی
چھیڑا نہیں اُس زلف کو اُس نے تو کہاں سے
بُو باس یہ لائی ہے نسیمِ سحر ایسی
ہو ابر سے عالم میں خجالت مجھے حاصل
ہیٹی نہ کہیں کیجیو اے چشمِ تر ایسی
جاتی نہ رہے جان کہیں مفت کسی کی
آ دیکھ، کہا مان، تو باتیں نہ کر ایسی
جز اپنے کسی کو وہ سمجھتے نہیں خس بھی
یاروں کے دماغوں میں بھری ہےگی چڑ ایسی
جل بھُن کے ہوں خاک آہ دلِ و جان کہاں مان
آفت نہ کہیں ڈھائیو سوزِ جگر ایسی
اے عیشؔ ملا دل تو ملا ہم کو وہ دشمن
اور آہ ملی ہم کو تو وہ بے اثر ایسی

(۲۴)

حالت یہ میری شام سے تا پگاہ تھی
دل میں نہاں تھا درد عیاں لب پہ آہ تھی
محشر میں آ گئے داورِ محشر کے میں تو کیا
اک خلق اُس کے ہاتھ سے بس داد خواہ تھی
تیر و سنان و تیغ کا تو نام ہے یوں ہی
اُس کی تو اُن بھووں سے انوکھی نگاہ تھی
ناحق تھا آہ شیخ و برہمن میں اختلاف
دیکھا تو میکدے سے بھی کعبے کو راہ تھی
نام خدا تھا عیشؔ رُخ اُس کا وہ رُخ کہ بس
شرمندہ جس سے روشنیِ مہر و ماہ تھی

(۲۵)

وہ تو عاشق کو لیے پھرتے ہیں گھر گھر کھینچے
جب مزہ ہو انھیں جذبِ دلِ مضطر کھینچے
لے خبر جلد، کہ بیمارِ غمِ ہجر ترا
نہیں امید کہ عرصہ کوئی دم بھر کھینچے

رحم آیا نہ کبھی تجھ کو یہاں ساری عمر
دل نے صدمے تری فرقت میں برابر کھینچے

تیرے نقشے پہ کھپا جائے ہے دل عالم کا
کوئی نقشا ترا اُس طرح سے دلبر کھینچے

سامنے مجھ سے بلاکش کے ستم ہے ظالم
پنجۂ شانہ تری زلفِ معنبر کھینچے

جس کا دل فوجِ غمِ یار نے ہو گھیر رکھا
ہے ستم اُس پہ کہ وہ ناز کا لشکر کھینچے

جائیں بن کاغذِ آتش زدہ اطباقِ فلک
نالۂ دل مرا اگر تو سے فلکِ سر کھینچے

مسکرانے ہیں جو آجائے نظر دانت ترا
تو اُسے دیکھ خجالت ابھی گوہر کھینچے

ابھی سو جان سے مرتیغ جھکا دے گردن
تیغِ بیداد جو وہ شوخِ ستم گر کھینچے

خوبی قسمت کی کہ وہ ہم سے چھڑا دے دامن
اور غیروں کو وہ یوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے

کیا کشش ہے نگہِ یار میں دیکھا تم نے
دل کو سینے سے لیے جائے ہے باہر کھینچے

دشمنِ جان ہے اپنا وہ بقولِ شاعر
جو کہ نادانی سے آئینے پہ خنجر کھینچے

اختیار اس میں نہیں عیشؔ کسی کا ہرگز
آدمی کو لیے پھرتا ہے مقدر کھینچے

(۲۶)

ہم تو پامال بھی یہاں اُو بتِ مغرور ہوئے
جو چلے اس پہ بھی ہے نہ ترے دور ہوئے

رحم اے لاغریِ عشق یہاں تک تو ہوا
بدلی کروٹ بھی تو احسان کشِ مور ہوئے

مژدہ اے جوشِ جنوں زخمِ جگر کے ٹانکے
سب کے سب ٹوٹ گئے ٹکڑے[1] سب انگور ہوئے

ہم بھی سنتے ہیں دل و دیدہ کی خاطر یارو!
رشکِ جمشید ہوئے غیرتِ فغفور ہوئے

اے اجی حضرتِ دل، آپ بھلا عشق میں کیوں
ایسے مختار ہوئے تھے کہ جو مجبور ہوئے

لے مبارک ہو تجھے، آج پھر اے زخمِ جگر
ناخنِ دستِ جنوں تیز بدستور ہوئے

قاضی و محتسبِ شہر سے لے تا واعظ
سب کے سب اس نگہِ مست کے مخمور ہوئے

مژۂ یار سے کیا دل نے بگاڑی ہے کہیں
رونگٹے تن پہ جو نیشِ سرِ زنبور ہوئے

---

[1] ل : ٹکڑے

عیشؔ وہ سوختہ جاں ہوں کہ پس از مرگ مرے
داغ سینے کے چراغانِ سرِ گور ہوئے!

(۲۷)

دل مرا تم نے چرایا مرا جی جانتا ہے
جس سلیقے سے اڑایا مرا جی جانتا ہے

آتشِ عشق میں اس شیشۂ دل کو پتھر
میں نے جس طرح بنایا مرا جی جانتا ہے

مسّی و پاں نے لبِ یار پہ اے شام و شفق
جو مجھے رنگ دکھایا مرا جی جانتا ہے

تم چھپاتے ہو چھپاؤ نہیں کہتے، نہ کہو
تمھیں جس جس نے لگایا مرا جی جانتا ہے

بے وفائی پہ تری میں نے جو کی تجھ سے وفا
بے وفا اس کو ترا پا مرا جی جانتا ہے

کہنا اس بات کو بے فائدہ ہے جو میں نے
غم ترے عشق میں کھایا مرا جی جانتا ہے

آہ اس شوخ پری رو سے لگا کر دل کو
جو مزہ میں نے اٹھایا مرا جی جانتا ہے

اے فلک نقشِ کفِ پا کی طرح خاک میں آہ
تو نے کس کس کو ملایا مرا جی جانتا ہے

کر کے زخمی دلِ بیتاب کو اے برقِ نگاہ!
تو نے جس طرح ہنسایا مرا جی جانتا ہے

سامنے لوگوں کے میں چپ ہوں مگر پہلو میں
دل نے جو شور مچایا مرا جی جانتا ہے

سوزِ دل عیشؔ یہ جوں شمع بقولِ غمگیں
میں زباں پر نہیں لایا مرا جی جانتا ہے

(۲۸)

الٰہی جیسے ہم اس شمعِ انجمن سے ملے
اسی طرح سے ہر ایک اپنے گلبدن سے ملے

ملے نہ شیخ سے دل اور نہ برہمن سے ملے
ملے تو اس کے رخ و زلفِ پر شکن سے ملے

موئے پہ قبر میں کون اور خستہ تن سے ملے
کفن بدن سے ملے اور بدن کفن سے ملے

نہ تنگ کر مجھے اس نے کہاں یہ منھ پایا
کہ گل کا غنچہ ترے غنچۂ دہن سے ملے

بھلاوے اس کو ابھی پل میں چوکڑی ساری
نگاہِ شوخ اگر آہوے ختن سے ملے

ے مندرجہ غزل بنیادی نسخے میں مکرّر درج ہے۔ البتّہ دو شعر بعد کی غزل ل. میں زائد ہیں۔

خدا نے قطع کیا ہے تجھی پہ یہ جامہ — پھبن کسی کا ترے کس طرح پھبن سے ملے

وہ چھوڑے کیونکہ بھلا شغلِ دل جلانے کی — مزا جسے دلِ آشفتہ کی جلن سے ملے

یہاں تو پیچ اُٹھایا کرے دلِ صد چاک — ستم ہے شانہ وہاں زلفِ پُرشکن سے ملے

فضائے سینہ میں یوں ہے ہجوم آہوں کا — درخت جیسے کہ آپس میں ہوئیں گھن سے ملے

ق

ہوا یہ ہے ہمیں ارشادِ مشفقانہ جو کل — ہم ایک بزم میں ہاں ایک اہلِ فن سے ملے

کہ یاد رکھ تو ہے شعروں میں عیب ربطِ کلام — وہ شعر ہوں کہ نہ ہرگز سخن سخن سے ملے

اور ایک اس کے سوا یاد رکھ یہ ہے خوبی — وہ طرز ہو کہ نہ طرزِ نو و کہن سے ملے

پھر اس کے بعد دمِ سرد بھر کے فرمایا — یہ نکتے ہم کو سنا تھے بڑے جتن سے ملے

سو تیرے آگے بیاں ہم نے کر دیے یوں ہی — بیان کیجیو جو شائقانِ فن سے ملے

زہے نصیب تجھے اس طرح ملی دولت — وہ جو ملے بھی کسی کو تو ایک کھٹن سے ملے

کہیں سنیں گے ہم آپس میں دردِ دل اپنا
چمن میں عیشؔ ہو جو ہم بلبلِ چمن سے ملے

(۲۹)

وہ شراب کہ جس میں خمار نہ ہو، ارے ساقیا اُس سے چھکا دے مجھے
نہ ہو مدِّ نظر جو چھکانا تجھے، تو بس ایک ہی جام پلا دے مجھے

کوئی میری طرف سے برائے خدا کہو اُس سے یہ اتنا کہ بادِ صبا!
کوئی ڈھب بنے تجھ سے تو یار کہ ما نہیں زلف کی بُو ہی سنگھا دے مجھے

یہ نصیحتیں اوروں کو جا کے سنا، ارے ناصحا مجھ سے نہ باتیں بنا
ملے جس میں وہ مجھ سے کہ یار مرا کوئی ایسی تو راہ بتا مجھے

مجھے تو نے ہی نشو و نما ہے دیا، مجھے تو نے ہی مرجعِ خلق کیا
کروں عرض یہ کس سے میں تیرے سوا، تو ہی ناخنِ عقدہ کشا ہے مجھے

بے خمار کے ہاتھوں سے ناک میں دم، بھلا ساغرِ چشم سے اپنے صنم
ترے صدقے میں تجھ کو خدا کی قسم، ذرا بادۂ روح فزا دے مجھے

ابھی ناصح و شیخ کے ڈھول جڑوں، ابھی واعظِ شہر سے جا کے لڑوں
ارے ساقی چل اٹھ ترے پاؤں پڑوں، بھکا آیا ہے ابر چھکا دے مجھے

اُسے نخوتِ مال و متاع رہی، تو یہ میں نے بھی لاکھ کی ایک کہی
ارے دے گا تو کیا پرے ہٹ تو سہی، میں خدا کا ہوں میرا خدا دے مجھے

ہوا جذبۂ عشق کا یہ تو اثر، کہ وہ لوگوں میں آن کے شام و سحر
یہ ہی کہتے ہیں سینے پہ ہاتھ کو دھر، کوئی عیشؔ کو جلد بلا دے مجھے

(۳۰)

مژگاں کہے تیر کا پیکان ہوں میں بھی
تو دل ابھی کہتا ہے کہ قربان ہوں میں بھی

مشتاق ترا کیوں بصد آبلہ پا ہے
اے سرزنشِ خارِ بیابان ہوں میں بھی

شیریں بنی لب سن کے کہا اُس کے ذقن نے
وہ رشکِ شکر ہے تو نمک دان ہوں میں بھی

پروانے کو جب پھونک چلی شمع تو بولی
لو منتظرِ جنبشِ داماں ہوں میں بھی

لاتی ہوں بلا دیکھیو کیا شانے کے سر پہ
چھیڑا تو ہے پر زلفِ پریشان ہوں میں بھی

جاں چل بسی دل قطرۂ خوں ہو کے کہے ہے
مژگاں سے کوئی پل ہی کا مہمان ہوں میں بھی

کہہ دو شبِ ہجراں سے کہ اُس زلفِ سیہ کا
ہے شرط کہ اب سلسلہ جنباں ہوں میں بھی

یہ اور نیا کفر سنو زلف کہے ہے
ہوتے تو بڑھاپے میں مسلمان ہوں میں بھی

اندھیر پڑا اے دلِ پُرخوں ترے آگے
مسّی کہے زیبِ لب و دنداں ہوں میں بھی

دل ہو چکا زخمی تو کہا آہ جگر نے
اور ناوکِ مژگاں پہ ارمان ہوں میں بھی

کھلتے نہیں کیوں پائے نگاریں سے مرا دل
جوں برگِ حنا خوں بدل اے جان ہوں میں بھی

یہ گل نے کہا نرگسِ شہلا سے کہ بے دید!
تو آنکھ ہے گلشن کی، تو سن کان ہوں میں بھی

ہر قطرۂ اشک ابر سے کہتا ہے گرہ میں
رکھتا ہے یہ بس سیکڑوں طوفان ہوں میں بھی

زلفِ رخِ جاناں یہ کھلے منھ پہ کہے ہے
زنجیرِ درِ کعبۂ ایمان ہوں میں بھی

نخوت کدۂ دہر کا کچھ حال نہ پوچھو ق ہر مور کہے ہے کہ سلیمان ہوں میں بھی
چونٹی بھی کہے ہے کہ مجھے گھی ہی سے کھاؤ یہ رنگ جہاں دیکھ کے حیران ہوں میں بھی
یہ یاد رہے اہلِ تبختر کو مری بات کہتا ہوں پکارے علی الاعلان ہوں میں بھی
کچھ کام نہیں اور جہاں میں مجھے ہرگز دندان اگر وہ ہے تو سندان ہوں میں بھی
وہ کہتے ہیں لوگوں میں جو مٹکا کے کمر کو ق کھا کھا کے قسم صاحبِ دیوان ہوں میں بھی
بس[1] ان سے یہ کہہ دو کہ جو دعویٰ ہے تو آؤ موجود یہاں تم سے مری جان ہوں میں بھی

کل عیش کہا دل سے جگر نے تری وحشت
گر دستِ جنوں ہے تو گریباں ہوں میں بھی

(۳۱)

سینہ و دل اپنا، لبریزِ شرر ہونے کو ہے
برق سے کہہ دو کہ ہٹ جا نالہ سر ہونے کو ہے
بلبلو سنتی ہو، گل شمعِ سحر ہونے کو ہے
یہ بروئے کارِ اعجازِ دگر ہونے کو ہے
یوں جو طوفاں خیز اپنی چشمِ تر ہونے کو ہے
وقفِ مژگاں کیا کہیں لختِ جگر ہونے کو ہے
فتنہ کیا برپا ہو دیکھا چاہیے، کہتے ہیں آج
جلوہ فرما بام پر وہ فتنہ گر ہونے کو ہے
کیا کہیں شوقِ شہادت ہے دلِ شیدا کو جو
اس نگاہِ نا .سے سینہ سپر ہونے کو ہے
اس[2] سے یوں کہہ دے کوئی سوئے عدم دنیا سے آج
کوچ عاشق کا ترے، اے سیمبر ہونے کو ہے

---

۱ قطعہ کا یہ شعر بنیادی نسخے میں نہیں ہے۔ صرف لندن کے نسخے میں ہے۔
۲ یہ شعر بنیادی نسخے میں شامل نہیں، ل سے لیا گیا۔

خواہشِ اکسیر کیوں ہم کو' اجی' ہونے لگی!
دل ہمارا آپ ہی وہاں خاکِ در ہونے کو ہے
نامہ بر کیا چاہیے پر وا نہ رنگِ رُخ مرا
خود ہوا سے شوق میں وہاں نامہ بر ہونے کو ہے
ابرِ نیساں سے کہو آ، سیکھ جا آنسو مرا
اب کوئی پل میں سرِ مژگاں گُہر ہونے کو ہے
عیشؔ، دل میں اُس پری وش کے ہماری آہ کا
رنگِ اعدا سے ہوا ظاہر، اثر ہونے کو ہے

(۳۲)

تجھ کو اے دل، ہوسِ زر کبھی ایسی تو نہ تھی
اور جان اس لیے مضطر کبھی ایسی تو نہ تھی
یہ رقیبوں نے پڑھایا ہے، زبان آپ کی آہ
جیسی اب چلتی ہے فرفر، کبھی ایسی تو نہ تھی
کچھ تو در پردہ لگاوٹ ہے، نہیں تو آگے
بھیڑ ہوتی ترے در پر کبھی ایسی تو نہ تھی
کیا ہوا آہ خدا جانے، سنا جان مری
اب جو قابو سے ہے باہر کبھی ایسی تو نہ تھی
اب کے جو ٹھوکریں کھائی ہیں رہِ عشق میں آہ
کھائی دل نے مرے ٹھوکر کبھی ایسی تو نہ تھی
یہ ترا فیض ہے، ہم جانتے ہیں، اے دیدۂ تر!
شاخِ غم پہلے تناور کبھی ایسی تو نہ تھی
یہ فقط میرے جلانے کے لیے ہے، ورنہ
تُو تجھے پھرنے کی گھر گھر کبھی ایسی تو نہ تھی

سچ بتا کس نے سکھائیں یہ جفائیں تجھ کو
چال ہاں تیری ستم گر کبھی ایسی تو نہ تھی

خونِ عاشق میں بجھایا ہے مقدّر تجھ کو
تجھ میں آب اے دمِ خنجر کبھی ایسی تو نہ تھی

کس نے بہکایا ہے بتلا تو طبیعت تیری
مجھ سے اے شوخ، مکدّر کبھی ایسی تو نہ تھی

جان کیوں کر نہ دے اس رشک سے کالا کافر[1]
زلف دوستی تری اُڑ کر کبھی ایسی تو نہ تھی

اس زمانے میں جو ہے اہلِ ہنر پہ تکلیف
آگے عیش اہلِ ہنر پہ کبھی ایسی تو نہ تھی

(۳۴۳)

چمن میں دیکھ غنچوں کو جوانی اپنی یاد آئی
فسانہ سن کے بلبل کا کہانی اپنی یاد آئی

جو دیکھی نرگسِ بیمار، گلشن میں تو بس ہم کو
بہت رقّت ہوئی اور ناتوانی اپنی یاد آئی

سنا کل دیکھتے ہی آئینے کو کیا کہوں تم سے
مجھے بس آنکھ ہے ہے ڈبڈبائی اپنی یاد آئی

چمن میں چہچہا بلبل کا بس جوں ہی سنا ہم نے
تو بس یاروں میں ہم کو شعر خوانی اپنی یاد آئی

جو دیکھا حالِ شمع صبح ہم نے بزم میں جا کر
تو ہم کو عمرِ بیہودہ گوانی اپنی یاد آئی

---

[1] ک : کافر کالا

صبا کی چھیڑ جو ہم نے گلوں سے صبح دم دیکھی
تو اس گلرو سے ہم کو چھیڑ خوانی اپنی یاد آئی

ہوا جاتا ہے سینے میں جو دل خوں ہمدمو شاید
کہیں اس شوخ کو مہندی رچانی اپنی یاد آئی

ہلائی جو صبا نے زلف پر خم اس پری وش کی
تو وہ زنجیر در ہم کو ہلانی اپنی یاد آئی

نہ پوچھو کچھ کہ ہنگام تماشا دیکھ دریا کو
مجھے کیا کیا طبیعت کی روانی اپنی یاد آئی

یہ تو نے عیش دیکھی زلف پیچاں کس کی جو تجھ کو
پریشاں خاطری آشفتہ جانی اپنی یاد آئی

(۳۴)

دل کے عوض خدا نے سینے میں کیا دیا ہے
کانٹا دیا ہے مجھ کو یا آ بلا دیا ہے

ہر سمت آنسوؤں کا دریا بہا دیا ہے
آنکھوں نے تیرے غم میں طوفاں مچا دیا ہے

گر چرخ نے کسی کا دلبر چھڑا دیا ہے
تو اس کی آہ نے بھی اس کو نچا دیا ہے

تصویر میں ہماری صورت گروں نے دیکھو
دل کے عوض بغل میں شعلا بنا دیا ہے

ہے زلزلہ زمیں کو کیا قبر میں کسی نے
کشتے کا تیرے کا فرشانہ ہلا دیا ہے

پروا شراب کی کچھ باقی رہی نہ ہم کو
آنکھوں نے اس کی ساقی ایسا چھکا دیا ہے

میں راحت دل و جاں ان کا نہیں تو پھر کیوں[1]
قصے نے میرے غم کے ان کو رلا دیا ہے

کیا آفتاب کیا مہ، اور کیا پلک یہ آنسو
جو جس کے سر چڑھا ہے اس کو گرا دیا ہے

ہاتھوں کو تیرے آگے دلبر لیسارتے ہیں
رنگ قبول تجھ کو ایسا حنا دیا ہے

یہ مہ نہیں ہے مرہم کا فور کا لگا کر
زخم دل فلک پر پھاہا چڑھا دیا ہے

---

[1] ل : کیوں

اُو سروِ قد کشیدہ سائے کو تیرے تجھ سے
افتادگی کے باعث کتنا بڑھا دیا ہے

خورشید ہو گیا ہے جو قرص کہربا کا
شاید کسی نے پردہ رُخ سے اٹھا دیا ہے

ذو معنی ایک کہہ کر کل صبح دم صبا نے
بلبل کو ہے رُلایا گل کو ہنسا دیا ہے

زلفِ سیہ کہے ہے میں ہوں غلافِ کعبہ
دیکھو مجھے خدا نے کیا مرتبا دیا ہے

کس سے کہوں مژہ کے تیروں کے مارے دیکھو
ابرو کمان نے میرے دل کو اٹا دیا ہے

اس آہِ بے اثر نے باوصفِ نارسائی
اُس بے وفا کو دیکھو کیا سٹپٹا دیا ہے

کیا پیش کروں میں اُس دلربا کو یہاں تو
اک دل دیا ہے سو بھی وحشت بھرا دیا ہے

اُس سے جو دل لگایا سچ کہیو عیشؔ تم کو
کیا اور بھی خدا نے دل دوسرا دیا ہے

(۳۵)

گھر سے وہ شوخ دم صبح اگر نکلے ہے
کانپتا شرق سے خورشیدِ سحر نکلے ہے

دل کو یہاں جس سے لگاتے ہیں بامیدِ وفا
یہ تماشا ہے وہی شعبدہ گر نکلے ہے

یوں لبِ لعل سے ہنسنے میں ہے دانتوں کی نمود
دُرجِ یاقوت سے جوں سلکِ گہر نکلے ہے

آنکھ سے عاشقِ شیدا کی اب آنسو کی جگہ
خونِ دل نکلے ہے یا لختِ جگر نکلے ہے

دیکھیو یوں گے اجی آپ کی ہم سنگ دلی
گر کوئی آہ جو لبریزِ اثر نکلے ہے

سچ ہے بیہودہ اٹھاؤ گے تم اے چارہ گرو!
کام اُس سے نہ بزور و نہ بزر نکلے ہے

لے کے دل آنکھ چرانے لگے پھر کہیے تو
کہ بھلا بات میں اب کس کی یہ شر نکلے ہے

حال عاشق کا جو سنتا ہے دگرگوں وہ شوخ
دیکھنے کو بھی یہ اندازِ دگر نکلے ہے

رال ٹپکی ہی پڑے ہے دہنِ غنچہ سے
جب کبھی باغ میں ذکرِ لبِ تر نکلے ہے

یوں نکلتے ہیں مرے دیدۂ تر سے آنسو
جس طرح گھر سے کوئی وقتِ سحر نکلے ہے

بزمِ جاناں میں میری ہووے رسائی تو ابھی
شرط ہے غیر تو کیا اس کا پدر نکلے ہے

شیخ جی دعوے تو کرتے ہو یہ یاد رہے
چیونٹی کی اجل آتی ہے تو پَر نکلے ہے

برق تڑپا کرے، اور چرخ کو چکر آئے
دل سے وہ آہ، بصد شور و شرر نکلے ہے

سے — ل : سفر

خونِ عاشق پہ کہیں عیش اُٹھا ہے بیڑا
چاک کرپان جو وہ رشکِ قمر نکلے ہے

(۳۶)

دل مرا صرفِ تمنّا ہی سہی — شغل تو ہے، چلو، بیجا ہی سہی
دل ملے چاہییں دونوں کے بہم — سامنے غیروں کے پردا ہی سہی
گو بُرا ہی مجھے کہتے ہیں، بھلا — ذکر تو ہے مرا، شکوا ہی سہی
کاش وہ وعدہ تو کرنا سیکھے — اے نہ سچ ہو، اجی جھوٹا ہی سہی
چاک کرنے کو اگر جیب نہیں — اے جنوں، دامنِ صحرا ہی سہی
کیوں بُرا کہتے ہو لوگوں میں مجھے — تم تو اچھے ہو، میں ایسا ہی سہی
ہے تصوّر تو لبِ شیریں کا — ذائقہ ہجر کا کڑوا ہی سہی
جلوۂ حسن کی ہو تاب کسے — اس میں گو حضرتِ موسیٰ ہی سہی
خواب میں دل کا لگا لے جانا — یہ بھی تقصیرِ زلیخا ہی سہی
ہے وہ سرگرمِ طپیدن کہنا — تو بھی چل، دیکھ، تماشا ہی سہی
وقف مَے زاہد اگر دل ہے تو کر — ورنہ تسبیح و مصلّا ہی سہی
ہے شبِ وصل تصدّق کے لیے — گر نہیں کچھ، دلِ شیدا ہی سہی

عیش کے ساتھ ہے فضلِ مولا
گو حقیقت میں وہ کیسا ہی سہی

(۳۷)

کرتے ہیں وہاں وہ غیروں پہ احساں نئے نئے
یہاں رنج اُٹھا رہے ہیں دل و جاں نئے نئے
کاہے کو دل بچے گا کسی کا، اگر یوں ہی
لاوے گی سانگ کاوشِ مژگاں نئے نئے

کر ضبطِ اشک تو غمِ جاناں میں ورنہ یاں
طوفاں اٹھیں گے دیدۂ گریاں سے نئے نئے

شام و شفق تو کیا ہیں ابھی آگے دیکھنا
عالم دکھاویں گے مسی و پاں نئے نئے

آوارگی میں کاوشِ دستِ جنوں بھلا
کس گھر سے آویں روز گریباں نئے نئے

یہاں کامِ جاں کے چکھنے کو ہر شام و ہر سحر
دیتا ہے کیا مزے دلِ بریاں نئے نئے

جلنے سے اور قطعِ نظر بزمِ یار میں
کھینچے ہے صدمے شمعِ شبستاں نئے نئے

ہے اختلاط حضرتِ مُرغ کو جو زلف سے
یہ کیا ابھی ہوئے ہیں مسلماں نئے نئے

کیا سادہ دل ہیں ہم بھی کہ وعدہ پہ اُن کے آہ
کرتے ہیں روزِ عیش کے ساماں نئے نئے

(۳۸)

ہم اپنی آہ اور سینے کو کیوں جی کیا بُرا سمجھے
اُسے پر کالۂ آتش اسے آتش کدہ سمجھے

ہمیں نا آشنا اور تم عدو کو آشنا سمجھے
ارے او ظالمو! بس صبر ہے تم سے خدا سمجھے

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر اُن کی زباں وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

خدا حافظ ہے دے بیٹھے ہیں دل ہم اُس کو جو ظالم
نہ رسمِ دلبری جانے نہ آئینِ وفا سمجھے

ہوئے نیم نگہ میں ہم تو خوش اور رے آڑے وہ دل
وہ سمجھے اپنا مطلب اور ہم اپنا مدعا سمجھے

کب ہے نیک اور کب ہے بد اس کے کیا معنی اجی جس کو
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بھلا سمجھے بھلا سمجھے

کیا موقوف لکھنا ایک قلم اُس بت کو اُس ڈر سے
خدا جانے میں کیا لکھوں، وہ ظالم کیا کا کیا سمجھے

غرض میری نصیحت سے ہے یہ ناصح کو میں سمجھا
کہ اس تقریب سے وہ شوخ اُس کو پارسا سمجھے
طریقِ عشق بازی میں سُنا اے عیش میں وہ ہوں
کہ جس کو کوہ کن استاد و مجنوں پیشوا سمجھے

(۳۹)

مانگے ہے گُہر آب مرے دیدۂ تر سے
اور لعل کو ہے تاب مرے لختِ جگر سے
کہہ دو کوئی اتنا فلکِ شعبدہ گر سے
واقف نہیں تو کیا مرے نالوں کے اثر سے
وصفِ دہنِ یار میں تھی عقل تو حیراں
اب آپ بھی کھوئے گئے مضمونِ کمر سے
ہے ہم نفساں سینۂ گردوں پہ نمایاں
تارے نہیں یہ داغ ہیں آہوں کے شرر سے
اے سوزنِ مژگاں ترا احساں ہے اگر تو
پیوند کرے چاکِ جگر تارِ نظر سے
ہر چند بچاتے ہیں دلِ زار کو لیکن
لے جاتے ہیں خوبانِ جہاں لاکھ ہنر سے
ہر چند نصاریٰ کا عمل بھی ہے یہ قاتل
چلتا نہیں اعجازِ مسیحا ترے ڈر سے
یہ زُلف و رُخِ یار ہے، یا دَیر و حرم ہے
یا شام کا پیوند لگایا ہے سحر سے
استادوں ہی سے سیکھتے ہیں سب علم و ہنر عیش!
کہہ دے کوئی لایا ہو اگر باپ کے گھر سے

(۴۰)

مری مژگاں پہ سمجھا جو کوئی آنسو کا قطرہ ہے
غلط ہے اشک کا قطرہ نہیں، یہ دل کا عقدا ہے
سنا اے باغباں کچھ تو نے یہ بلبل کا بدلا ہے
چمن میں موجۂ بادِ صبا گل کو طمانچا ہے
کہو اس کے سوا کیا اور رمزِ خرّہ موسیٰ ہے
فروغِ جلوۂ نور اُس کا اپنا آپ پردا ہے

یہی بالفرض مانا ہم نے، دل صرفِ تمنّا ہے
بلا سے شغل تو ہے، ہم نشیں گو صرفِ بیجا ہے

مذاقِ عشق سے واقف ہے جس کا کام دل اُس کو
نگاہِ مستِ ساقی غیرتِ صد جام و صہبا ہے

لبِ نوشیں کو اُس کے لعل سے تشبیہہ مت دینا
یہ وہ لب ہے کہ جس کا کشتہ اعجازِ مسیحا ہے

کہے تھیں بلبلیں شبدیزِ عمرِ گل کو، اے گلچیں!
چمن میں دیکھ لے موجِ نسیمِ صبح کوڑا ہے

شکایت ہو فلک کی ہم کو کیوں ہم خوب واقف ہیں
جفائے چرخ بھی در پردہ اک یاروں کا شوشا ہے

اٹھانے والے ہم جور و جفا ہیں اُن کی تم سمجھے
جفائے چرخ کیا ہے، یہ بھی اک یاروں کا شوشا ہے

نہیں قطرے عرق کے جمع اس کے رُوئے تاباں پر
طلسمِ تازہ ہے خورشید پر عقدِ ثریّا ہے

یہ دیکھو کج روی باوصف ارشادِ حضورؐ اب تک
فلک کو کام میں میرے، وہی امروز فردا ہے

زباں رکھتا ہوں، پر حضرت کے آگے اس لیے چپ ہوں
کہ روشن دل کے آگے خامشی عرضِ تمنّا ہے

نہیں سینے میں ہم کو عیش اپنے آج تک ثابت
خدا جانے کہ یہ کانٹا ہے، دل ہے، یا پھپھولا ہے

(۴۱)

جراَت اے دل، مے و مینا ہے، وہ خود کام بھی ہے
بزم اغیار سے خالی بھی ہے، اور شام بھی ہے

زلف کے نیچے خطِ سبز تو دیکھا ہی نہ تھا[1] | اے لو ایک اور نیا دام تہِ دام بھی ہے
چارہ گر جانے دے تکلیفِ مداوا ہے عبث | مرضِ عشق سے ہوتا کہیں آرام بھی ہے
ہو گیا آج شبِ ہجر میں یہ قول غلط | تھا جو مشہور کہ آغاز کو انجام بھی ہے
کام جاناں میرا لبِ یار کے بوسے سے سوا | تو گر چاشنیِ لذتِ دشنام بھی ہے
شیخ جی آپ ہی انصاف سے فرمائیں بھلا | اور عالم میں کوئی ایسا بھی بدنام بھی ہے

زلف و رخ، دیر و حرم، شام و سحر عیشؔ ان میں
ظلمتِ کفر بھی ہے، جلوۂ اسلام بھی ہے

(۴۲)

کیا[2] دل الجھ پڑا کہیں مژگانِ یار سے | جو رونگٹے بدن میں چبھے نوکِ خار سے
خواہش مدد کی ہے مجھے ابروئے یار سے | ہووے تو کچھ بعید نہیں ذوالفقار سے
باغ و بہار ہوں میں دلِ داغدار سے | کیا کام مجھ کو یاں کی خزان و بہار سے
جب ذبح کرتے ہو مجھے خنجر کی دھار سے | کیا کام آگے لو گے مژہ کی کٹار سے
اُس چشمِ مستِ ناز کا پیمانہ کش ہوں میں | مستی کو جس کی ننگ ہے نام خمار سے
یہ صاف طینتی مری دیکھو کہ اُس کا دل | آئینہ بن گیا ہے ہمارے غبار سے
اس دل کے ہاتھوں جلد کہیں موت آچکے | دم آ گیا ہے ناک میں اب انتظار سے
ہر چند زندہ ہوں گے کبھی بعدِ مرگ پر | اپنے عوض تو شعلہ اٹھے گا مزار سے
شاید بہار آئی کہ ہونے لگی ہے پھر | دستِ جنوں کی چھیڑ گریباں کے تار سے
بس اب نصیحتوں سے مجھے رکھ معاف تو | باہر ہے ناصحا مرا دل اختیار سے

یہاں رات دن ہے زلف و رخِ یار اپنا، عیشؔ!
کیا کام مجھ کو چرخ کے لیل و نہار سے

---

[1] مطلع کے بعد کے اشعار بنیادی نسخے میں شامل نہیں لندن کے نسخے سے شامل کیے گئے۔

[2] غزل (۴۲) بنیادی نسخے میں درج نہیں ہے لندن کے نسخے سے پوری غزل شامل کی گئی ہے۔

(۴۳)

اے فلک[1] آہ میں گر اپنی رسائی ہوتی
تو بھلا کاہے کو اعدا کی بن آئی ہوتی

زلف کی بُو جو صبا صبح کو لائی ہوتی
تو دلِ بستہ کی کیا عقدہ کشائی ہوتی

آنکھ غصّے میں اگر اس نے دکھائی ہوتی
باغ میں نرگسِ شہلا کو تپ آئی ہوتی

نزع میں اُس کو نہ یٰسین سنائی ہوتی
چُو کے سب، یار کی تصویر دکھائی ہوتی

مسّی دانتوں میں اگر تم نے لگائی ہوتی
ردم پر زنگ کے لشکر کی چڑھائی ہوتی

کیا کریں ضعف کے ہاتھوں سے تنگ آئے ہیں
اے جنوں ورنہ تجھے سیر دکھائی ہوتی

حاصل اِن باتوں سے کیا حضرتِ ناصح تم نے
اُس کے ملنے کی کوئی راہ بتائی ہوتی

دل کی کیا آگ بجھائے گی تو اے سیلِ سرشک!
پہلے اک شمع کی تو آگ بجھائی ہوتی

شکوۂ یار بھلا کیونکہ زباں پر لاتا،
بات اگر منہ سے نکلتی تو پرائی ہوتی

لے کے دل اب جو یہ انداز نئے کرتے ہو
کاشکے پہلے ہی دی ایسی دکھائی ہوتی

دیدۂ تر نہ اگر بر سرِ احساں ہوتے
تو ابھی آہ نے اک آگ لگائی ہوتی

دھاک وہ ہے ترے عاشق کی سُن اے شعبدہ گر[2] ق
اُس کی تصویر اگر تو نے منگائی ہوتی

تیری[3] مجلس میں سنا شمعِ سحر کی مانند
اُڑی رنگِ رخِ اعدا پہ ہوائی ہوتی

معنیِ واعتصموا عیشؔ دکھا دیتے ہم
یار کی زُلف اگر ہاتھ میں آئی ہوتی

(۴۴)

گلشن میں جا کے غنچۂ لب وا نہ کیجیے
ہنس ہنس کے، خونِ بلبلِ شیدا نہ کیجیے

بے ہودہ دل کو صرفِ تمنّا نہ کیجیے
معشوق کس کے ہوتے ہیں، ایسا نہ کیجیے

---

[1] غزل (۴۳) کے ابتدائی (۷) اشعار بنیادی نسخے میں درج نہیں، یہ لندن کے نسخے سے لیے گئے۔

[2] ل : جو اے شعبدہ گر

[3] ل : شمعِ صبح کی مانند تیری مجلس میں

قصدِ خرام ناز خدا را نہ کیجیے
بیٹھے بٹھائے فتنے کو برپا نہ کیجیے
صاحب، یہ بات خوب نہیں، آپ جانیے
ہم دل جلوں کو دیکھیے، چھیڑا نہ کیجیے
جلتا ہے دل چراغ کی مانند عشق میں
اب اس کو سرد مہری سے ٹھنڈا نہ کیجیے
عاشق سے ان بتوں نے یہ باندھا ہے التزام
وعدہ نہ کیجے کیجے تو ایفا نہ کیجیے
کیا چیز تھا دل، اُس نے جلایا تو کچھ ہوا
عاشق ہوئے تو اس کا پرکھا نہ کیجیے
مشرب میں اپنے یوں ہے، جو توفیق دے خدا
مرجائیے پہ منّت اعدا نہ کیجیے
عشق بتاں کا نام بھی لینا نہیں درست
کیوں، یہ بلائے جان ہے، ایسا نہ کیجیے
دل جائے جان جائے، جو کچھ ہو، سو ہو مگر
جور و جفائے یار کا شکوا نہ کیجیے
اوروں کے آگے ذوق سے کیجے تعلّیاں
یاروں کے آگے دعویٰ بیجا نہ کیجیے

ہووے میسّر عیش، اگر سعیِ غیر سے
مرکر[1] خیالِ سایۂ طوبیٰ نہ کیجیے

(۴۵)

کار فرما جو کبھی ابروے قاتل ہووے
پل کی پل میں وہیں حل عقدۂ مشکل ہووے
جز فنا اُس سے کہو کیا اجی حاصل ہووے
لے کے دل چھٹتے ہی جو جان کا سائل ہووے
جلوہ فرما جو ابھی وہ سوے محفل ہووے
دل تو کیا، جان کا رہنا اجی مشکل ہووے
آپ بیداد تو کرتے ہیں، وے آپ کو بھی
ہووے معلوم، جو قابو میں مرا دل ہووے
شمع پروانے سے سچ کہتی تھی، جلنے کے سوا
عشق میں اور دھرا کیا ہے، جو حاصل ہووے
سخت جانی مجھے ڈر ہے کہ دم ذبح کہیں
تو نہ تکلیف دہ بازوے[2] قاتل ہووے
تجھ سوا مستم ایجاد پری تو کیا ہے
حور پر بھی کوئی کافر ہو، جو مائل ہووے
ناز[3] و انداز سے معشوقوں کو ہے کام فقط
اُن کی جوتی سے موئے، یا کوئی بسمل ہووے

---

[1] ل : ہرگز
[2] ل : خنجر
[3] ل : ناز و انداز سے رہتا ہے انھیں کام یہاں

جان کس لطف سے رخصت ہو دم ذبح اگر
ہاتھ اُس شوخ کا گردن میں حمائل ہووے

تیغ نے قتل کے جوہر میں ترے ابرو کے
جان کیا پائی ہے جو مدِّ مقابل ہووے

چاہیے عیشؔ حفاظت کے لیے لیلیٰ کی
قیس کا پردۂ دل، پردۂ محمل ہووے

(۴۶)

چمن میں کرتی تھی بلبل یہ کل بیاں مجھ سے
کہ بے سبب ہے سر کینہ باغباں مجھ سے

یہ اُس سے آہ کوئی پوچھتا نہیں اتنا
کہ اُس کی ذات کو پہنچا ہے کیا زیاں مجھ سے

خبر صبا کو ہے کیا اور نسیم کیا جانے
سُنے کوئی گل و بلبل کی داستاں مجھ سے

ہزار بار کیا عرضِ مدعا لیکن
سو نہیں کے کبھی کی نہ اُس نے ہاں مجھ سے

خدا نہ جھوٹ بلائے میں ایک کیا لاکھوں
پڑے ہیں کوچۂ قاتل میں نیم جاں مجھ سے

سنا ہے یہ کہیں اندھیر، دل کو لے بھاگا
فروغ جلوۂ رخسارِ دلستاں مجھ سے

قفس میں کہتی تھی رو رو کے عندلیب افسوس
چھٹا بہار کے موسم میں گلستاں مجھ سے

زمیں سے تا بہ فلک پھونک دوں یہی ہر دم
کہے ہے سینے میں آہِ شرر فشاں مجھ سے

بغل میں وہ دلِ صد پارہ اپنے رکھتا ہوں
کہ گر دکھاؤں تو شرمندہ ہو کتاں مجھ سے

سمجھ کے میں اُسے کم ظرف کچھ نہیں کہتا
چلے ہے ٹیڑھ کی اے اے او آسماں مجھ سے

جناب شیخ جی کرتے ہیں فطرتیں لیکن
وہ بچ کے جائیں گے فرماؤ تو کہاں مجھ سے

خدا کا فضل رہے عیشؔ بس مرے شامل
جو پھر گیا ہے تو پھر جائے سب جہاں مجھ سے

(۴۷)

جب خدنگِ نگہِ شوخ شمائل آئے
پیٹو اپنے کو سینے سے نکل دل آئے

لے کے اُس کوچے کا یہ حال مفصّل آئے
جو خبر کو گئے سو پکڑے ہوئے دل آئے

ل ؛ سو نہیں کے کبھی اُس نے کی نہ ہاں مجھ سے

قتل کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کیا خاک کہوں
بچ کے اس کوچے سے جو آئے سو بسمل آئے

دیکھنا خوں کی دم ذبح کہیں اے بسمل!
چھینٹ اڑ کر نہ سوئے دامنِ قاتل آئے

کششِ قیس اگر سلسلہ جنباں ہو وے
سر کے بل ناقہ تو کیا صاحبِ محمل آئے

آج سب محتسب و واعظ و قاضی و فقیہہ
کر کے اس کوچے میں ہیں عقل کو زائل آئے

ان کے ملنے کی بظاہر کہو امید ہے کیا
جو تصور میں یہاں اپنے بمشکل آئے

بدلے ہاتھوں کے یہاں دیکھیو کٹ جائیں گے قل
بے حجابانہ اگر وہ سوئے محفل آئے

جہل بکتا ہو تو جاں تک بھی خریدوں، یارو!
کس لئے عرصے سے جو آئے سو جاہل آئے

غیرت، اے آہِ جگر سوز، یہاں تک تو ہوا
خواب میں بھی وہ رقیبوں ہی کے شامل آئے

یہ طفیلِ کششِ عشقِ زلیخا تھا کہ جو
یوسف اس طرح بکنے کی منزل آئے

عیشؔ آئینے سے لے تا مہ و خورشید و فلک
تاب ہے کس کو جو اس رخ کے مقابل آئے

(۴۸)

آج کی ہے وہ سمندر ہیں نہ کل کی پتلی
ہے بنی وہ تو سکندر کے عمل کی پتلی

زعم میں اپنے تو انسان ہے مختار مگر
فی الحقیقت اسے دیکھو تو ہے کل کی پتلی

کرتی بیمار نہیں کیونکہ یہ دولت کمبخت
سیدھی دیکھی ہے کہیں اہل دول کی پتلی

شعرا باندھتے ہیں مردم آبی جس کو
ہندی بھاکا میں اسے کہتے ہیں جل کی پتلی

برق سی لوٹ گئی خرمنِ دل پر میرے
آہ کس شوخ کی چلون سے یہ جھلکی پتلی

جنسِ دل مانگے تھا کل راہ میں دلال بجا
دور سے مجھ کو دکھا سونے کی کل کی پتلی

عیشؔ جب سے ہے مرے دل میں تصور اس کا
بن گیا دل مرے پہلو میں بغل کی پتلی

(۴۹)

دکھلائے شب کو جبیں گر وہ نازنیں اپنی
تو اس کے پاؤں پہ دھرے ماہ دھر جبیں اپنی

۱؎ ل: ہو
۲؎ ل: موروثِ مرض

نہ اہلِ کفر سنیں اور نہ اہلِ دیں اپنی
کہوں حقیقتِ دل کس سے ہم نشیں اپنی

چل اپنی راہ لئے اے بخیہ گر، سدا سے یہاں
ہے وقفِ دستِ جنوں جیب و آستیں اپنی

لگی ہوئی ہے صبا گھات میں، مجھے ڈر ہے
نہ کھول دے کہیں وہ زلفِ عنبریں اپنی

یقیں تو یوں ہے ابھی بلبلا کے ناچ پڑے
جو برق دیکھ لے، یہ آہِ آتشیں اپنی

اسی زمین نے کھا کر انھیں تمام کیا
گمان کرتے تھے جو یہ کہ ہے زمیں اپنی

ملوں تو کس سے ملوں، جاؤں تو کہاں جاؤں
طبیعت عیشؔ یہ پرچتی نہیں کہیں اپنی

(۵۰)

باتیں نہ کس نے ہم کو کہیں تیرے واسطے
اور ہم نے بھی نہ کس کی سہیں تیرے واسطے

حیران، دربدر پڑے پھرتے ہیں رات دن
خورشید و ماہ زہرہ جبیں تیرے واسطے

سیماب و برق و شعلۂ جوالہ اور یہ دل
بیتاب ان میں کون نہیں تیرے واسطے

ہم نے تری تلاش میں اے برق وش کیا
یہاں ایک آسمان و زمیں تیرے واسطے

شب سوزِ غم سے شمع صفت، بے قراریاں
کیا کیا نہ میرے دل کو رہیں تیرے واسطے

تو زیبِ بزمِ غیر رہا اور میں یہاں
بھٹکا پھرا کہیں کا کہیں، تیرے واسطے

یہ نالے وہ ہیں یاد رہے تو نہ گر ملا
پہنچیں گے تا بہ عرشِ بریں تیرے واسطے

کچھ اور اختلاف کا باعث نہیں فقط
عالم میں ہے چناں و چنیں تیرے واسطے

فضلِ خدا سے یاد رہے، عیشؔ، نعمتیں
موجود ہوں گی دیکھ یہیں تیرے واسطے

(۵۱)

خار آباد رہیں دشت کے، داماں نہ سہی
کاوشِ دستِ جنوں رہوے گریباں نہ سہی

دانۂ شبنم ہی کا اے کاش، گلوں پر دیکھیں
دل تو بہلے گا، ملا سے درِ غلطاں نہ سہی

طلبِ شان تو ہم کرتے نہیں تجھ سے، فلک
چل لبِ لعل ہی دے، لعلِ بدخشاں نہ سہی

نیم بسمل ہوں میں، اے چشمِ سیہ مست، ذرا
جنبشِ ابروہی کو دے، جنبشِ مژگاں نہ سہی

زلفِ پیچاں ہی سہی، سنبلِ پیچاں نہ سہی
ہم تو اس بات پہ بھی راضی ہیں، اے گردشِ دہر

آپ خوش رنگ ہیں، رنگِ مسی و پاں نہ سہی
اے گل اندام، لبِ لعل ترے نام خدا

ہم تو جھوٹے ہیں مگر عیشؔ دلِ آشفتہ نے آہ
تو ہی کہہ، کب تری بیداد مری جاں، نہ سہی

(۵۲)

بھلا کب یوں نگاہِ قاتلِ بے پیر پھرتی ہے
نگہ جب اس کی پھرتی ہے کہ جب تقدیر پھرتی ہے

خمِ ابرو کی جنبش اس طرح لذت دہِ دل ہے
چھری مذبوح پر جیسے دمِ تکبیر پھرتی ہے

بچانا دل کو تم آسیب سے، ہاں سر سے پاؤں تک
بنی یار و اجبو کا وہ پری تصویر پھرتی ہے

نسیمِ صبح، شاید تجھ کو میلِ تیرہ بختی ہے
کہ جو اس زلف کی تو چھیڑتی زنجیر پھرتی ہے

دلِ وابستہ کب کھلتا ہے تجھ سے، اے صبا، ہٹ جا
تو کیوں حیران گردِ غنچۂ تصویر پھرتی ہے

پئے منت کشیِ ہر کس و ناکس میں حیراں ہوں
خدا جانے کہ کیوں ہم کو لیے تقدیر پھرتی ہے

بچھا کر دام زلفوں کا، نگاہِ شرم آلودہ
بچانا طائرِ دل اب، پئے تسخیر پھرتی ہے

کشودِ کار جب تک عیشؔ اس در سے نہیں ہوتا
پڑی سو سو طرح جھک مارتی تدبیر پھرتی ہے

ــہ ل : آپ خوش رنگ تو ہیں، اک مسی و پاں نہ سہی

(۵۳)

چمن کس گُل بدن کا مدح خواں ہے
کہ ہر غنچہ وہاں رطب اللساں ہے

مری آنکھوں میں آ تیرا مکاں ہے
یہ قصرِ چشم و مژگاں سائباں ہے

مسی گر وہاں بھبوکا ہے دھواں ہے
تو یہاں بھی زیبِ لب دودِ فغاں ہے

یہ اُس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
کہ جس کی عیش، ہر ٹھوکر میں جاں ہے

بھری وہ موتیوں سے مانگ اُس کی
شبِ یلدا میں رشکِ کہکشاں ہے

بسنتی پوش گزرا کون جس کے
یہ غم میں زرد کشتِ زعفراں ہے

سُنا یوں ہے کہ ناسخ اور آتش
ق
ہر اک خوش گو وہر اک خوش بیاں ہے

دیارِ لکھنؤ میں اُن کا شہرہ
نہایت ہی بسلکِ شاعراں ہے

غرض دعویٰ ہے اہلِ لکھنؤ کو
کہ میر و میرزا کا ہم زباں ہے

سو یہ دعویٰ تو بس، ان صاحبوں کا
جنوں ہے، خبط ہے، وہم و گماں ہے

زبان ریختہ کہتے ہیں جس کو
سو وہ[۱] تو اہلِ دہلی کی زباں ہے

سنو، غرّا نہیں، یہ بات سب پر
ہویدا، مشتہر، اے مہرباں ہے

کہ طرزِ خاصِ اُردوے معلّیٰ
نصیبِ ناسخ و آتش کہاں ہے

مگر طرزِ سخن سے اُن کے مجھ کو
ہوئی معلوم یہ بات عیش یہاں ہے

کہ خوش گوئی تو ہے اک طرزِ دیگر
مگر ہاں پُربیوں میں خوش زباں ہے

(۵۴)

تری جدائی کا ظالم، وہ غم ابھی سے ہے
کہ جان چلنے کو سوے عدم ابھی سے ہے

میں حالِ سوزِ دلِ خستہ کچھ لکھا ہی نہیں
جگر شگاف زبانِ قلم ابھی سے ہے

شبِ فراق مری کس طرح سے گزرے گی
جو اضطراب مجھے دم بدم ابھی سے ہے

---

[۱] ل: سو یہ تو

خدا ہی جانے کہ دل لے کے کیا دکھاوے گی ۔ جو اُس کی زلف میں پیچ خم ابھی سے ہے

ہنوز اس سے میں اے عیشؔ آشنا ہی نہیں

وے رقیبوں کو کیا کیا بھرم ابھی سے ہے

(۵۵)

خدا کے واسطے ظالم نقاب اٹھا تو سہی ۔ نہ منہ سے بولیو، مرتا ہوں منھ دکھا تو سہی

جو قدر شام و شفق کچھ رہے تو میں جانوں ۔ مسی کو مَل کے ذرا پان تو چبا تو سہی

صبا میں بھی نہ اٹھوں گا، تو تو جبھی کہنا ۔ شمیم کاکلِ مشکیں مجھے سنگھا تو سہی

میں پوچھا آوگے، بولے نہیں، جو پھر پوچھا ۔ تو کس ادا سے کہا چل بے چل کہا تو سہی

بسانِ شمع ابھی آپ ہی وہ جل جاوے ۔ جو کوئی ہم کو جلائے کبھو جلا تو سہی

عدو کے پاؤں پڑے اس لیے کہ تجھ سے ملیں ۔ اب اور کیا ہمیں یہاں تک تری جفا تو سہی

سمجھ کے غیر، وہ شاید کبھی نکل آوے

تو عیشؔ چپکے سے زنجیرِ در ہلا تو سہی

(۵۶)

نہیں ہے ابروے خمدار اُس جبیں کے تلے

کھنچی ہے تیغ، پے جنگ ملکِ چیں کے تلے

اٹھاؤں دیدۂ پُر غم سے آستیں کیوں کر

رکھا ہے روک کے دریا کو آستیں کے تلے

نہیں ہیں کان میں اُس ماہ رو کے آویزے

جھمک رہے ہیں یہ تارے مہِ جبیں کے تلے

کبھی چھٹے ہو نہ چھوٹو گے حضرتِ دل تم

جو آئے اس نگہِ سحر آفریں کے تلے

جو آئے یار تو آنکھوں کی جا میں اے نرگس!

بچھاؤں جان کو اُس پائے نازنیں کے تلے

پئے نہ خون کہو کیونکہ طفلِ اشک مرا
پلا ہے سایۂ جان و دلِ حزیں کے تلے

تو پایمالوں کا اپنے عروجِ خاک تو دیکھ
کھیے ہے خلق کہ ہے آسماں زمیں کے تلے

سراجِ دینِ بہادر ابو ظفر رہوے
سحابِ مکرمتِ ربّ العالمیں کے تلے

اور اس سوا یہ دعا عیشؔ کی ہے بس شب و روز
الٰہی رہوے جہاں اس کے سب نگیں کے تلے

(۵۷)

زخمِ دل کہتا ہے میرا تیرِ جاناں سے مرے
ہونٹ تر کر دے تو اپنے آبِ پیکاں سے مرے

چشمِ گریاں نے کہا اے ابرِ تر تو تو ہے کیا
نوح کا طوفاں حذر مانگے ہے طوفاں سے مرے

منھ نہ کھلوا تیری شیخی کرکری ہو جائے گی
گل کو کیا نسبت ہے بلبل، داغِ حرماں سے مرے

چھوڑ دوں الفت بتوں کی یہ نہ ہوگا مجھ سے کیوں
بات یہ باہر ہے واعظ حدِ امکاں سے مرے

تو عبث بکتا ہے ناصح روز رہویں گے سنا
حشر تک جھگڑے جھمیلے یوں ہیں خوباں سے مرے

اس گمانِ بد پہ درباں روز بدلے جائیں گے
معرفت پیدا نہ کرے کوئی درباں سے مرے

چاکِ دل سینے کے کام آویں گے تو بھی بخیہ گر
کھینچ لے دو تار آ چاکِ گریباں سے مرے

قیس نے رو کر کہا لیلیٰ سے کیوں کیا کم ہیں کچھ
داغِ دل داغِ پرِ طاؤسِ بستاں سے مرے

موردِ رحمت ہوا میں بیشتر اس سے کہ کم
نامۂ اعمالِ ہر عاصی تھا عصیاں سے مرے

دردِ دل، سوزِ جگر، بے تابیِ جاں عیشؔ کیوں
سر ہوئے ہیں نالے کس کس ساز و ساماں سے مرے

(۵۸)

رُخِ مصحف پہ اُس بت کے دو تا زلفِ پریشاں ہے
نہ کیوں ایمان کانپے گود میں ہندو کی قرآں ہے

دل پر درد و جاں پر سوز ہر دم چشم گریاں ہے
جگر رشکِ گلستاں، داغِ دل شمعِ شبستاں ہے

بھرے زخمِ جگر کیوں کر کہ کاوش اُس کی مژگاں کی
سناں ہے خنجرِ بُرّاں ہے، ناوک نوکِ مژگاں ہے

رخِ تاباں، قدِ رعنا، دہن تنگ اُس پری وش کا
بہار افزائے گلشن غنچہ گل سروِ بستاں ہے

نظر کس سادہ رو پر جا پڑی ہے سچ بتائے دل!
کہ جو خاموش تو جوں غنچہ، تصویرِ حیراں ہے

برآوے عہدہ حمد و ثنا سے تیری اے خالق!
یہ عیشِ بے بضاعت کا بھلا مقدورِ امکاں ہے

(۵۹)

کیا ہے چرخ نے وقفِ نگاہِ یار مجھے
نہ چھینے دیکھ کے کیوں دورِ روزگار مجھے

نہیں ہے کچھ گلہ چرخ در روزگار مجھے
کیا ہے اس دلِ مضطر نے بے قرار مجھے

دکھائے چرخ نے معشوق یوں ہزار مجھے
ملا یا پر کوئی اُس سا نہ وضع دار مجھے

پڑا ہے جب سے نظر خطِ سبز یار مجھے
دکھا رہی ہے خزاں جلوۂ بہار مجھے

خدا کے واسطے ناصح، جنوں کا موسم ہے
نہ روک کرنے دے جامے کو تار تار مجھے

الٰہی گزرے گی کیوں کر شبِ فراق مری
جو عین وصل ہی میں ہے یہ اضطرار مجھے

جو ہووے دل مرا قابو میں تو نہیں درکار
انیس و مونس و دمساز و غمگسار مجھے

جواب صاف ہی دے دیجیے دہن ہے کہاں
نہ اُس کے بوسے کا کیجیے اُمیدوار مجھے

میں ایک عمر سے صحرا نوردِ وحشت ہوں
عزیز رکھتا ہے وہاں کا ہر ایک خار مجھے

جو پیچ و تاب ہی قسمت میں تھے لکھے میری
تو کیوں بنایا نہیں زلفِ تابدار مجھے

میں مست ہوں نگہِ مستِ چشم ساقی کا
نشہ کا ہووے تو کس طرح ہو اُتار مجھے

ازل سے تھی نگہِ یار مجھ سے برگشتہ
بنایا اس لیے برگشتہ روزگار مجھے

نہیں لگاؤ طبیعت کو ان کی گر مجھ سے — تو کیوں کنکھیوں سے دیکھے ہیں بار بار مجھے
جفائے چرخ و ستم ہائے غیر و جورِ صنم — اس ایک دل پہ ہی لڑنی پڑی کہار مجھے
صبا گرفتہ دل، جاں کمی، جگر کاوی — فراقِ یار میں ہیں یہ ہی کار و بار مجھے
جو دی ہے آنکھ تو دی ہے مجھے وہ طوفاں خیز — دیا ہے دل تو دیا ہے وہ شعلہ بار مجھے
مزا ستم کا تجھے اے فلک، چکھا دیتا — مگر خدا کا ہے ڈر، اے ستم شعار، مجھے
سناتا دردِ دلِ خستہ بیٹھ کر کس کو — ملا نہ مجھ سا کوئی آہ، دلفگار مجھے
میں اتنے واسطے کہتا ہوں اے دلِ ناداں — ق — سمجھ لے تو نظر آتا ہے خام کار مجھے
فریبِ جلوۂ حسنِ بتاں میں آ کے کہیں — تو اپنے ساتھ نہ کر نا ذلیل و خوار مجھے
بتا تو دے مجھے عقلوں پہ اُن کی خاک پڑے — ق — بُرا سمجھتے ہیں ابنائے روزگار مجھے
بسانِ خامہ میں ہوں کس کے دستِ قدرت میں — بنایا کس نے ہے زاہد سیاہ کار مجھے
میں وہ نہیں کہ مٹائے سے اُس کے مٹ جاؤں — ق — مٹائے زعم میں اپنے فلک ہزار مجھے
جہاں کے صفحہ پر اُس نقشبندِ قدرت نے — دیا ہے اور ہی کچھ رنگ و اعتبار مجھے
یہی تو وقت ہے ہاں بعد ایک مدت کے — ق — ملا ہے واعظِ بے ہودہ روزگار مجھے
خدا کے واسطے ناصح تو مجھ کو منع نہ کر — نکال لینے دے دل کا ذرا بخار مجھے

ہوا ہوں عشق کے ہاتھوں سے اس قدر مجبور
کہ اپنے دل پہ نہیں عیشؔ، اختیار مجھے

(۶۰)

فلک پہ جور و ستم مجھ سے ناتواں کے لیے — میں ہی تھا کیا ترے ظلموں کے امتحاں کے لیے
دل عاشقوں کے تھے پامالیِ بتاں کے لیے — نہ جورِ غیر و جفا ہائے آسماں کے لیے
میں مستعد ہوں اگر نالہ و فغاں کے لیے — تو کچھ سے کچھ ابھی ہو جائے آسماں کے لیے
پھنسا کے یار کی زلفوں میں، ہم نے دل، دیکھو — خریدی اور بلا ایک اپنی جاں کے لیے
ستم ہے فصلِ بہاری میں باغباں کا حکم — نہ ہوئے باغ میں بلبل کو آشیاں کے لیے
کہے گا ناصحا کیا فائدے کی، تو میرے — ہوئے ہیں خلق ہی عاشق نقصِ زیاں کے لیے

نہ خرچ بے ہودہ عمرِ عزیز اپنی کر[1]
ملا نہیں تجھے یہ نقد، رائیگاں کے لیے

یہاں نہیں شکر دے جگر مہ وشوں کے بن دیکھے
یہ بات کب ہے میسر بھلا کتاں کے لیے

ہمارا روکنا اچھا نہیں ہے اشک لینا
ایک اور روزنہ بُرا ہوگا پاسباں کے لیے

نہ ہوئے کیوں دیا اصنام سجدہ گہ اپنا
جبیں بنی ہے بتوں ہی کے آستاں کے لیے

بسا ہے دل کے مرے قصر میں تصورِ یار
مکیں تھا یہ سزاوار اس مکاں کے لیے

سنا کے قصۂ غم اپنا اُس کو اپنے ہی
دل و جگر نے مزے غم کی داستاں کے لیے

اسے تو روز بہلانے کو چاہییں دریا
کہاں سے لاؤں میں اس چشمِ خونفشاں کے لیے

نہیں تو بر سرِ ہر مدعا ہے سو سو بار
پر اک زباں جو ملی تھی نہیں سو ہاں کے لیے

چھپا رہے نہ رُخِ یار زلف میں کیوں کر
تقیہ فرض ہے مومن کو حفظِ جاں کے لیے

سنا جو مدح بھی کیجے تو کیجے ایسے کی ق
کہ جس کی مدح ہو فخر اہلِ آسماں کے لیے

نہ یہ کہ ہر کس و ناکس کے بھاٹ جائیے بن
پے اُمیدِ زرِ نقد و حرصِ ناں کے لیے

نہیں ہے مدح کسی کے لیے یہاں زیبا
جو ہے تو ہے نبیِ آخر الزماں کے لیے

وہ وہ ہے نام زباں پر گر اس کا آجاوے
تو لذت اور ہی حاصل ہو کام و جاں کے لیے

وہ وہ ہے نامِ خدا دیکھو جس کا ذرّہ لطف
فروغ بخش ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

نگاہِ مرحمت ہاں اس کی مومیائی ہے
شکستِ جان و تنِ دل شکستگاں کے لیے

اسی کے ہے رُخِ انور سے یہ جہاں روشن
اسی سے نور ہے خورشیدِ آسماں کے لیے

وہ کون سرورِ عالم، محمدؐ عربی
کہ جس کی ذات سے ہے فیض دو جہاں کے لیے

عطا کیا ہے خدا نے وہ ہاں اُسے دل و دست
کہ جس سے پہنچے ہے امداد بحر و کاں کے لیے

کلیدِ قفلِ درِ آرزو ہیں اس کی بھویں
بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ انس و جاں کے لیے

اطاعت اس کی ذخیرہ ہے بس سعادت کا
یہاں کے واسطے اور ملکِ جاوداں کے لیے

سہ ل : کیوں

وہ جو زباں کہ ہو اس کی مدح سے ساکت
مجالِ نطق نہ ہو عیشؔ اس زباں کے لیے

(۶۱)

حقیقت کیا کہوں زلفِ دوتا کی
بنی ہے وہ تو کافر اک بلا کی

سہیں ہم نے جفائیں، اور وفا کی
سمجھ تو تو نے اس پر ہم سے کیا کی

رسائی یہ ہے آہِ نارسا کی
کہ دل میں اُس بتِ کافر کے جا کی

نزاکت دیکھ اُس کے دستِ وپا کی
حنا یاد آئی ہے قدرت خدا کی

گلستاں میں اگر بلبل ہے شاکی
تو ہے گلچیں کی یا بادِ صبا کی

نہیں چھپتا نظر میں کوئی دل کی
ادا بھائی ہے کس کافر ادا کی

غدا ہے گر وہ آجائے لبِ بام
تو دیکھیں پارسائی پارسا کی

تو ہی انصاف سے کہہ، میں نے تیری
نہ کس کس بے وفائی پر وفا کی

چلی ہے اُس کی زلفوں سے اُلجھنے
ذرا دیکھو تو گستاخی صبا کی

ستم ڈھاتی ہیں ہاں بس کچھ نہ پوچھو
نگاہیں وہ بھری کا فرحیا کی

فلک بھی کان ہی پکڑے، جو دیکھے
یہ گردش اُس کی چشمِ فتنہ زا کی

شبِ فرقت میں اے شمعِ دل افروز
بسانِ شمع جان اپنی جلا کی

فلک سے مقصدِ دل جس نے چاہا
عبث جان اپنی صرفِ مدعا کی

اڑائی ہیں اسی سے یاد تھیں کب
فلک کو عیشؔ، یہ طرزیں جفا کی

(۶۲)

عقدہ کھلا یہ دیکھ کے پانی میں بلبلے
ہم سب ہیں بحرِ عالمِ فانی میں بلبلے

دیں آبِ اشکِ گرم سے میرے تو بس اٹھیں
شمشیر و خنجرِ صفہانی میں بلبلے

ے ل : کو

ہر چند آب ہوتی ہے لیکن سنے نہیں ‏ اٹھتے کبھی جو ابر کا نی میں بلبلے
تارے نہیں فلک پہ مرے جوشِ گریہ سے ‏ پیدا ہوئے جہازِ دخانی میں بلبلے
عبرت فزا ہیں یا اولی الابصار دیکھ لو ‏ بحرِ رواں کی عین روانی میں بلبلے
دل پر ہمارے کھول گئے مرگ و زیست کے ‏ عقدے تمام جلوۂ آنی میں بلبلے

یاد آئے ہم کو عیشِ پیالے شراب کے
دریا پہ دیکھ جوشِ جوانی میں بلبلے

(۶۴)

وصف آ سکتے ہیں کب اس کے دہن میں ہاتھ کے
ذکر شب ہوتے تھے جس کے انجمن میں ہاتھ کے

جیب کے ٹکڑے اڑانے، یا گریباں پھاڑنا
شغل یہ دو ہی تو ہیں دیوانہ پن میں ہاتھ کے

باغباں رو کر خزاں میں کہتا تھا بوئے ہوئے
تھے یہ گل بوٹے ہمارے ہی چمن میں ہاتھ کے

حق کے انعاموں کا کیا پایاں ہے اک ادا یہ ہے
دیکھ تو کیا کیا فوائد ہیں بدن میں ہاتھ کے

ہاتھ پہنچے گر مرا اس زلفِ عنبر بو تلک
مشک ہو سو جان سے صدقے ختن میں ہاتھ کے

گم ہوئے ایسے کہ اپنے اڑ گئے طوطے سے کچھ
آہ اس کی فکرِ مضمونِ دہن میں ہاتھ کے

جان و دل نظروں ہی نظروں میں اڑائے دیکھنا
کام آنکھوں سے لیے چوری کے فن میں ہاتھ کے

زینت و تزئین ان کو آج جو چاہو سو دو
بند بند اک دن جدا ہوں گے کفن میں ہاتھ کے

پنجۂ خورشید نے کیا تاب پائی ہے کہ عیشؔ!
ہو مقابل یار کے جو وہ پھبن میں ہاتھ کے

(۶۴)

نبٹ جائے گی دم میں آسماں سے
چلے چھڑے جو آہوں کے یہاں سے

عبث شکوہ ہے اُس کو آسماں سے
جسے لینا نہیں اپنی زباں سے

تو ہی انصاف کر اپنی زباں سے
فلک، یہ ٹیڑھ ہے مجھ ناتواں سے

صبا کہہ عندلیبِ بوستاں سے
بہار آئی ہے، بدلا لے خزاں سے

گئے گزرے ہیں ہم تو اپنی جاں سے
اُٹھاؤ ہاتھ اب تو امتحاں سے

ترا تیرِ نگہ گزرا ہے جاں سے
یہ کہہ دے کوئی اس ابرو کماں سے

اسیرانِ قفس، ہے صبر درکار
نہیں حاصل کچھ، اب شور و فغاں سے

نہ کر صرفہ، لگا ایک اور بھی ہاتھ
سلوک اتنا کر اپنے نیم جاں سے

سنائیں دردِ دل کیا خاک اُس کو
کہے جو سُن کے، حاصل اس بیاں سے

کہوں کیا، آہ بیٹھا جائے ہے دل
اُٹھے ہے جب قدم کوے بتاں سے

نہ پوچھو ہجر میں اُس کے کہیں کیا
پڑے ہیں جان ہی کی اب تو سالسے

ہزاروں ڈھب لگائے آہ لیکن
رہی اَن بَن ہی اُس کے پاسباں سے

سوا تنہائی کے حاصل ہوا کیا
خضر کو عیشؔ، عمرِ جاوداں سے

(۶۵)

لے کے دل تم نہیں دیتے تو نہ دو، یوں ہی سہی
اس میں قسمت کا جو ہونا ہو سو ہو، یوں ہی سہی

ہم تو کہویں ہیں گے حالِ دلِ شیدا اُن سے
یہ ہی نا[1]، وہ نہ سنیں گے، نہ سنو، یوں ہی سہی

---

[1] ل : یہی ہے

جب کہا اُن سے کہ تم ملتے ہو غیروں سے، تو وہ
بولے رستا لو، زیادہ نہ بکو، یوں ہی سہی

گر رہِ عشق میں رکھا ہے قدم حضرتِ دل!
جو وہ بیداد کرے اُس کو سہو، یوں ہی سہی

میں یہ سمجھا تھا مرے حال پہ کچھ آئے گا رحم
اُن کو سو اُلٹے وہ ہنستے ہیں، ہنسو، یوں ہی سہی

آپ بیداد نہیں کرتے، میں کہتا ہوں غلط
آپ سچے ہیں میں جھوٹا ہوں، چلو، یوں ہی سہی

عیشؔ انکار نہیں یار سے کرنا اچھا
وہ اگر جان بھی مانگے تو کہو یوں ہی سہی

(۶۶)

نہیں عاشق ہوئے گر تم تو رنگت زرد پھر کیوں ہے
نہیں گر دل لگی صاحب تو دل میں درد پھر کیوں ہے

نہیں ہے سرد مہریِ بتاں کا دل اگر مارا
تو بھرتا مضطرب ہو ہو کے آہِ سرد پھر کیوں ہے

ملا کر خاک میں آئی نہیں مجنوں کو گر لیلےٰ
تو گھیرے ناقۂ لیلیٰ کو آئی گرد پھر کیوں ہے

کہو اس بوالہوس سے، جان گر پیاری ہے الفت میں
تو لیتا عشق کا تو نام، اے نامرد پھر کیوں ہے

تصوّر آ ہوے چشمِ بتاں کا گر نہیں دل میں
تو تو وحشی صفت اے عیشؔ صحرا گرد پھر کیوں ہے

(۶۷)

بے حجابانہ کبھی بزم میں آؤ تو سہی جلوۂ حسنِ خداداد دکھاؤ تو سہی

دل لیا تھا مرا کس قول و قسم پر تم نے ادھر کر کے ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی
گر بڑے باپ کے بیٹے ہو تو اے حضرتِ دل سامنے اس بتِ سفاک کے جاؤ تو سہی
حال کھل جائے گا سب حضرتِ ناصح تم بھی کسی بے درد سے دل اپنا لگاؤ تو سہی
حالِ دل اس ستم ایجاد کو ہم بھی دیکھیں
عیشؔ کس طرح سے لاتے ہو سناؤ تو سہی

(۶۸)

نہیں کوئی کسی کا یہاں میاں اللہ ہی اللہ ہے
کہا اور پھر کہیں گے ہاں میاں اللہ ہی اللہ ہے
کہاں گل، اور کہاں بلبل، کہاں سرو، اور کہاں قمری
کہاں سنبل، کہاں ریحاں، میاں اللہ ہی اللہ ہے
سمجھ رے دولتِ دنیا کوئی دم میں فنا ہوگی
نہ ہونا اس پہ تو نازاں میاں اللہ ہی اللہ ہے
عبث دل باندھتے ہو جمعِ اسبابِ جہاں پر تم
نہ کام آوے گا یہ ساماں میاں اللہ ہی اللہ ہے
بھلائی اپنی چاہے تو تو جپ نام اپنے اللہ کا
یہی رکھ اپنا وردِ جاں میاں اللہ ہی اللہ ہے
حقیقت کچھ نہیں دنیا کی دنیا چند روزہ ہے
نہ ہو اس کے لیے حیراں میاں اللہ ہی اللہ ہے
سنا کیسا کماندار اور کماں کیسی دیوانے ہو
کہاں تیر اور کہاں پیکاں میاں اللہ ہی اللہ ہے
کہاں خال و خط اور زلفیں کہاں لب اور کہاں دنداں
کہاں ابرو کہاں مژگاں میاں اللہ ہی اللہ ہے

پھنسا مت دل کو تو حرص و ہوا میں عیش دنیا کے
سمجھ اس کو نہ ہو ناداں میاں اللہ ہی اللہ ہے

(۶۹)

کیا ہوئے عاشق اس شکر لب کے — طعنے سہنے پڑے ہمیں سب کے
بھولنا مت بتوں کی یاری پر — ہیں یہ بد کیش اپنے مطلب کے
قیس و فرہاد چل بسے افسوس — تھے وہ کمبخت اپنے مشرب کے
شیخیاں شیخ جی کی دیں گے دکھا — مل گئے وہ اگر کہیں اب کے
یاد رکھنا کبھی نہ بچیے گا — ق — مل گئے آپ وقت گر شب کے
اس میں خوش ہو ویں آپ یا ناخوش — یار تو ہیں سنا اسی ڈھب کے

یارو بن عیش مے کشی توبہ
ہے یہ اپنے خلاف مذہب کے۔

(۷۰)

کمندِ زلف وہ اپنی جو کھول کر باندھے — تو ایک پیچ میں لاکھوں کے دل کو دھر باندھے
یہ شیخیاں تری اک پل میں جائیں خاک میں مل — جو تار رونے کا ہے ابرِ چشم تر باندھے
یہ ڈر ہے تیغ نگہ کا تری کہ آٹھ پہر — پھرے ہے چرخ بھی خورشید کی سپر باندھے
اب آپ ہی کہیے کوئی بچ سکے یہ ممکن ہے — نگاہِ یار اگر قتل پر کمر باندھے
جلاویں خیمۂ افلاک ایک دم میں ابھی — وہ ہم سے شرطِ اگر شوخ فتنہ گر باندھے
جو قافیے تھے سو سب اس میں آچکے آگے — اب اور قافیہ کیا کوئی اپنا سر باندھے

فلک کی ٹیڑھ ابھی دم میں سب نکل جائے
جو ہمتِ عیش ترا نالۂ سحر باندھے

(۷۱)

ملنے سے جس کے خاک میں لاکھوں کے گھر ملے
ان ظالموں سے کیا کوئی عیش اپنا سر ملے

ہوا تنی بات اُس کی نظر سے نظر ملے

ہم جائیں پھر جو ڈھونڈے بھی دل کی خبر ملے

ہم جان تک ہیں اُس کے خریدار اے صبا!

لانا شمیمِ زلفِ معنبر اگر ملے!

تیغِ نگاہ اس نے لگائی جو، ہو خفا

لاکھوں جتن کیے پہ نہ زخمِ جگر ملے

آساں نہیں بتوں سے لگاوٹ، اگر کوئی

اُن سے ملے تو سر سے کفن باندھ کر ملے

دی جان و دل کو آگ، پھکا سب متاعِ دل

یارب کسی کو ایسا نہ سوزِ جگر ملے

کمبخت دل ملا تو ہمیں وہ ہوس بھرا

نالے ملے جو آہ، تو وہ بے اثر ملے

فرہاد و قیس سیدھے مسلماں تھے بہ رہے

مجھ سا فلک کو گر کوئی آشفتہ سر ملے

اے عیش کیا بیان کروں، ایک عمر سے

تھی دل میں آرزو کہ کوئی نامہ بر ملے

کیا پٹیں اس کو خوبیِ قسمت کی بات ہے

اب نامہ بر ملے ہیں، تو وہ معتبر ملے

بھیجیں جو اس کو خط، تو وہ دیں جا کے غیر کو

ظاہر میں اِس طرف ہیں، یہ باطن اُدھر ملے

(۷۲)

چاہنے کے واسطے بھی کوئی انساں چاہیے
تم بھی ایسے ہو کہ جو تم کو مری جاں چاہیے

کیوں زلیخا یوسفِ کنعاں کو زنداں چاہیے
چاہیے اس کے لیے یہ جس کو ناداں چاہیے

فرقتِ جاناں میں، اے دل، یاد رکھ کرنا مجھے[1]
جان کو وقفِ غم، جگر کو صرفِ مژگاں چاہیے

یاد میں حسنِ ملیح یار کی جب تک رہے
توڑنا ہر زخم کے سر پر نمکداں چاہیے

کشتۂ تیغِ نگاہِ چشمِ میگوں ہوں، مرے
غسل دینے کے لیے خونِ شہیداں چاہیے

وسعتِ صحرا ہے کم اس سے، تڑپ سکتا نہیں
تیرے بسمل کے لیے تھوڑا سا میداں چاہیے

فارغ البال اس طرح ہو بیٹھنا اچھا نہیں
زخمِ دل سے کچھ تو چھیڑ اے نوکِ مژگاں، چاہیے

کوئی دم گر دیکھنا ہو تجھ کو لطفِ زندگی
دل کی جا سینے میں رکھنا اس کا پیکاں چاہیے

شغل تو لاکھوں ہیں وحشت میں پر اے دستِ جنوں[2]
چاک کرنا پہلے دامن تا گریباں چاہیے

حاصل اس تکلیفِ لاحاصل سے اے چارہ گر
دل ہی ہم رکھتے نہیں، پھر کس کا درماں چاہیے

یوں نمک چھڑکا تو کیا زخمِ جگر پر پہلے خوب
کوچنا اس کو سناں اے نوکِ مژگاں، چاہیے

وہ دلِ حیراں دکھاؤں میں کہ اس کو دیکھ کر
نرگس و آئینہ بھی رہ جائیں حیراں، چاہیے

اس قدر نا آشنا ہے ہاں سے اس بت کی زباں
وہ بھی کہتا ہے نہیں، کہنی جہاں ہاں، چاہیے

وہ پریشاں حال ہوں تیرے پریشاں حال کو
ہو پریشاں دیکھ کر زلفِ پریشاں چاہیے

مثلِ آئینہ منافق پیشگی اچھی نہیں
ظاہر و باطن مسلمانوں کا یکساں چاہیے

حضرتِ ناصح، یہ کہہ کر کان کھاتے ہیں مرے
ق دل کو سمجھانا تجھے تا حدِّ امکاں چاہیے

یہ کوئی کہہ دو[3] کہ ہم تو دل کو سمجھائیں گے آہ
پر سمجھنا آپ کو بھی یہ بصد جاں چاہیے

دل اگر قابو میں ہو اپنے، تو سمجھائے کوئی
جب نہ ہو یہ بات، تو بننا نہ ناداں چاہیے

جس پہ گزرے سو وہی جانے، آپ کی جانے بلا
جانیے جب گزرے کسی کو آپ بھی ہاں چاہیے

اچھی صورت دل میں کھب جاتی ہے شرط اے عیشؔ اور
دل لگانے کے لیے کیا ساز و ساماں چاہیے

(۷۳)

گر اپنی چشمِ مست کو تکلیف یار دے
اک پل میں دخترِ رز کے نشے سب اتار دے

عاشق کو کوئی ہند سے گر تا تتار دے
تو بھی نہ زلفِ یار کا وہ ایک تار دے

---

۱ تجھے ۲ ل : بہت ۳ ل : دے

یا اِن بتوں کے دل میں الٰہی پیار دے — یا عاشقوں کو عشق ہی سے ننگ و عار دے

بوسہ متاعِ حسن سے اے گلعذار دے — کافر زکاتِ حسن نہ دے مستعار دے

مانع ہے ضبطِ دل ہی فقط ورنہ چرخ کے — دم میں دھوئیں اُڑا نفسِ شعلہ بار دے

اپنی دعا یہی ہے کہ اللہ دوستو! — دشمن کو بھی نہ ایسا دلِ بے قرار دے

جو جرعہ کش ہیں چشمِ سیہ مستِ یار کے — کیفیت ان کو کیا مئے خوش گوار دے

بیدادِ چرخ سہتے ہیں پر ڈر یہی ہے آہ — ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دل سے اُتار دے

کیوں بد کہیں ہیں چرخ کو بیچارہ آسماں — تقدیر کے بگاڑ کو کیونکر سنوار دے

اے نشترِ مژہ نہیں تن میں لہو کی بوند — لائے کہاں سے جو رگِ جاں خوں کی دھار دے

سنتا نہیں ہے نالہ و فریاد یہاں کوئی — اے ضبط تو ہی دادِ دلِ بے قرار دے

اے شمعِ صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

دے دل بتوں کو منع میں کرتا نہیں یہ عیشؔ

دل دے انھیں تو ہو کے ذرا ہوشیار دے

(۷۴)

جو پری رو ترے پانوں کے تلے جان دھرے — حیف ہے بات یہ بھی اُس کی نہ تو کان دھرے

اُس سے کیا کہیے توقع کوئی انسان دھرے — لے کے دل ہاتھ جو کانوں پہ ہو انجان دھرے

جمع جو کرتے ہو اسباب تم اس دنیا کے — غافلو یوں ہی یہ رہ جائیں گے سامان دھرے

یوں جو چاہو سو کہو ایک بھی جیتا نہ بچے — سچ تو یہ بات ہے گر قتل پہ وہ دھیان دھرے

یہ تماشا نہیں دیکھا نہ سنا عاشق کو — ایک تو قتل کرے دوسرے احسان دھرے

آگئے بزم میں گر وہ تو سنا یوں ہے ترے — ناصحا طاق پہ رہ جائیں گے اوسان دھرے

زیست کا لطف اگر چاہے کوئی دم کوئی — دل کی جا سینے میں اُس تیر کا پیکان دھرے

وہ وہ بخشندہ ہے تم حشر کو سن ہی لینا — کہ یوں ہی عاصیوں کے رہ گئے عصیان دھرے

چارہ گر سے یہ کہو سو وہ الماس ہے عیشؔ!

پُر کرو زخموں کے مرے بھر کے نمکدان دھرے

(۷۵)

کروں میں عرض اگر آپ کو بُرا نہ لگے
یہ ڈھنگ چھوڑ دو کہیں دیکھو بد دعا نہ لگے

یہ جس کے نام سے قالب میں جان آتی ہو
گلی میں اس کی کہو کیونکہ دل مرا نہ لگے

کریں نہ خواب میں آنے کا اُس کے کیا شکوہ
جب اپنی آنکھ جدائی میں اک ذرا نہ لگے

خدا بچائے سُنا عشق جس کو کہتے ہیں
یہ وہ مرض ہے کہ دعا جس کو اور دوا نہ لگے

فراقِ یار سے اے چشم نخلِ مژگاں میں
بتا تو دے کہ گل و برگ و بار کیا نہ لگے

ترے فراق میں چھاتی پہ رکھ کے سل چپ ہوں
کہ تیرے نام کو بتّا کہیں سنا نہ لگے

بُری بلا ہے محبت یہی دعا مانگو
کہ دل کسی کا کسی سے کبھی خدا نہ لگے

جو دیکھے قدِ موزوں کو اُس کے گلشن میں
تو سرو قمری کی آنکھوں میں خوشنما نہ لگے

ادائے شکرِ دمِ ذبح کیجو قاتل کا
زبان تالو سے اس وقت دیکھنا نہ لگے

تم ایک دل ہی کو روتے ہو عیشؔ عشق میں آہ
یہ راہ وہ ہے جہاں جان کا پتا نہ لگے

(۷۶) *

مزہ ملے ہے جنھیں قتلِ بے گناہوں سے
خدا بچائے ان آفت بھری نگاہوں سے

فلک نہ کیجیو فرہاد و قیس ہم کو کہیں
ہم اب بھی کہتے ہیں بچنا ہماری آہوں سے

جو اُس کے در کے گدا رکھتے ہیں نظر اُس پر
کب اُن کی آنکھ جھپکتی ہے بادشاہوں سے

وہ جان دینے کو بیٹھے ہیں کوئے قاتل میں
صبا نہ بولیو اُن خانماں تباہوں سے

کریں گی اُن کی سنا کج ادائیاں پامال
نہ دل لگائیو دلّی کے کج کلاہوں سے

سنی ہے وسعتِ بخشش خدا کی اے واعظ!
گناہ گاروں کو فرصت کہاں گناہوں سے

نہ ڈر تو کثرتِ عصیاں سے عیشؔ توبہ کر
نہیں بگاڑتا اللہ عذر خواہوں سے

---

* غزل ۷۶ کے بعد سے تمام غزلیں لندن کے نسخے میں موجود نہیں

(۷۷)

ساقیا! بن یار دے مت مُل خدا کے واسطے
مت رُلا ہنس ہنس کے او قُلقُل خدا کے واسطے

اس دلِ جاں خستہ کی گر زندگی منظور ہے
دوستو، لاؤ اُسے مِل جُل خدا کے واسطے

لوٹتے ہیں سانپ چھاتی پر تری زلفوں کو دیکھ
رُخ پہ تو مت چھوڑ آ کاکل خدا کے واسطے

یادِ زلفِ عنبریں آتی ہے مجھ کو باغ میں
پیچ مت کھا اس طرح سنبل خدا کے واسطے

یاد آتا ہے لچکنا اُس کمر کا باغ میں
مت لچک اس طرح شاخِ گُل خدا کے واسطے

فصلِ گُل میں چاہیے ہنسنا تجھے حیراں ہوں تو
نوحہ گر کیوں ہے بنا بلبل، خدا کے واسطے

عیش کو ہر لحظہ ہر دم ہے تمھیں سے التجا
لو خبر میری شہِ دُلدُل خدا کے واسطے

(۷۸)

دیکھ اِدھر ہے تیرا بسمل اور بھی
چھوڑ جا اک ہاتھ قاتل اور بھی

فکرِ زادِ راہ کر اے دل، کہ ہے
آگے اُس منزل کے منزل اور بھی

ابروے قاتل کا دنیا میں بھلا
ہے کوئی مدِ مقابل اور بھی

واعظِ بیہودہ کی پیری میں، آہ
ہو گئی کچھ عقل زائل اور بھی

ظلم کے اے لو نئے سیکھا ہے ڈھنگ
اب تو وہ غیروں سے مل مل اور بھی

ان بتوں سے عیش بو ملتے ہو تم
ہے تمھارے پاس کیا دل اور بھی؟

(۷۹)

بیٹھتے اٹھتے تیرا ہر دم جو مری جان بھرے
اُس کی جانب سے رقیبوں نے ترے کان بھرے

دلِ حیراں وہ ہے سامنے جس کے پانی
لے کے آئینہ سے تا نرگسِ حیران بھرے

شیخیاں ابر کی بھڑ جائیں گی اک پل میں ابھی
دیدۂ تر بھی ہمارے ہیں وہ طوفان بھرے

دلِ مضطر سے دمِ ذبح یہی ڈر ہے مجھے
کہ نہ قاتل کا لہو میں کہیں دامان بھرے

حالِ دل تجھ سے کہاں آکے کوئی عرض کرے
رات دن گھر میں ترے رہتے ہیں مہمان بھرے

پھنس گئے دام میں صیاد کے، فصلِ گل میں
رہ گئے دل ہی میں بلبل کے سب ارمان بھرے

مرہم ان زخموں پہ جرّاح تجھے خبر ہے کچھ
زخمِ دل بھی کہیں عاشق کے ہیں نادان بھرے

جان و دل، تاب و تواں تک تو دیئے عشق میں عیش
اور الفت میں کہاں تک کوئی نقصان بھرے

(۸۰)

کسی کی نیک ہو یا بد جہاں میں خو نہیں چھپتی
چھپائے لاکھ خوشبو، یا کوئی بدبو نہیں چھپتی

زباں پر جب تلک آتی نہیں، البتہ چھپتی ہے
زباں پر جب کہ آئی بات، اے گلرو نہیں چھپتی

یہاں تو تجھ کو سو پردے لگے ہیں اہلِ تقویٰ سے
بھلا رندوں سے کیوں اے دخترِ رز تو کیوں نہیں چھپتی

سلیقہ کیا کرے اس میں کوئی بیتابیِ جاں کو
چھپاؤ سو طرح جب دل ہو بے قابو نہیں چھپتی

حجاب اس میں کہاں ہے، بے حجابی جس کی عادت ہو
چھپا کر لاکھ ہووے گر کوئی دارو نہیں چھپتی

رخِ روشن کو تم کیوں چھوڑ کر زلفیں چھپاتے ہو
چمک رخ کی چھپائے سے تہِ گیسو نہیں چھپتی

یہ ریشیں و جُبہ و دستارِ زاہد کی بناوٹ ہے
طبیعت بے تکلف جس کی ہو یکسو، نہیں چھپتی

کلام اپنا عبث تو اہلِ دانش سے چھپاتا ہے
جہاں میں، عیشؔ، طرزِ شاعرِ خوشگو نہیں چھپتی

(۸۱)

نہ الفت میں کھو اپنا سر جائے کوئی
نہ کیوں شمع ساں چشم تر جائے کوئی

گلی میں اگر اس کی مر جائے کوئی
تو اس تک نہ لے کر خبر جائے کوئی

کسی کو میں قسموں پہ دل کیونکر دیدوں
کروں کیا، جو لے کر مکر جائے کوئی

وہ سر اپنا پہلے ہتھیلی پہ دھر لے
وہاں بن کے جو نامہ بر جائے کوئی

کریں کیا علاج اس کا، دل لے کے، یارو!
جو ہاتھ اپنے کانوں پہ دھر جائے کوئی

اسے مرد بدتا ہوں، میری طرح جو
وہاں ہو کے سینہ سپر، جائے کوئی

محبت بتوں کی کرے ہاں، وہی جو
دل و جاں سے اپنے گزر جائے کوئی

بتا تو سہی، مثلِ نقشِ کفِ پا!
ترا در کہاں چھوڑ کر جائے کوئی

ہماری طرف سے کہے کوئی اتنا ق
وہاں گر نسیمِ سحر جائے کوئی

کہ تو اپنے ظلموں سے ہرگز نہ باز آ
بلا سے تری اس میں مر جائے کوئی

جہاں میں ہے مثلِ شررِ عیشؔ، ہستی
اس عرصے میں کیا کام کر جائے کوئی

(۸۲)

تیز کرنے کا ارادہ ناخنِ تدبیر ہے
آ گئے اب اے عقدۂ دل، بس تری تقدیر ہے

پہنچ جاتا عرش تک جو نالۂ شبگیر ہے
اس کے کانوں تک نہ پہنچے خوبیِ تقدیر ہے

وہ ہی ہوتا ہے کہ جو کچھ خواہشِ تقدیر ہے
تو دلِ ناداں، عبث منت کشِ تدبیر ہے

ابروئے خمداراں کے تیغِ مژگاں تیر ہے
جھیلنے کو واران کے، یہ دلِ دلگیر ہے

کوئی پوچھے تو سہی، کہ اس نے کیا تقصیر ہے
شمع کا سر کاٹتا اُٹھ اُٹھ کے جو گلگیر ہے

کون تجھ سے ہو گئی خوش خاطرِ دلگیر ہے
کہ سوال اتنا ہمارا تجھ سے چرخِ پیر ہے

اس کے مکھڑے پر جو خطِ سبز کی تحریر ہے
آپ مجھے وہ ہے مصحف، اس کی یہ تفسیر ہے

کر نمک کے ساتھ مشک و ریزۂ الماس حل
زخمِ دل کی چارہ گر، اپنے یہی تدبیر ہے

آبِ حیواں سے نہیں ہونے کا بس سیراب وہ
جو کہ تیرا تشنہ لب، آبِ دمِ شمشیر ہے

چل مبارک ہو تجھے اے عقدۂ دل چین کر
ہو چکا فرسودہ اپنا ناخنِ تدبیر ہے

وہ تو وہاں سرگرمِ آرائش، یہاں جاتی ہے جان
یہاں تو یہ جلدی ہے اور وہاں اس قدر تاخیر ہے

کھل گئی ضبطِ فغاں کی تو حقیقت سب پہ اب
کر مدد اے آہ، تجھ میں کچھ اگر تاثیر ہے

لکھے گر حالِ خستہ تو لکھے کس طرح
شق جگر خامہ کا ہو جاتا دمِ تحریر ہے

امتحاں میں معرکے کے دن نہ رُکنا چاہیے
بُرّشِ شمشیر، بھی کیوں جو ہرِ شمشیر ہے

دل رُبا، غارت گرِ دیں، فتنہ گر، جادو نگاہ
الغرض آفت کا ٹکڑا، وہ بتِ بے پیر ہے

رام کر لیتا ہے اک نیم نگہ میں خلق کو
یہ خدا جانے کہ اس کو یاد کیا تسخیر ہے

بعد مردن خاکِ پا بندانِ زلفِ یار کو
خوبیِ قسمت ہوئی موجِ ہوا زنجیر ہے

ق

یا الٰہی، ایسے کس بے مہر سے پالا پڑا
یا تو یہ دل چُپ لبانِ غنچۂ تصویر ہے

اور کبھی وہ سرد مہری دیکھ پھر اک آہِ سرد
پوچھتا بیتاب ہو مجھ سے، بایں تقریر ہے

عقل حیراں ہے مری، اتنا تو دے مجھ کو بتا
یہ فضائے سینہ ہے، یا خطۂ کشمیر ہے

شیخ کے اس جبّہ ...ار پر مت بھولنا
رند سچ کہتے ہیں، یہ ابلیس کا بھی پیر ہے

عیشؔ، گر سچ پوچھتے ہو تم، تو اگلوں میں سُنا
گر پسندِ خاطر اپنی ہے تو طرزِ میرؔ ہے

(۸۳)

کروں ضبط یا غمِ دل کہوں نہ یہ ہو سکے، نہ وہ ہو سکے
سہوں طعنے اور میں چپ رہوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

اُسے ملتے دیکھوں میں غیر سے، وہ ہوا ہے دیکھنا زہر سے
جو یہ کہے اُس سے نہ میں ملوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

نہ بلاؤں اس کو یہ کیونکہ ہو، وہ بُلائے اور نہ جاؤں میں
اسی سوچ میں، ہوں سرنگوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

نظر اُس کے رُخ کی طرف کروں، کہ میں حال حیرتِ دل کہوں
اجی ششدر اس میں میں ایسا ہوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

کروں ضبطِ نالہ تو دم گھٹے، دُھوئیں چرخ کے اڑیں گر چھٹے
ششش و پنج یہ ہی ہے کیا کروں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

کہیں دردِ دل تو وہ ہوں خفا، نہ کہیں تو جاں کو ہے اک بلا
جگر اور دل ہوئے خون سب، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

کیا دشت ایک نے لالہ گوں، کیا قطع ایک نے بے ستوں
رہے ہم سو ہم سے تو اے جُنوں نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

کرے فکر یا تو معاد کی، ہو تلاش یا کہ معاش کی
وے بخت جب کہ ہو واژگوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

جو گزرتے دل پہ ہیں رنج و غم، کہوں عیش کیا کہ ہیں کیا ستم
نہ چھپا سکوں، اور نہ کہہ سکوں، نہ یہ ہو سکے نہ وہ ہو سکے

(۸۴)

تری فرقت میں دل دیتا بشارت اب بھی اتنی ہے
کہ وہ آئیگا لو کرتا سفارت اب بھی اتنی ہے

لکھا ہے حالِ دل ہم نے یونہیں کچھ مختصر خط میں
خضر آجائے تنگ اُس میں عبارت اب بھی اتنی ہے

نہ دیکھ اے مہرِ چشم کم سے آہِ سرد کو میری
جلا دے خیمۂ گردوں حرارت اب بھی اتنی ہے

مرے گھر آؤ شب آنکھوں ری آنکھوں میں وہ کہتا ہے
خفا ہے پر مری جانب اشارت اب بھی اتنی ہے

مرے تفتہ جگر کی قبر پر آ شمع و پرانے
جلے ہیں دیکھ تاثیرِ زیارت اب بھی اتنی ہے

کریں اک دم میں طے راہِ عدم کو وہ اگر چاہیں
تمھارے کوچہ گردوں کو مہارت اب بھی اتنی ہے

اگر اے عیش ہووے چشم بیں تو عبرت ہو
یہاں اگلوں نے چھوڑی ہاں عمارت اب بھی اتنی ہے

(۸۵)

نہ ہو جس کو کسی کا غم، اسے کہیے تو کیا کہیے
جو سن کر حال ہو برہم، اسے کہیے تو کیا کہیے

سبب ہووے تو کیجے ترک کہیے بے سبب یارو
خفا ہوتا ہو جو ہر دم، اسے کہیے تو کیا کہیے

بھلی کر کے کہیں اس سے تو وہ مانے برا الٹا
جو شیریں کو سمجھے سم، اسے کہیے تو کیا کہیے

نشے میں رات دن مخمور رہتا ہے وہ غیروں میں
ہے اس کا اور ہی عالم اسے کہیے تو کیا کہیے

مزا کہنے کا یہ ہے ایک کہے اور دوسرا مانے
جو ہو ہر بات میں برہم اسے کہیے تو کیا کہیے

سمجھ اچھے برے کی ہو تو کچھ کہنا بھی لازم ہے
ہو یکساں جس کی مدح و ذم اسے کہیے تو کیا کہیے

زبانی حال قاصد سے بھلا ہم عیش کیا کہتے
جو ہووے شخص نامحرم، اسے کہیے تو کیا کہیے

(۸۶)

دیکھ لیں بے تابیاں گر اس دلِ بیتاب کی
برق کے چھکے چھٹیں، گم عقل ہو سیماب کی

تاب لاوے اس رخِ تاباں کے آگے یاد رکھ
تاب کیا ہے اے فلک خورشیدِ عالم تاب کی

عالمِ ہستی سنا اے غافلو ایک خواب ہے
اور جزا اعمال کی تعبیر ہے اس خواب کی

مرہم کافور سے ہوتا ہے اے جراح کیا
زخمِ دل پر ہو تو وے بس چڑھا تیزاب کی

بے حیا کہیے نہ گر اس کو تو کیا کہیے اسے
جو کوئی بن جائے مکھی اغنیا کے قاب کی

رشکِ صد خمخانہ بن بیٹھا ہے دل پہلو میں آج　　مستیاں یاد آ گئیں کس چشمِ مست خواب کی
خاکِ کوئے یار پر جو لوٹنے والے ہیں وہ　　کیا سمجھتے ہیں حقیقت قاقم و سنجاب کی
سچ لکھا تقدیر کا ہوتا ہے پر انسان کو
عیش لازم ہے رعایت عالمِ اسباب کی

(۸۷)

بجاں آیا ہوں اُس رشکِ مہ کاکل کے ہاتھوں سے
ولیکن کیا کروں لاچار ہوں اِس دل کے ہاتھوں سے
بوقتِ ذبح ہاتھ آیا ترا دامن تو اے قاتل!
نہ چھوٹے گا قیامت تک ترے بسمل کے ہاتھوں سے
حنا کہتے ہیں جس کو دیکھنا رنگِ قبول اُس نے
کیا پیدا ہے کیا اُس شوخ کے کُھل مل کے ہاتھوں سے
وہ نازک اس قدر ہیں سخت جاں خنجر دم کشتن
سنبھالا جائے گا کس طرح اس قاتل کے ہاتھوں سے
نہ ہوتے اُن کے عاشق ہم تو کیوں اے عیش غم کھاتے
اُٹھائے سارے صدمے اس دلِ مائل کے ہاتھوں سے

(۸۸)

وہ تجھے شوخِ بے وفا چاہے　　خاک میں جو کوئی ملا چاہے
فلکِ کج ادا ہے سفلہ پرست　　اس سے کیا کوئی مدعا چاہے
ہم تو سو جان سے اسے چاہیں　　اور وہ غیروں کو بے وفا چاہے
جان سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھے　　دل اُنھیں گر کوئی دیا چاہے
ہے وہ مردودِ مذہبِ عشاق　　مرضِ غم سے جو شفا چاہے
اپنے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا　　وہ ہی ہوتا ہے جو خدا چاہے
زلف چھیڑے تری وہ جو سر پر　　اپنی لائی کوئی بلا چاہے

زاہد و رند پر نہیں موقوف فضل کیا جانے اس کا کیا چاہے
عیش! سچ تو یہ ہے سنا، وہ ہی
ہو سہاگن جسے پیا چاہے

(۸۹)

عمرِ عصیاں میں کٹی ساری ہے اے خدا وقتِ مددگاری ہے
بخشنا ہم سے گنہگاروں کا یہ ہی اللہ کی غفاری ہے
مژدہ اے خارِ بیاباں کہ یہاں پھر جنوں ہونے کی تیاری ہے
جو کہ بے خود ہیں مے الفت کے اُن کی بیہوشی بھی ہوشیاری ہے
باغ میں نرگسِ شہلا کو سُنا اُس کی آنکھوں ہی کی بیماری ہے
سینہ ریشوں کے لیے چرخ بھی یاں دیکھ تو مرہم زنگاری ہے
فلکِ پیر نے بھی اس سے نئی سیکھی یہ طرزِ ستم گاری ہے
ہو یقیں بات پہ اُس کی کیوں کر اُس کی ہر بات میں عیاری ہے
اِس سوا اور نہیں کام اُنھیں رات دن مشقِ دل آزاری ہے
تیری فرقت میں یہاں آنکھوں سے خوں کا دریا ہے کہ اک جاری ہے
کیا کہوں عیش کیا اتنا قصور
اُن کو چاہا، یہ گنہگاری ہے

(۹۰)

یاد میں اُس سادہ رُو کے دل کو اک حیرت سی ہے
اور رہی اک جان سو وہ کمبخت بے طاقت سی ہے
وعدہ آنے کا کیا تھا کل تو کچھ تسکین تھی
وہ نہ آئے آج دردِ دل میں پھر شدت سی ہے
اُس کے وعدوں پر یقیں، آئے تو آئے کس طرح
اُس کی ہر ہر بات میں صاحب بھری حرفت سی ہے

بے خبر تو بھی تو اے ظالم کہیں ہیں آج تو
کچھ مریضِ غم کی تیرے اور ہی حالت سی ہے

مشک کی عنبر کی گل کی عطر کی یہ بُو نہیں
آج تو تجھ میں صبا کچھ اور ہی نکہت سی ہے

مائلِ بیداد گر، اس کی طبیعت ہے تو عیش!
ظلم سہنے کی ہمارے دل کو بھی عادت سی ہے

(۹۱)

دردِ دل تو تھا ہی، ہو دردِ جگر یہ بھی سہی
تیرے غم میں وہ تو تھا اے فتنہ گر یہ بھی سہی

عشق میں عقل و خرد، تاب و تواں دے لی بیّ دے
ہیں جہاں لاکھوں ضرر، چل اک ضرر یہ بھی سہی

رنج اتنے عشق میں کھینچے ہیں واعظ اور کیا
یہ ہی نا ہوئنگے وہم آشفتہ سر یہ بھی سہی

یا تو وہ اخلاص، یا یہ دشمنی چل غم نہ کھا
وہ بھی گزری، یہ بھی جائے گی گزر یہ بھی سہی

لے کے دل پامال کرنا عاشقِ ناکام کو
گر یہی ہوتا ہے الفت کا ثمر، یہ بھی سہی

شعلہ رو الفت میں تیری گر ہے قسمت میں لکھا
شمع کی مانند جلنا عمر بھر، یہ بھی سہی

تیرِ مژگاں سے نہ منھ موڑا، تو اب بھی منھ نہ موڑ
تیغ ابرو سے بھی ہو سینہ سپر یہ بھی سہی

وہ طریقِ عشق میں ثابت قدم مردانہ وار
دل اگر اس میں جان بھی جائے نہ ڈر یہ بھی سہی

گر کرے گا عیش سو بیداد پر بیدادِ چرخ
ہم یہی کہہ دینگے، چرخِ کینہ ور، یہ بھی سہی

(۹۲)

نام اللہ کا جپو دل نے شفا ہے تو یہ ہے
جتنے دکھ درد ہیں ان سب کی دوا ہے تو یہ ہے

ناخنِ فضلِ الٰہی کے سوا عقدہ کشا
نہیں زنہار کوئی عقدہ کشا ہے تو یہ ہے

رات دن ذکر میں اللہ کے مصروف رہو
حاصل اس عمر دو روزہ کا سنا ہے تو یہ ہے

ماسوا اللہ سے کر قطع محبت دل سے
تا کھلے تجھ کو کہ جینے کا مزا ہے تو یہ ہے

دور ہوتی نہیں جز ذکر سیاہی دل کی
دل کے آئینے کا گر زنگ زدا ہے تو یہ ہے

چھوڑیے حرص و ہوا ہی، تو یہ ہے عقلِ سلیم		ہونا دنیا سے جُدا، فکرِ رسا ہے تو یہ ہے

عیش، تو سونپ دے سب کام خدا کو اپنے
کیونکہ آسودگیِ ہر دو سرا ہے تو یہ ہے

(۹۳) اور بجا سچ ہے میں نے پی ہی تو ہے		مے مجھے تم نے ہاں جی، دی ہی تو ہے

میرے ہنسنے سے اور بھی وہ رُکے		نہ رُکی، کیا کریں، ہنسی ہی تو ہے

کیوں نہ نالاں ہو عندلیبِ چمن		یہ بھی کم بخت دل جلی ہی تو ہے

جس کو کہتے ہیں لوگ خلدِ بریں		وہ اجی، یار کی گلی ہی تو ہے

کیوں نہیں کھولتے دل عاشق کا		اے صبا، یہ بھی اک کلی ہی تو ہے

جان و دل اُس کو سب دیے میں نے		کیا کریں، یار، عاشقی ہی تو ہے

تم رُکے مجھ سے، میں بھی تم سے رُکا		دل بدل، یار، آرسی ہی تو ہے

سادگی پر بتوں کی مت جانا		آفتِ جاں وہ سادگی ہی تو ہے

عشق میں اور ہیگا کیا حاصل		اک فقط دل شکستگی ہی تو ہے

عشق میں، آہ، جاں کے جانے کا		کیا اچنبھا ہے، دل لگی ہی تو ہے

عیش، حکمِ خدا سے یہاں اور وہاں
تیرا مشکل کشا علی ہی تو ہے

(۹۴) حد ہے کچھ، صاحب، امتحاں کی بھی		آچکی نوبت اب تو جاں کی بھی

کر چکے سیر اس جہاں کی بھی		دیکھ لی رسم و راہ یہاں کی بھی

خفگیِ گل کی بلبلوں پہ ہوئی		بن پڑی، اے لو باغباں کی بھی

ب تو تیغِ نگاہِ یار ذرا		لے خبر اپنے نیم جاں کی بھی

عندلیبِ چمن کو باغ میں، حیف		نہ ملی جا اک آشیاں کی بھی

دردِ دل اپنا وہ کہے کیونکر		جس کو طاقت نہ ہو بیاں کی بھی

خستہ جانوں کی آہ کے آگے		کچھ حقیقت ہے آسماں کی بھی

نہیں طوفانِ نوح سے کچھ کم		موج اس چشمِ خوں فشاں کی بھی

اُس سے کہوے، تو کیا کہے کوئی نہ سنے جو فرشتہ، خاں کی بھی
شعر میں علم کے سوائے عیش
چاہیے شستگی زباں کی بھی

(۹۵)

مژگاں ہوئیں کیا اُس کی صف آرا مرے آگے
دل کو مرے، بس چھنتے ہی مارا مرے آگے
دل ٹوٹ گیا، کیا کہوں، ساقی نے پری کو
کس ڈھب سے ہے شیشے میں اُتارا مرے آگے
یہاں سونگھا ہے اُن زلفوں کو، کیوں ہووے نہ بے قدر
مشکِ ختن و عنبرِ سارا مرے آگے
اُس شخص سے ہو کیونکہ نہ دل کو مرے نفرت
شکوہ کرے جو آکے تمھارا مرے آگے
رکھتا ہوں میں سینے میں، سنا، وہ دلِ بے تاب
آتے ہوئے تھرّائے ہے پارا مرے آگے
سر کشتہ ہیں ان باتوں میں، اور جاتی ہیں جانیں
غیروں سے نہ کیجے گا اشارا مرے آگے
جی چاہے ہے یہ ہی کہ اسی طرح میں پڑھ تو
ایک اور غزل عیش، دوبارا مرے آگے

(۹۶)

جب زلفِ درازاُس کی ہوئی وا، مرے آگے
کیا ہوگا جو ہے گی شبِ یلدا مرے آگے
اچھا تو ہے اچھا ہی، نہیں اُس میں برائی
پر جو ہے برا، وہ بھی ہے اچھا مرے آگے

جب میں نے کہا دل مرا حاضر ہے، یہ لیجے
کہنے لگے یہ کیا ہے، جو لا یا مرے آگے

واعظ تیری باتوں کا بتا کچھ ہے سروپا
بیہودہ نہ بک، بے سرو بے پا مرے آگے

دعوے ہیں بہت بوالہوسوں کو، کوئی اُن کا
آدے تو ہی چاہنے والا مرے آگے

ہم یہ ہی نا، مر جائیں گے حسرت تو مٹے گی
بے پردہ کسی روز تو آجا مرے آگے

کچھ اس میں تعلّی نہیں، اِس دستِ جنوں نے
ہے ٹکڑے کیا دامنِ صحرا مرے آگے

ہوں گا میں وہ ثابت قدمِ معرکۂ عشق
رستم کا بھی اُٹھ جاوے گا تلوا مرے آگے

مدّت سے میں واقف ہوں بھلا غنچۂ گُل کی
بلبل اجی باندھے گی ہوا کیا مرے آگے

اُس شوخ نے گلشن میں کئی بادِ صبا سے
نُچ ڈالے ہیں غنچوں کے کئی بِسلوا مرے آگے

ہیں سب یہ فساد اُن کے، وہ بولیں گے بتا عیش!
منھ لے کے بھلا حضرتِ دل کیا مرے آگے

(۹۷)

جب تنِ عالی سے تیرے دور بیماری ہوئی
رحمتِ حق اہلِ عالم کے لیے طاری ہوئی

دل سے ہر یک کے وہ کے تخرجہ غم کا ہوا
اور ہر دل میں خوشی کی مہمانداری ہوئی

تندرستی سے ہوا تیری اک عالم تندرست
فی الحقیقت سب یہ مہر حضرتِ باری ہوئی

گلشنِ دنیا میں تیرے دکھ سے تھی پژمردگی
تو ہوا اچھا تو پھر سر سبز پھلواری ہوئی

تیری صحت کے سبب سب کو سبکدوشی ملی — ورنہ تھی ہر ایک کو اپنی زندگی بھاری ہوئی
گردِ الفت دل سے ہر اک شخص کے دھوئی گئی — غسلِ صحت کی شہا، جب تیرے تیاری ہوئی

عیشؔ، لشکر نے دعا کی، اس فلک کج باز سے
کیا مدد سے حق کی، بازی جیت لی ہاری ہوئی

(۹۸)

مریضِ عشق کو ہے دردِ دل دوا کے لیے — رہی غذا، سو ہے خونِ جگر غذا کے لیے
وہ کارگر ہو دعا، کیا بھلا شفا کے لیے — نہ جب دعا میں ہو ڈھونڈے اثر دوا کے لیے
ہیں اب کے تیز جو صحرا میں اس قدر سرِ خار — خدا ہی جانے کہ ہیں کس برہنہ پا کے لیے
نہ کیونکہ جان دے دل، صدمۂ جگر سن کر — ہمیشہ دیتے ہیں جاں یاری آشنا کے لیے
ہم عاصیوں کا بھی اللہ ہے، کرا اے واعظ! — تو معتقد ہے کہ جنت ہے پارسا کے لیے
جفائے چرخ و ستم ہائے غیر و حسرت و غم — یہ جھگڑے جان کو مول، اُن سے دل لگا کے لیے
وہ قاتل آئے، تو یہاں ہم بھی سر ہتھیلی پر — لیے پھرے ہیں اسی خنجر آزما کے لیے
تم اپنا دل لیے پھرتے ہو اُس نے لاکھوں دل — اسی طرح سے ہیں باتیں بنا بنا کے لیے

ہوا ہے رنگِ حنا عیشؔ زیب پا اس کے
یہ جائے رشک ہے، رتبہ ہو یہ حنا کے لیے

(۹۹)

تم ہم پہ عمر بھر نہ جفا کیا کیا کیے — اور اس جفا پہ ہم، نہ وفا کیا کیا کیے
تیرے تپِ فراق میں جز سوز و گریہ ہم — مانندِ شمع اور بھلا کیا کیا کیے
بے حاصلی میں عمر نہ کھویا کیے تو اور — پابندگانِ حرص و ہوا کیا کیا کیے
تیرے لیے نہ تڑپے تو اے کعبۂ مراد — ہم اور مثلِ قبلہ نما کیا کیا کیے
فرقت میں یادِ زلف و رخِ یار کے سوا — ہم شغل اور صبح و مسا کیا کیا کیے
بیداد و جور، ظلم و ستم کے سوا بھلا — تم اور حق میں میرے سوا کیا کیا کیے

اے عیشؔ ساری عمر بتا، ہم بقولِ ذوقؔ
"اُس بُت کی التجا کے سوا کیا کیا کیے"

(۱۰۰)

دل تھا خوبانِ خوب رو کے لیے
نہ کہ پامالیِ عدو کے لیے

اے صبا، ہے مشامِ جاں بیتاب
نکہتِ زلفِ مشکبو کے لیے

کیوں کیا صرفِ آرزو دل کو
دل تھا کیا صرفِ آرزو کے لیے

قدر ہی جب نہ ہو کسی کو، تو پھر
کیوں کوئی جان دے کسو کے لیے

چشمِ تر عاشقوں کو وقتِ نماز
دے ہے خونِ جگر وضو کے لیے

قطرۂ اشک منفعل ہے بہت
داغِ عصیاں کے شست و شو کے لیے

ہے جنھیں پاسِ آبرو، وہ عیشؔ!
جان دیتے ہیں آبرو کے لیے

(۱۰۱)

یا رسولِ مجتبیٰ، محبوبِ رب تُو ہی تو ہے!
ہر ظہورِ جلوۂ حق کا سبب تُو ہی تو ہے

کیوں نہ ہم عاصی ہوں خوش، اے رحمۃ للعالمیں
شافعِ روزِ جزا کہتے ہیں سب، تُو ہی تو ہے

اہلِ عالم کو نہ ہو کیوں نازٗ تیری ذات پر
فخرِ ہر ذی فخر اے عالی نسب، تُو ہی تو ہے

بارگاہِ کبریائی کا فقط آداب داں
اے ادب آموزِ ہر اہلِ ادب تُو ہی تو ہے

نور سے تیرے ہی ہے چشمِ فلک کو روشنی
رونقِ ہر ذرّہ، اے ماہِ عرب! تُو ہی تو ہے

تجھ سے ہے حق کی طلب، اور ہر دم اے خیر البشر!
دین و دنیا میں مری حق سے طلب تو ہی تو ہے
اسمِ اقدس ہے ترا درمان دل ہر درد کا
اور طرب افزاے جانِ پُر تعب تو ہی تو ہے
حشر کو مایوس ہو کر سب کریں گے عرض یہ
یا محمدؐ بخشوانے والا اب، تو ہی تو ہے
عیشؔ کے دل کو بھی کروادے منوّر حق سے کیوں
باعثِ تنویرِ مہر و ماہِ شب تو ہی تو ہے

(۱۰۲)

میں بُرا ہی سہی، بھلا نہ سہی — پر تری کون سی جفا نہ سہی
دردِ دل ہم تو اُن سے کہہ گزرے — گر انھوں نے نہیں سنا؟ نہ سہی
شبِ غم میں، بلا سے شغل تو ہے — نالۂ دل مرا رسا نہ سہی
دل بھی، اپنا نہیں رہا، نہ رہے — یہ بھی، اے چرخِ فتنہ زا، نہ سہی
دیکھ تو لیں گے وہ، اگر آئے — طاقتِ عرضِ مدّعا نہ سہی
کچھ تو عاشق سے چھیڑ چھاڑ رہی — کج ادائی سہی، ادا نہ سہی
کیوں بُرا مانتے ہو شکوہ مرا — چلو بے جا سہی، بجا نہ سہی
عقدۂ دل ہمارا، یا قسمت! — نہ کھلا تجھ سے، اے صبا، نہ سہی
واعظو، بندۂ خدا تو ہے عیشؔ
ہم نے مانا، وہ پارسا نہ سہی

(۱۰۳)

وہ آئے صبح سے تا صبح یہاں خیال یہ ہے
وہاں وہ غیروں میں خوش ہیں، بگے، اُن کا حال یہ ہے

چلے ہیں بارِ گنہ رے کے یہاں سے سر پر ہم
وہاں دکھائیں گے کیا منھ بس انفعال یہ ہے

سُنا، وہ نظروں میں دل اس طرح اُڑاتے ہیں
کہ ہو نہ صاحبِ دل کو خبر، کمال یہ ہے

نہ پوچھو عشق کی نیرنگ کیا کہوں تم سے
جھڑی ہے آنکھوں سے، سینے میں اشتعال یہ ہے

خرامِ ناز سے دل، اک جہاں کا ہے پامال
جو کہیے اُن سے، تو کہتے ہیں، اپنی چال یہ ہے

کرے ہے دل وہ پریشاں، اور یہ کھینچیں ہیں جان
بلا ہے زلف وہ، اور قہر خط و خال یہ ہے

نہ ہوشِ جان، نہ پروائے تن، نہ نیند، نہ بھوک
جہاں میں عشقِ بتاں کا، غرض مآل یہ ہے

دکھاکے چرخ کو، اُس کا تراشۂ ناخن!
کہو کہ دیکھ زمیں پر، فلک، ہلال یہ ہے

اُدھر تو عیشِ جفاہائے چرخ و طعنۂ غیر
اِدھر یہ سینے میں تڑپھے ہے دل، وبال یہ ہے

(۱۰۴)

دل میں کچھ تیرے غنچہ لب کیا ہے
اِس طرح چُپ ہے تو سبب کیا ہے

اے فلک، کیا تجھے نہیں معلوم
اثرِ گریہ ہائے شب کیا ہے

قدر الماس و لعل کی اُس کے
پیشِ دندان و لعل و لب کیا ہے

یاد میں زلف و رخ کی اُس کے ہمیں
نہیں معلوم روز و شب کیا ہے

جز فنائے خودی بتادے کوئی
اور ملنے کا اُس کے ڈھب کیا ہے

دل تو پہلے وہ کرچکے پامال!
باقی اِس نیم جاں میں اب کیا ہے

یا تو وہ اختلاط تھے شب و روز ق خفگی یا یہ ہے، سبب کیا ہے
وہ ہی تم، وہ ہی ہم، وہی دن رات اُن دنوں کیا تھا؟ اور اب کیا ہے
جو ہیں عاشق، اگر انھیں، کوئی کہوے مجنوں، تو عجب کیا ہے
یہ ہے سودائی، یہ ہے دیوانہ اور عشاق کا لقب کیا ہے

نوک جھوک اُس کی چشم مست کی عیشؔ
دیکھیے ڈھاتی اب غضب کیا ہے

(۱۰۵)

نہ آسمان ہی الٹا ہے نہ زمیں اُلٹی مگر ہے ایک رہ و رسم بس وہ ہیں اُلٹی
جو کہیے سیدھی، تو سمجھے وہ نازنیں اُلٹی جہاں میں دیکھی ہے تقدیر یہ کہیں اُلٹی
صبا کرے گی نہ کچھ قدرِ عنبر و مہ و مہر جو اُس نے رُخ سے کبھی زلفِ عنبریں اُلٹی
سمجھتے نیکوں کو ہیں بد، بدوں کو نیک، یہ کیا ہوا چلی ہے زمانے میں ہم نشیں، اُلٹی
زمیں سے تا بفلک، ہو گئے تہ و بالا یہ کس نے آج پئے قتل آستیں اُلٹی
مٹے مٹائے سے کس طرح ہمنشیں جس کی ہوئی ہو مثلِ نگیں بات دل نشیں اُلٹی
درست ہووے مقدر، تو سم بھی ہوئے شہد دگرنہ ہو، تو ہو تاثیر انگبیں اُلٹی
گدھے کی طرح سے یہاں تک چڑھے ہے شیخ کے پھر کیا کرے ہے وہ پی کر سکنجبیں اُلٹی

خدا ہی جانے، میں اے عیشؔ کیا کہوں یا تو
وہ اُلٹی کہتے ہیں، سمجھے ہیں یا ہمیں اُلٹی

(۱۰۶)

کیوں، ہوتے ہو یار، ہم سے ٹیڑھے سیدھے ہم ہیں وہ ہی، ہو ہزار ٹیڑھے سیدھے
لاکھوں ہی بنا دیے ہیں دم میں تو نے اے گردشِ روزگار، ٹیڑھے سیدھے
اُس تیغِ نگاہ نے کیے ہیں، دیکھو! کیا کیا مرے دل پہ وار ٹیڑھے سیدھے
کیوں دیتے ہیں زخمِ دل کو میرے ٹانکے آ آ کے یہ دستکار ٹیڑھے سیدھے
ہے وہ جو قمار خانۂ دہر میں موت سب اس سے گئے ہیں ہار ٹیڑھے سیدھے

یاقوت ورشید پہ ہنسے ہیں جو صرف لکھ جانے ہیں پانچ چار ٹیڑھے سیدھے
عیشؔ اُن سے کہو کہ ہم سے کیجے نہ کلام
اس طرح سے بار بار ٹیڑھے سیدھے

(۱۰۷)

ہوں گے وہ اور کوئی مرنے سے ڈرنے والے
جان دینے میں نہیں ڈرتے ہیں مرنے والے
سر کو دھر لیتے ہیں پہلے ہی ہتھیلی پر اُتار
عشق کی راہ میں ہیں پاؤں جو دھرنے والے
جلتے جل جاویں، مگر شمع کی مانند کبھی!
اُف بھی کرتے نہیں، دم عشق کا بھرنے والے
منزلِ عشق کا طے کرتے ہیں میدان وہی
جان سے اپنی جو ہیں لوگ گزارنے والے
عیشؔ معشوقوں سے ہو تجھ سے جہاں تک بچنا
کیونکہ یہ لوگ ہیں، دل لے کے مکرنے والے

(۱۰۸)

تجھ میں اُس گل سے رنگ و بُو کم ہے وہ زیادہ ہے اس میں، تو کم ہے
ہو کوئی کیوں مُغاں کا مِنّت کش اپنا پینے کو کیا لہو کم ہے
دل سے انسان کے یہ ہوتی کب ہوس و حرص و آرزو کم ہے
شرح سے خان آرزو کی، مری دل کی کیا شرحِ آرزو کم ہے
اہلِ غیرت کو اے فلک، کیا کچھ مرگ سے مِنّتِ عدو کم ہے
دیکھ کر اُس بہارِ خوبی کو ہو گیا گل کا رنگ و بو کم ہے
بات باقی ہے اور کونسی، عیشؔ!
کیا ہوئی اس سے گفتگو کم ہے

(۱۰۹)

دخترِ رز کو جھوٹ کہتے ہیں کہ وہ سنڈی سی ہے
ایک پری ہی کون کہتا ہے کہ مشٹنڈی سی ہے
برق کا شعلہ جسے کہتے ہیں عالم میں سودہ
تفتہ جانوں کی تمہارے آہ، اک ٹھنڈی سی ہے
دیکھ گُل رو، کثرتِ داغِ جدائی کے سبب
سینہ عاشق کا ترے، پھولوں کی اک منڈی سی ہے
جانتے ہیں رہ روانِ عشق ہے الفت کی راہ
اور کیا جانے کوئی، وہ راہ پگڈنڈی سی ہے
سر سے پاؤں تک جلے پہلے تو عاشق ہیں، نہ شمع
اُس کے تو سر پر فقط اک آگ کی جھنڈی سی ہے
طالبِ عقبیٰ کو دعویٰ مرد، ہونے کا ہے جھوٹ
مرد طالبِ حق کا ہے وہ، مرد کیا رنڈی سی ہے
اُس کے پھندوں سے کوئی عیش کو نکر بچ سکے
ہو گئی دنیا کی دنیا ساری پھندی سی ہے

(۱۱۰)

ہم جنوں، وحشت لوردی کو ہیں تیار ابھی
پر کریں کیا کہ نہیں تیز سر خار ابھی
بھول دے زلف کا گر اپنی وہ اک تار ابھی
تو صبا بند ہو، صد غیرتِ تاتار ابھی
دیکھتے دیکھتے ان آنکھوں کے پوچھا نہ گیا
لے اڑا نظروں میں وہ دل بُتِ عیار ابھی
گر ہوئے آپ دوچار اس سے تو اے حضرتِ دل!
زندگی آپ کو ہو جاوے گی دشوار ابھی
پھر پڑی آہ اگر اس کی طرف، تو ساری
بھول جاوے یہ ستم چرخِ ستمگار ابھی
کچھ سنا تم نے، لیا کہتے ہیں رندوں سے اتار
شیخ صاحب کا عمامہ سرِ بازار ابھی
میں وہ ہوں تذکرہ شعر و سخن کو میرے
خار کھائے جو سنے گلشنِ بیخار ابھی

دیکھ لیویں وہ اگر چشم سیہ مست، تو عیش!
خاک ڈالیں مے و میخانہ پہ میخوار ابھی

شمع کی لگ رہی ہے، تو گل سے   (۱۱۱) لاگ ہو اس کو کیوں نہ بلبل سے
باتوں باتوں میں وہ مرے دل کو   کیا کہوں، لے گیا ہے کس چھل سے
آتشِ غم سے شمع کی مانند   آپ بیٹھے ہیں ہم جلے بھلے
اپنی گردن پہ خونِ خلق نہ لے   باز آ، شیوۂ تغافل سے
آگئی یاد اُس کی گردشِ چشم   بزم میں دورِ ساغرِ مل سے

یاد رکھنے کی بات ہے یہ عیش!
کام بھی کیجیے، سو تامل سے

(۱۱۲)

ہے جب سے دل کو تو تری دلبر لگی ہوئی   اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی
بے چین تو جو رہتا ہے یوں، ہم کو سچ بتا   ہے کس کی یاد، اے دلِ مضطر، لگی ہوئی
رندوں کو دیکھ، ناک چڑھائی تو شیخ جی!   رہوے گی یہ نہ آپ کے منھ پر لگی ہوئی
پوچھے تو پوچھے اس سے کوئی دردِ دل کا حال   جس تفتہ جاں کی چوٹ ہو دل پر لگی ہوئی
قتل عاشقوں کا کرنے کو رہتی ہے رات دن   اس کی کمر میں تیغِ دوپیکر لگی ہوئی

اے عیش، سچ تو یہ ہے کرو لاکھ گر جتن
چھپتی نہیں ہے آنکھ یہ کافر لگی ہوئی

(۱۱۳)

زنجیرِ پا جنوں میں وہ زلفِ دراز ہے   دیوانہ پن پہ اپنے ہمیں آپ ناز ہے
واں مایۂ توکلِ زاہد نماز ہے   یہاں عاصیوں کو بخششِ خالق پہ ناز ہے
اندھا نہ بن تو دیکھ کے چل راہ بے خبر!   دنیا میں ہر قدم پہ نشیب و فراز ہے
سینے میں اپنے آتشِ غم کے سوا ہے کیا   ناچار اسی سے دل کو مرے سوز و ساز ہے
جس اپنے دل پہ ناز تھے ہم کو بڑے بڑے   سو ہو چکا وہ پہلے ہی ان کی نیاز ہے

ب خرابیاں ہیں تمھارے حجاب کی — وہ ہی تو سب میں باعثِ افشائے راز ہے
تنگیِ طالعِ عشّاق کچھ نہ پوچھ — ناساز جو ہے اُن کے لیے وہ ہی ساز ہے
عظ مجھے تو عشقِ بتاں سے نہ منع کر — کہتے ہیں نزدیانِ حقیقت مجاز ہے
دل جلے کے نالے کو اپنا سا تو نہ جان — نابل، یہ میرا نالہ، دل، جاں گداز ہے
سبزۂ خط کے، صاف ملاتا ہے خط سے خط — دیکھا جو آئینہ تو بڑا جعل ساز ہے

اس کجروی چرخ سے تو ہو کے تنگ دل
گھبرا نہ عیشؔ، دیکھ خدا کارساز ہے

(۱۱۴)

جو ہنستی ہے خدائی پڑی ہم پر ساری — خوبیاں ہیں تری اے دلِ مضطر ساری
زالفت کے سبب بزمِ جہاں میں ہم تو — شمع ساں عمر گزارا کیے رو کر ساری
انصاف سے، یہ رونے کی جا ہے کہ نہیں — ہنس دیے سب، وہ کہانی مری سن کر ساری
کیا بات ہے رحم آوے ہے اُسے میری — گر حقیقت سنے وہ بیٹھ کے دم بھر ساری

عیشؔ دے بیٹھے ہیں دل اُس بتِ سفّاک کو ہم
جس کے سایے سے خدائی چلے بچ کر ساری

(۱۱۵)

رہا جو جلوۂ حسنِ صنم آنکھوں میں ہے
اس لیے سینے سے ٹھہرا آ کے دم آنکھوں میں ہے
تو واں سرخوش ہیں بزمِ غیر میں غیروں کے ساتھ
مثلِ دریا موجزن یہاں اشکِ غم آنکھوں میں ہے
ن لیوے دل وہ اک نیم نگہ میں کیا کہوں
یہ بھرا اُس بت کے جادو کیا ستم آنکھوں میں ہے
اُسے الماس ہو شرمندہ اور گوہر خجل
عاشقِ شیدا کے وہ ایک ایک رقم آنکھوں میں ہے

سامنے اُس رُخ کے خورشیدِ جہاں تاب، اے فلک !

کرمکِ شب تاب سے بھی وہ تو کم آنکھوں میں ہے

باغ میں اے عندلیبو! اس گلِ خوبی بغیر

خار ہی آیا نظر گل یک قلم آنکھوں میں ہے

دیکھتے ہیں عیشؔ جو کثرت میں وحدت کا ظہور

ان کے یکساں جلوۂ دیر و حرم آنکھوں میں ہے

سہرا

گوہر و لال و زمرد سے گُندھا جل سہرا / آیا وہ باندھ کے نوشہ سرِ محفل سہرا

آج تک چشمِ فلک نے بھی تو دیکھا ہی نہیں / اس جواں بخت کے سہرے کے مقابل سہرا

ہر لڑی اس کی زیادہ ہے رگِ جاں سے عزیز / ہے تہہ دل سے یہ تشریف کے قابل سہرا

مائل اُس سہرے پہ ہیں مہر و مہ و جنّ و بشر / اور ہے اس رخِ روشن پہ وہ مائل سہرا

روشنی بخشِ جہاں کیوں نہ ہو وہ کرتا ہے / نور کو اس رخِ پُرنور سے حاصل سہرا

ذاتِ باری کی طرف سے ہیں نزولِ انوار / دیکھ کر کہتے ہیں اس مکھڑے پہ شامل سہرا

ایسے نوشہ کے لیے ایسا ہی سہرا تھا ضرور / بندھتے ہی کیا رُخِ روشن پہ گیا کھل سہرا

دائرہ ماہ کا لے ہاتھ میں زہرہ گائے / بزمِ عشرت میں طوائف کے ہو شامل سہرا

ہاتھ اٹھا کر سوئے نوشہ یہی دل سے دعا / ہو مبارک تجھے اے حورِ شمائل سہرا

باغ میں گائے جو اس سہرے کو اربابِ نشاط / زمزمے بھول گئے سُن کے عنادل سہرا

دیکھ اس سہرے کو نوشہ کے رُخِ روشن پر / یوں ہی دیکھا کروں کہتا ہے یہی دل سہرا

شرق سے اُس رُخِ پُرنور پہ ماہِ کامل / دیکھئے آیا ہے طے کر کے مراحل سہرا

جمع کر یوں دُرِ مضمون و گلِ معنی کو / نہیں آسان یہ ہے گوندھنا مشکل سہرا

تختِ عظمت پہ بنا بیٹھ بنے کے سر پر ق / باندھے جب ہاتھ سے اپنے شہِ عادل سہرا

دُھوم عالم میں مچے عیش نہ کیوں سہرے کی
کیوں نہ کہویں کہ ہوا عرش سے نازل سہرا

۱۔ یہ سہرا صرف بنیادی نسخے میں ہے۔ ک میں صرف دو اشعار ملتے ہیں۔ ترتیب میں ردیف "الف" میں شامل تھا۔ لیکن میں نے اسے غزلیات کے بعد جگہ دی ہے۔

تضمین

چھپ کے جو شعبدے کرتا ہے تو اے شعبدہ باز! اور سمجھتا ہے کہ کھلتا نہیں میرا انداز
یہ غلط فہمی ہے سب تیری بس اے مایۂ ناز! مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رندان خبرے نیست کہ نیست

چھوڑتا حسینوں کی صحبت کیونکہ ہے گی یہ مضاد عیشِ دیوانہ ہے تجھ کو کیا نہیں یہ قول یاد
اس سے پہلے کہہ گیا ہے جو وہ صائبِ اوستاد صحبتِ ناجنس گر جاں بخشدت زنہے مباد
آب را دیدی کہ ماہی را بدام افگند و رفت

دولت پر اپنی کرتے ہیں جو نخوتیں نعیم اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں جو ان کے ہیں ندیم
سعدی نے ان کے حق میں کہا یہ بذال و میم گر بے ہنر بمال کند فخر بر حکیم
کونِ خرش شمار اگر گاوِ عنبر است

سب آنسو مرے پوچھتے ہیں گے مِل مِل سمجھتے نہیں آہ وہ ہے سخت مشکل
سنے کون کس سے کہوں؟ دل ہے گھائل سرشک از زخم پاک کردن چہ حاصل
علاج بکن کز دلم خوں نیاید

بخیل کہوے جو کوئی اُسے زرُوئے حسد وہ آپ ہووے گا صد لعن و طعن کا مورد
چھپا نہیں یہ ہر اک جانتا ہے نیک و بد غنی اگرچہ فقیر است ہمتے دارد
فشاندہ است بکونین بست خالی را

رُباعیات

اے ربِّ کریم! تجھ سوا کس سے کہوں — جُز تیرے ہے کون، یہ بتا کس سے کہوں
تیرا ہوں، تجھی سے مانگتا ہوں ہر دم — دے تو ہی مجھے میرے خدا! کس سے کہوں

اے سرورِ کائنات! تیرے صدقے — ہوں کیوں نہ دن اور رات تیرے صدقے
درگاہِ خدا سے تو ہی کروا دے درست — سب میرے معاملات، تیرے صدقے

قطعہ[1]

جنابِ غوثِ اعظم حضرتِ محبوبِ سبحانی! — تمھارا اسمِ اقدس ہے محی الدین جیلانی
غلامِ بے بضاعت عیشؔ موروثی تمھارا ہے — نظر فرما تو اس کے حال پر اے قطبِ ربّانی!

سلطانِ نظام الدّین شہِ عالی جاہ — بقولِ رسولِ پاک و محبوبِ الٰہ
پھرتا نہیں محروم ترے دَر سے کوئی — بے شک مقبولِ حق ہے تیری درگاہ

مستزاد[2]

در پر ترے محبوب کے آیا ہوں میں، اے بارِ الٰہ! — کر اس کے تصدق سے تو مجھ پر یارب، رحمت کی نگاہ
بے شک ہے یہ جائے مستجاب الدعوات، یہ عرض ہے میری[3] — بر لا تو مطالب مرے، اے ربِّ کریم، سب خاطر خواہ

۱۔ لفظ ”قطعہ“ صرف کراچی کے نسخے میں درج ہے۔

۲۔ لفظ ”مستزاد“ ک میں درج ہے۔

۳۔ ک: ہے یہی میری غرض

تو حال پہ میرے کر توجہ، یا پیر!
رہتا ہوں میں فکر سے نہایت دلگیر
کر حق میں دعا میرے کہ ہوں میں لاچار
بَن آتی نہیں ہے مجھ سے کوئی تدبیر

اللہ نے دیا ہے تجھ کو وہ رتبہ و جاہ
آتا ہے ترے در پہ ہر ایک حاجت خواہ
کر عیش کے حق میں بھی دعا ازرہِ لطف
اے طوطیِ بوستانِ[1] محبوبِ الٰہ

گر دل کو رہی یہ بے قراری یوں ہی
اور شمع صفت یہ آہ و زاری یوں ہی
جُز سوز و گداز کچھ نہ ہو گا حاصل
گزرے گی یہ عیشؔ عمر ساری یوں ہی

کی جس سے وفا، وہ بے وفا ہی نکلا
سمجھے جسے نیک، وہ بُرا ہی نکلا
ہو شکوۂ غیر کیا، یہاں تو اپنا
یہ بخت بھی آہ، نارسا ہی نکلا

قطعہ[2]

زمانہ طفلی کا غفلت میں وہ خراب رہا
ہوا جوان تو دن رات مستِ خواب رہا
یہ دور زمانے تو غفلت میں اس طرح گزرے[3]
رہا بڑھاپا سو صرفِ غمِ شباب رہا

آنکھوں نے نہ دیکھی کج ادائی ایسی
کانوں نے سُنی نہ بے وفائی ایسی
کیا ظلم کیا، بتوں سے منہ پھیر لیا
کس کام کی عیشؔ! پارسائی ایسی

یارانِ جہاں کے رنگ ہم جانتے ہیں
ڈھنگ ان کے ہم ایک ایک پہچانتے ہیں
اللہ رے ہاتھ پر جمائی سرسوں
کیا کہنا ہے واہ واہ جی مانتے ہیں

۱۔ ک: بستانِ محبوبِ الٰہ
۲۔ ک: میں درج ہے
۳۔ ک: عیش یوں گزرے

دل میں نہ ہو اپنے تُو مکدّر اے شاہ!
ہے دونوں جہاں میں ترا حامی اللہ
یہ عیش کی بھی عرض شہا یاد رہے
سرسبز کبھی نہ ہوگا تیرا بدخواہ

جو عیش عدو کوئی ظفر کا ہوگا
دشمن جو ایسے نامور کا ہوگا!
اس پر تو نہ ہے سایۂ خداوندِ جہاں
واللہ وہ دشمن اپنے سر کا ہوگا

عیش اپنے عہود تم نہ توڑو سوچو
عہدوں سے تم اپنے منھ نہ موڑو سوچو
بدعہد تمھی جہاں میں ہوگے مشہور
یہ بات بری ہے اس کو چھوڑو سوچو

باتوں میں جو باغ سبز دکھلاتے ہیں
اس عہد میں ہاں وہ ہی تو پھل پاتے ہیں
ہیں راست سرشت جو کہ اس گلشن میں
وہ سرو کی طرح بے ثمر جاتے ہیں

پہچانتا آدمی کا آسان نہیں
انسان کی یہاں کسی کو پہچان نہیں
اب زعم میں اپنے سب یہی جانتے ہیں
جو چرب زباں نہیں وہ انسان نہیں

ٹیڑھی ہے فلک کی چال کس سے کہیے
سنتا نہیں کوئی حال کس سے کہیے
درویش کا قہر ہے بجانِ درویش
یہ حالِ پُر اختلال کس سے کہیے

کل بزم میں بھر کے ایک پیالی مے کی
کرنے لگی یہ صفت گلابی مے کی!
اس دور میں سب کے دعوے جھوٹے ہیں سنا
ثابت ہے فقط نمک حلالی مے کی

۱۔ بہادر شاہ ظفر سے خطاب ہے
۲۔ ک : وہی

رکتا نہیں تیر جو کماں سے نکلا
اور نالہ، دل بھی جو وہاں سے نکلا
یہ تو نہ رکیں، رکے تو سبحان اللہ
وہ حکم کہ جو تیری زباں سے نکلا

الفت میں بتوں کی اپنی جان پر کھیلے
جو رنج و ستم نہ جھیلے تھے، جھیلے
گر پیٹنا اک دن کا ہو، تو پیٹیں
عاشق ہوئے جیتے ہی پاپڑ بیلے

جلوہ گر سب میں اُسی کا نور ہی ہے
ہر طرف جلوۂ ظہور ہی ہے!
آنکھ ہووے تو دیکھ اے اندھے!
جون سا کوہ ہے، وہ طور ہی ہے!

سچ کہنے کی عیش، بسکہ خو ہے اپنی
رہتی یہی دل سے گفتگو ہے اپنی
ہوتا ہے وہی جو کچھ کہ وہ چاہتا ہے
جو اُس کی خوشی سو آرزو ہے اپنی

گہ صلح ہوئی یار سے اور گاہے جنگ
خوش دل رہے گاہ اور گاہے دل تنگ
القصہ عدم سے لا کے ہم کو اس جا
کیا کیا فلکِ پیر نے دکھلائے رنگ

اے نفسِ شریر بیہودہ دستی کب تک
یہ ہووے گی نری یہ خود پرستی کب تک
جس روز ترے نشے ہرن ہو دیں گے
معلوم کرے گا جوشِ مستی کب تک

بد ذات بدی سے اپنی کب چوکتے ہیں
پابند وہ کیونکہ اپنی خو کے ہیں
اللہ نے کیا ہے جس کو آزاد مزاج
وہ اُن کی طرف کو عیش کب تھوکتے ہیں

الفت میں بتوں کی رنج کھائے کیا کیا
دل دے کے اُنھیں مزے اُٹھائے کیا کیا
القصہ نہ پوچھیے شبِ فرقت میں
معشوقوں نے ہم کو دن دکھلائے کیا کیا

۱۔ اپنی ہی

اے عیش جہاں میں آکے سب کو دیکھا | دیکھا جسے تکتے اپنے ڈھب کو دیکھا
دیکھا نہ کسی کو ہم نے اپنا افسوس | دیکھا تو بس ایک اپنے رب کو دیکھا

قطعہ[1]

دیکھ کر ان کی دورنگی دل ہے سینے میں خموش | اس منافق پیشگی سے اپنے بس اڑتے ہیں ہوش
لاکھ کی یہ ایک ہے اُن سے نہ مل تو عیش ؔ کیوں | ہیں یہ ابنائے جہاں گندم نما و جو فروش

جوں برق ایک عمر بے قراری میں کٹی | جوں شمع ایک عمر آہ و زاری میں کٹی
القصّہ رہے ہیں یہی جھگڑے در پیش | باقی جو رہی سو شرمساری میں کٹی

گر حکم دوں آہِ ناتواں کو اپنی | پڑ جائے زمین و آسماں کو اپنی
بس یوں ہے یقیں کچھ نہیں اس میں خلاف | تاثیر ہے عیشؔ یہ زباں کو اپنی

۱۔ ک: میں قطعہ درج ہے "س" میں رباعی

قطعات تاریخ

تاریخِ وفاتِ میر ممنون صاحب

جگت اُستاد تھا فخر الشعرا — اُس نے فرمائی یہاں سے رحلت
جو سخن سنج تھے عالم میں، اُنھیں — ناگوارا ہوئی اُس کی فُرقت
تھے خصوصاً جو احبا اُس کے — اُن کے دل پر ہوئی غم کی شدّت
عیشؔ بھی رکھتا تھا از بسکہ کمال — اُن سے اخلاص و محبت، اُلفت
فکرِ تاریخ میں اُس نے جو ذرا — عالمِ غیب سے چاہی ہمت
تو سرِ لحد سے ہاتف نے کہا — "میر ممنون علیہ الرحمت"

(۳۰+ ۱۲۳۰ = ۱۲۶۰ھ)

تاریخِ وفاتِ مرزا رنگین بیگ

اے عیشؔ ز روحِ مرزا رنگیں بیگ — سائل چو ز سالِ عمر فرسودہ شُد
تاریخِ وفاتِ خویش مرزا مرحوم — خود گفت "بزیرِ خاک آسودہ شدم"

(۱۲۶۰ھ)

ایضاً

ز رنگیں گیر باد نونِ اوّل — شمارِ اعدادِ آں ہر حرف ضم کن
شوی فارغ چو از تسطرش، اے یار! — ازاں پس حصۂ سی ام رقم کن
چو زاں ہم خاطرِ تو جمع گردد — ازاں ہم بے تامل نصف کم کن

(۱۲۶۰ھ)

تاریخِ قتلِ فریزر صاحب

ہاتفِ غیب ز پیرِ خرد گفت کہ شد — از سرِ کینۂ "فریزر ہدفِ تیرِ اجل"

(۲۰+ ۱۲۳۰ = ۱۲۵۰ھ)

تاریخِ وفاتِ منشی عاشق علی خان

ے کے مر جانے کا دل پر داغ ہے — "داغ ہے دل پر یہی" تاریخ ہے
(۱۲۵۶ھ)

تاریخِ فوت شدن راگ رس خان

ز گفت تاریخِ سالش بگو — گذشت از جہاں راگ رس خاں بدق

تاریخِ وفاتِ مرزا رنگین بیگ

ج تھا تاریخِ رنگیں بیگ کا — اس میں تو ہاتف اُٹھا یوں چیخ ہے
ں تردد ہے تجھے، مرنا اسے — "خواب راحت ہوگیا" تاریخ ہے
(۱۲۶۰ء)

تاریخِ وفاتِ مرزا ولیعہد بہادر

جو عالم میں ولی عہدِ زماں — اُن کے مرنے کا ہوا ماتم سخت
نے پوچھا جو سالِ تاریخ — کہا ہاتف نے "سوئے دارا بخت"
(۱۲۸۴ھ)

تاریخِ وفاتِ نواب میر محمد خان

ستد میر خاں کہ صوفیاں بود — چو رحلت کرد زیں دار آں ستودہ
تاریخِ سالش عیش در فکر — زبانِ دل سوے ہاتف کشودہ
ورد آہ و ہاتف گفت برخواں — وداعِ جاں بذکرِ حق نمودہ

ایضاً

وفیِ با صفا محمد میر — کرد زیں جا چو رحلت از تقدیر
ش فرمود سالِ تاریخش — ہست پیدا میانِ دو تکبیر

تاریخ مہاراجہ ہندو راؤ

ے جب مہاراجہ ہندو راؤ — تو مغموم سارے حواشی ہوئے

اور احباب بھی ان کے غمناک سب ۔۔۔ یہ دلّی سے بے تابہ کاشی ہوئے

اسی غم میں جب سالِ تاریخ کی[۱] ۔۔۔ تہِ دل سے ہم بھی تلاشی ہوئے

تو ہاتف سرِ رہ بولا کر عیش ۔۔۔ ”مہاراج بیکنٹھ باشی ہوئے“

(۲۰۰ + ۔۔۔ (۱۲۷۱ = ۱۰۷۱

تاریخِ وفاتِ خاقانیِ ہند محمد ابراہیم ذوق سنہ ۱۲۷۱ھ

بفانوسِ تن روحِ ذوقِ سخن ور ۔۔۔ چو خاموش شد شمع ساں از تکاسل

زِ پروانہ ہائے دلِ اہلِ عالم ۔۔۔ شدہ بر فلک نالہ ہا ہمچو بلبل

گریبانِ گُل چاک شد، در مزاقش ۔۔۔ پریشاں شدہ از غمش زلفِ سنبل

بگوشِ دلم چوں خبر از و نالش ۔۔۔ رسایند بادِ صبا بے تامل

سوئے ہاتفِ غیب کردم روانہ ۔۔۔ پے سالِ تاریخ پیکِ تخیل

بگفت از سرِ دردِ ہاتف کہ گشتہ ۔۔۔ زِ بادِ اجل شمعِ بزمِ سخن گُل

(تم + ۔۔۔ (۱۲۷۱ = ۱۲۶۷

تاریخِ وفاتِ سید ثناء اللہ صاحب

چو سید ثناء اللہ مردِ بزرگ ۔۔۔ زِ تقدیرِ خلّاقِ اکبر بمُرد

چہ گویم ازیں صدمۂ جاں گزا ۔۔۔ دلِ دوستاں پنجۂ غم فشرد

کمالاتِ آں مردِ صاحب کمال ۔۔۔ بجز ریگِ صحرا نباید شمرد

شدہ عیش را فکرِ تاریخ سال ۔۔۔ پئے آں التجا سوے ہاتف ببرد

برآورد دودِ زِ جان و بگفت

”بجاں آفریں ہم جانِ شیریں سپرد“

(۱۲۷۳ = ۱۴ - ۱۲۸۷)

۱۔ ک : گی.

پہیلی ہاے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نورِ بصر

ب پورکہہ وہ سب کو دیکھے (۱) اندھے ہیں وا سب کے پیکھے
ت پردوں کے اندر رہے   سب کچھ آنکھیں دیکھی کہے

پرچھائیں

ایک ناری کا میلو رنگ (۲) لگی رہے وہ پیؑ کے سنگ
اُجیارے میں سنگ براجے   اندھیارے میں چھوڑ کے بھاجے

شمع

ے نارنس ایسی دیکھی گور وچتر انگ (۳) ایسی تولی سے لگی کہ بہ گیو سارو انگ

شمع

میں نے اک بڑھیا دیکھی پیٹ میں واکے ڈور (۴) دوجا چرج اور سنو کہ بغل میں رکھے چور
را جبنھا تیہے یہ ہے سیس پہ رکھے آگ   ایک پاؤں سے کھڑی رہے یہ اور سنو بیر آگ

شمع

اک ناری کے سر پر نار (۵) پی کی لگن میں کھڑی ناچار
سیس دُھنے اور چلے نہ زور   رو رو کر وہ کرے ہے بھور

۱۔ ک : پیا   ۲۔ ک : لگے
۳۔ ک : بھان متی

شمع

اک ناری نت سیس کٹاوے (۶) آگ برہ کی واکو کھاوے
مجلس میں وہ آوے شب کو اندیکھا دکھلاوے سب کو

شمع

دُبری پتری کامنی اور چکنی چپری گات (۷) ینہہ میں اپنے پیو کے[1] رووے ساری رات

چراغ

لال مُکٹ سر پر[2] منھ کالا (۸) ہے رہ اندھیرے گھر کا اُجالا

ستار

دو ناری اور ایک نر جب تینوں مل جائیں (۹) رنگ برنگی صورتیں پردوں میں دکھلائیں

ستار

اک گنبد اور اس پر لاٹھ (۱۰) سب سے اُس کا نرالا ٹھاٹھ
اس پر چڑھیں اک نر دو ناری مزے کریں وہ دے دے تاری
بن چھیڑے وہ کبھو نہ بولیں آنکھوں والے انھیں ٹٹولیں
چترا کے وہ جی کو بھاوے مورک کا وہ جنم گنواوے

چھتۂ مگس

اک مندر کے سہنسر در (۱۱) ہر در میں تریا کا گھر
بیچ میں اُس کی امرت تال بوجھ ہے اُس کی بڑی محال

آفتاب

ننگے سر وہ گھر سے آوے (۱۲) جٹا کھول جگ کو دکھلاوے
جب وہ آوے سوتا جاگے سیام برن دیکھ اس کو بھاگے

۱۔ ک: کو

۲۔ ک: کے

زبان

ایک ناری گھر بیٹھی اور اُس کو کہیں پیا چلتی ہے (۱۳) کبھی وہ امرت ہے برساتی کبھی وہ زہر اُگلتی ہے

شراب

ایک نار سے ناری بھئی سو مدماتی نار (۱۴) جو اس سے نیہا دھرے دیوے بدھ بسار

لٹو

لمبی گردن پیٹ گول اور نیچی چونچ سانپ ہے (۱۵) کس سے کہوں میں اے ری سکھی موئے ایسی اچرج آئی ہے
باندھ کر جب واکو کھینچے بھوراگو نج سنائے ہے ہاتھ لگے وہ جس کے دیکھو کیا کیا ناچ نچائے ہے

نگینہ انگشتری

اک ناری کے الٹے نر (۱۶) خالی پیٹ بیٹھے ہیں گھر
ٹھوک لگا جب اُنھیں اٹھائیں سب الٹے سیدھے ہو جائیں

شمشیر

اک ناری پانی کی باسی (۱۷) تس پر سب کی خون کی پیاسی

خاک[۲]

ایک پُرکھ وہ جس دم چلے (۱۸) پیٹ سے اُس کے بچا کرے
لوگوا چرج آوے ایسے پُرکھ بچا دیت ہیں کیسے

دندان

اوپر نیچے جا نچ نے ہیں موتی بتیس (۱۹) لعل کی ڈبیا میں دھرے تو ناحک دانت نہ پیس

بلبل

اک پنچھی نے لیا بسیرا[۱] ان درکھت پر سام (۲۰) دو کانٹوں کو جمع کرو جب واکا[۳] پوچھو نام

حجام

بیٹھے بیٹھے بات بنائی (۲۰) ایسا پورک وہ کون ہے بھائی
بوڑھا بالا جو کوئی آئے واکے آگے سیس نوائے

۱۔ ک: بھئے ۲۔ ک: چاک ۳۔ ک: واکو

سیپ

اک تریا ہے جل کی باسی (۲۱) تس دن جل میں رہے پیاسی
جب اُس کے مکھ میں پڑے ہے بوند ڈبکی کھیے منھ کو موند

آسمان

ایک تھال موتیوں سوں بھرا (۲۲) سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے موتی اُن سے ایک نہ گرے

آفتاب

اک ناری اک نر ہے جس پر دونوں نر کہلاتے ہیں (۲۳) تمھیں میں بتلادوں گا دیکھو سانجھ سکالے آتے ہیں
شیلا تتا ایک ہے اُن کا اتنا ہم بتلاتے ہیں برے چلن سے اُن کے ہاں سب کے سب جکڑاتے ہیں

آتش

سندر نار ایک ایسی دیکھی انگ بھبوت رمائے (۲۴) گھانس پھوس اور لکڑ مونگرہ بن وابن سب کھائے
ہنسی سے بھی جو اُس کو چھیڑے پاچھے بہت پچھتائے جوں جوں واسے بیت کریں وہ توں توں اور جلائے

گلی ڈنڈا

اک تریا کا کھیل نرالا (۲۵) طرہ موتی تس پر دوشالہ
ہار گئے سب پی کے کارن ہے وہ دیکھو بڑی جوارن

چلم حقہ

ایک تریا کل ہم نے دیکھی چھاتی پر گل کھائے (۲۶) آگ برہ کی چین چھپر اُٹھت شوبی پر چڑھ جائے

بینی

چتر نار اک ایسی دیکھی ہر دم پون چرائے ہے (۲۷) دم دم دل کو چین ہے اُس سے جان میں جان سی آئے ہے
پاس پتال کے بیٹی ہر دم بو سنگھی کہلائے ہے جو کوئی اس سے نہ کرے وہ ناک چنے چبوائے ہے

۱۔ ک : رہے

۲۔ ک : ناس کے پیالے پیے ہر دم

مستی

ناری میں ناری بسی بھورو وا کو رنگ (۲۸) جب وہ پی کے منہ لگی تو ہو گیو کارو رنگ

مستی

بھوری سی ایک دیکھی نار (۲۹) تھوک لگے پر دیت بہار

خال چاند[1]

گول گات کارو بدن جیرا لیت بھائے (۳۰) رین و تا تل نل ٹھہرے پی کے انگ سہائے
جو دیکھے ماموں کہے اُس کا یہ سمجھاؤ عربی ہندی فارسی سمجھ بوجھ بتلاؤ

سوزن

دبری پتری کامنی چلی سیس کے بل (۳۱) چیترا کے سینے لگی ہم نے دیکھی کل

دست پناہ

ایک پور کھ کو[2] کالو رنگ (۳۲) گول سیس دو لینے ٹنگ
نار کو آے لیت اٹھائے[3] پیار کرے اور چمٹا جائے

قمری

اک ناری نت رہوے جوگن (۳۳) پی کے کارن بھئی برہ گن!
رہوے انگ بھبھوت رمائے جھک جھک پی کو کوک سنائے
عربی ہندی کر ایک ٹھاؤں اُٹھڑ ری سکھی کہہ اُس کا ناؤں

پنکھا

بانس بریلی سے اک ناری (۳۴) آئی اپنی بند کشاری
پی کچھ اُس کے کان میں پھونکے بولی وہ سن پی کے مو کے
آؤ پیا یہ کیسی کینی! آگ برہ کی بھڑکا دینی

۱۔ ک: خالی (چاند) درج ہے ۲۔ ک: کا
۳۔ ک: نار کو آئے لیٹ

سلائی[۱]

دُبری پتری کامنی منھ کا رد کر آئے (۳۵) جو دیکھے سوائے سکھی اُس سے آنکھ لگائے

تیر و کمان

کبڑی سی اک بڑھیا دیکھی کاندھے پر دو چھاج ہے (۳۶) نر رکھے ہے اپنا جواں، وہ پہلوانا کی ساجے ہے
اس کے نر کے سر پر دیکھو پنچھی کان براجے ہے   نیچے اُس کے آدھا پستو سارا چوما باجے ہے

بٹوہ

واہ پورک جو ہاتھ لگے تم اُس سے اور نہ بولو (۳۷) ہاتھ پکڑ کے بند کرو، اور کان پکڑ کے کھولو

تخت و چوکی

اچھا نیکا خوب بنایا (۳۸) چار کھونٹ میں وا کو پایا
جب اُلٹو جب وہ کا وہ ہی   جان ہی میری اُس نے موہی
پاؤں چار اور چل نہیں سکتا   رہے گیا میں وا کو تکتا
چھٹ پن میں ناری کہلاوے   بڑے ہوئے پر نر ہو جاوے

قبلہ نما

سُولی چڑھ تڑپ کرے جائے نہ مونکو موڑ (۳۹) سیس محل میں قید ہوئے پر دیکھے ایک ہی اور

حنا

ایک پنچھی کو سو ہو رنگ (۴۰) ملا رہے تریا کے سنگ
چتر نار جب وا کو پکڑے   پھیلے ہاتھ اور پانو جکڑے[۳]
پیچھے[۲] وا کو یوں چھین   تریا ماری پھرے ادھین

گنڈیری نیشکر

کھال کھینچی، بند بند کٹو پیا ملن کی آس (۴۱) رس لے کر پی تج دیو جائے نہ ہو کو ناس

۱۔ ک : سبائی   ۲۔ ک : نیچے
۳۔ ک : پکڑے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخمّس

سیہ کاریم و تیرہ روزگارم — ز بدافعالیِ خود شرمسارم
بدرگاہت مُدام ایں عرض دارم — الٰہیٰ واقفی از حالِ زارم
تو می دانی کہ جُز توکس ندارم

ئے و مہوش جو ہیں اسبابِ غفلت — کھُلا ان کے سبب سے بابِ غفلت
سو میں بھی کھا کے پیچ و تابِ غفلت — الٰہیٰ رفتہ ام درخوابِ غفلت
بدہ بیداری زایں کار و بارم

جہاں میں جو کہ ہیں ہشیار یا مست — ضعیف و ناتواں ہیں، یا زبردست
عدم کی رہ میں ہمت سب کی ہے پست — الٰہیٰ راہِ مردن سخت راہیت[1]
تو آساں بگزراں زیں رہ گزارم

دکھایا ہاں تو نے مجھ کو بہجت افروز — پہ ہے یہ تیر اندیشہ جگر دوز
سو یہ اس واسطے ہے عرض ہر روز — الٰہیٰ چوں عزیزم کرد امروز
مکن فردا بہ نزدِ خلق خوارم

مری دن رات ہے گی آرزو یہ — دُعا کرتا ہوں یوں اے کہ و مہ
چلے جب روح میری چھوڑ یہ دیہہ — الٰہیٰ بریکے گفتن تواں دہ
کہ تا من جاں بآسانی سپارم

۱۔ ک : راہ است

میں تیرا ہوں تو ہے[1] سب پر زبردست
ترے قبضے میں ہیں سب نیست وہست
کہاں جاؤں، کہوں کس سے، میں بدمست
الٰہی نفس وشیطاں در کمین است

زتقوائے عنایت کن حصارم

یہ ہے گا دشمنِ جاں نفسِ مرتد
دکھاتا ہے مجھے ہر دم رہِ بد
ہے مجھ سے لاکھ اس کا فرکو اورکد
الٰہی گر نہ توفیقے تو باشد

برآرد نفس از جانِ دیارم

ہے میری اس قدر جرموں کی توفیر
نہیں وہ قابلِ تحریر و تقریر
نہ ہوں کیوں کر میں غرقِ بحرِ تشویر
الٰہی کردہ ام بسیار تقصیر

ازاں خجلت نہایت شرمسارم

ملی مجھ کو نہ جائے امن گا ہے
یہ عاجز کب تلک غم سے نبا ہے
تو ہی رہبر ہے تجھ چھٹ کس سے چاہے
الٰہی برکشا از غیب را ہے

زچندیں سال ومہ در انتظارم

نہیں ہے کوئی ہرگز تیرا ثانی
ہے بس ارض وسما کا تو ہی بانی
سوا اس کے ہے، باقی سب کہانی
الٰہی گر برانی ور بخوانی

تو دانی بندۂ بے اختیارم

کیے تو نے ہی پیدا جنّ وانساں
دیے تو نے ہی ہیں سب اُن کو ساماں
تجھی سے مانگتا ہے یہ پریشاں
الٰہی خاطرم را جمع گرداں !

کہ مسکین و پریشاں روزگارم

بسانِ شمع اے خلاّقِ تقدیر !
ہے دل میں آگ اور آنکھوں سے تقطیر
اثر ان میں نہیں، ہوں اس سے دلگیر
الٰہی از کمالِ لطف بہ پذیر

دلِ سوزان وچشمِ اشکبارم

۱۔ ک : ہی

کریں جب دفن مجھ کو حسبِ دستور　　دعا یہ ہے ہماری تا دمِ صُور
کرم کو اپنے جائے مار اور مور　　الٰہیؔ در شبِ منزل گہِ گور
زلطفِ خویش گرداں غمگسارم

وہ ہی یہ عیشؔ مانگے ہے گنہگار　　کر اُس کو تو قبول اے میرے غفار!
یہی مانگے تھا وہ سر خیلِ ابرار　　الٰہیؔ بر جنید ایماں نگہدار
کہ اینست اصل جاہ واعتبارم

مخمّس غزلِ قدسی

کیا کہوں ذاتِ مقدّس تری ایسی ہے نبی!　　کہ تری شان سے ہر ایک کی شوکت ہے دبی!
انبیا کا ہے یہ وردِ سحر و نیم شبی　　مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی

دیکھ کر حسنِ خدا داد کا تیرے عالم　　نرگس و آئینہ حیران ہیں اللہ کی قسم
یہی مانگے دل اپنا کروں کیا حال رقم　　منِ بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بو العجبی

تجھ کو اللہ نے ایسا ہی کیا ہے پیدا　　کہ نہیں اور جہاں میں ہر گز تجھ سا
ہم تو کیا، چرخ پہ کہتے ہیں فرشتے بخدا　　نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
بر تر از عالم و آدمؔ تو چہ عالی نسبی

عرش سے فرش تلک ایک ترا فیض ہے عام　　ہیں گے گل ابرِ کرم سے ترے شاداب تمام
مہرِ الطاف سے شیریں ترے ہر میوۂ خام　　نخلِ بُستانِ مدینہ ز تو سر سبز مُدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

ک: اپنا اپ کام ہے یہ وردِ بحر و نیم شبی

حکم مانے نہ ترا ایسا ہے کس کا مقدور　　حق نے مبعوث کیا سب پہ تجھے اور مامور
لیک رمز اس کی بیاں کرتے ہیں یوں اہلِ شعور　　ذاتِ پاکِ تو چو در مُلکِ عرب کردہ ظہور
زیں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

گلشنِ نُہ فلک اور باغ تھے جنّت کے جو ہشت　　طرفۃ العین میں تو نے کیا اُن کا گل گشت
تا بہ قوسین سے آگے تجھے موسیٰ کو وہ دشت　　شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت
بمقامیکہ رسیدی، نہ رسد ہیچ نبی

دل میں شرمندہ نہ کیوں کر ہوں میں اے شاہِ اُمم !　　کیوں نہ ہو بارِ خجالت سے مری گردن خم
چھوٹا منھ اور بڑی بات، کیا میں نے ستم　　نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوے تو شُد بے ادبی

ہوگا خورشید سوا نیزے پہ جس دن ہیہات　　بھیڑ بھاڑ ی ہوگی بندھی مُنھ سے نہیں نکلے گی بات
عرض سب باندھ کریں گے یہ تری جانب ہات　　ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

ہے تری ذاتِ مقدّس سے رسولِ عربی !　　التجا یہ ترے قربان ہوئے اُمّی و اَبی
عیشِ دلِ خستہ پہ بھی کر نظرِ لطف، نبی　　سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوے تو قدسیؔ پئے درماں طلبی

قصیدہ در نعت آں حضرت صلعم

(۱)

یا شفیعِ روزِ محشر! یا شفیع المذنبیں!   یا انیسِ عاصیاں! یا عذر خواہِ مجرمیں!

کون ہے وہ جو نہیں ممنونِ احساں کا ترے   عرشِ ربّ العالمیں سے لے کے تا زیرِ زمیں

ہو سکے تعریف تیری کس سے؟ یا خیر البشر!   ہے تو شاہِ دو جہاں، محبوبِ ربّ العالمیں

ہے جنابِ پاک وہ تیری کہ گردانا تجھے   حق تعالیٰ نے رسول اور مہبطِ روح الامیں

جو سیہ بخت آ ملے در پر ترے روئے نیاز   وہ ہیں ہو جاوے تصدق سے ترے زہرہ جبیں

نور سے تیرے ہی روشن ہے یہ ساری کائنات   خرمنِ الطاف کے تیرے ہی ہیں سب خوشہ چیں

حق تعالیٰ نے کیا ہے یا رسول اللہ تجھے   سرمۂ مازاغ تیرا زیبِ چشمِ نرگسیں

سورۂ والشّمس تعریفِ رخِ عالی میں ہے   سورۂ واللّیل ہے تعریفِ زلفِ عنبریں

سورۂ یٰسین وطٰہٰ خلعتِ عالی ترا   اور الم نشرح ہے تیرا زینتِ تاجِ نگیں

باعثِ ایجادِ عالم، موجبِ کون و مکاں   اے شہِ لولاک! تو ہی تو سبب ہے ہر کہیں

ہو کلام اللہ جب وصفِ سراپا میں ترے   کر سکے پھر نعت کیا تیری زبانِ واصفیں

ہے خدا نے ذات کو تیری کیا عقدہ کشا   تجھ سوا کس پاس جاوں عرض کو یا شاہِ دیں!

دستگیرِ عاصیاں روزِ جزا پیشِ خدا   بس تری ذاتِ مقدّس کے سوا کوئی نہیں

سخت میں لاچار ہوں، میری مدد کر، یا رسول!   رات دن رہتے ہیں میرے نفس و شیطاں در کمیں

ہوں عنایت سے تری امیدوارِ مکرمت   رد نہیں ہرگز ترے در سے سوالِ سائلیں

جس نے جو چاہا ملا تیری جنابِ پاک سے / صفحۂ دیواں سے تیرے محو ہے نام نہیں
یہ دعا فرمائیے محبت حق کی ہو میرے لیے / نور افزائے دل و رونق دہِ جانِ حزیں
بہرِ روحِ اقدسِ صدّیق اکبرؓ یا رسول! / بہرِ روحِ پاکِ فاروقؓ امام العادلیں
واسطے عثمانِ ذو النّورین کےؓ یا مصطفٰے! / لطف سے آراستہ فرما مری دنیا و دیں
مشکلیں آسان کروا دے مری اللہ سے / یا رسول مجتبیٰؐ بہر امیر المومنیں
بہرِ روحِ حضرتِ شبیر و شبرؓ یا رسول! / دل کو روشن کر مرے، کر دور اس سے بغض و کیں
بہرِ روحِ اطہرِ خیر النساءؓ دل کا مرے / کر دے کاشانہ منوّر اے شہِ با حق قریں
عیشؔ گو عاصی ہے پر رکھتا ہے امیدِ کرم / تیری ذاتِ پاک سے اے شاہِ ختم المرسلیں
عرض کرتا ہے جنابِ اقدس و عالی میں یہ / دست بستہ یا رسول اللہ تیرا کمتریں

گرچہ من ناکارہ ام از لطف خود سویم بہ بیں
یا شفیع المذنبیںؐ یا رحمۃؐ للعالمیں!

یا فتّاح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قصیدہ

(۲)

نسیمِ صبح ہوئی آج یہ نوید رسا / کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسا
جلوسِ شاہدِ گل کے لیے بچھایا ہے / صبا نے باغ میں فرشِ زمرّدی ہر جا
یہ کہہ رہے ہیں جوانانِ بادہ نوشِ چمن / کہ اے بہار کے ساقی! چل اٹھ نہ دیر لگا
جھکا صراحیِ غنچہ کو ساغرِ گل میں[1] / شرابِ روح فزا اس میں بھر کے ہم کو پلا
اس آب و تاب کی ہر شاخِ گل میں ہے سبزی / کہ جس کے آگے زمرّد کا رنگ ہو پھیکا
ہوا نے خاک پہ صیقل کیا ہے یہ کہ اگر / صفائی آئینہ دیکھے تو لیوے منھ کو چھپا
صبا نے کی پرِ طاؤس پر یہ گل کاری / یہ زور و شور پہ ہے کچھ بہار کا جلوا

۱۔ ل : گل کے ساغر میں

چراغ سے بھی پڑے دیکھو پھول جھڑتے ہیں
کہیں جو بادِ بہاری کا لگ گیا جھوکا

طلسم بادِ بہاری یہاں تلک ہے کہ بس
ہوا ہے شمع کے شعلے سے گُل نیا پیدا

نسیمِ صبح کی عیسیٰ دمی یہ دیکھو تو
جہاں میں بلبلِ تصویر تک ہوئی گویا

عجب طرح کا سرور و نشاط باغ میں ہے
رہ جاتا نہیں وہاں کوئی بس خوشی کے سوا

کہیں ہیں سرو پہ کرتی یہ قمریاں کوکو
گلوں پہ مست کہیں بلبلیں ہیں نغمہ سرا

چمن میں میر توزک بہر اہتمامِ بہار
ہوا ہے سبز چھڑی لے کے ہاتھ میں لالا

یہ انتظام کیا ہے کہ بس ہر ایک درخت
مؤدّب اپنے قرینے سے ہے چمن میں کھڑا

ہوا ہے تختِ چمن پر جلوسِ شاہدِ گل
چمن میں چاروں طرف چہچہا ہے بلبل کا

ہوا ہے فیض ہوا سے یہ جوشِ نشو و نما
کہ تن کے نکلے ہے پتھر سے خود بخود شیشا

کچھ اب کے سال ہی اعجاز ہے ہوائیں کہ بس
ہوا ہی جاتا ہے ہاتھوں میں سبز رنگِ حنا

بہے ہے ہر ورقِ گل سے بل بے جوشِ بہار
چمن کے صحن میں ہر سُو گلاب کا دریا

وفورِ نکہتِ گل یہ رطوبت افزا ہے
کہ عندلیب کو گلشن میں ہو گیا نزلا

اثر بہار کا پہنچا ہے دیکھو نطفہ تک
کہ سبزہ رنگ ہی ہوتے ہیں یکقلم پیدا

ٹپک رہا ہے پڑا شہدِ ناب حنظل سے
ہوا کے فیض نے سَم کو بھی کر دیا میٹھا

یہ زور شور ہے بالیدگی کا کیا کہیے
جہاں میں کبھی دیکھا گیا تھا جو، نہ سنا

کہ لاکھ بار اولینڈو شراب ساغر میں
رہے ہے شیشۂ مے پھر وہیں بھرے کا بھرا

جہاں میں یہ تر و تازگی کا عالم ہے
کہ ہو گیا ہے ہر اک زخمِ خشک تک بھی ہرا

یہ تازگی[۲] ہے کہ بلبل کی چونچ سرخ ہوئی
لیا جو اس نے تصور میں پھول کا بوسا

خواص آگ کو ہے یہ ملا کہ بھڑک[۳] جائے
جو ڈالو اس میں جلانے کے واسطے لوہا

جبینِ ناز پہ قشقہ نہیں یہ کافر کے
نیا مقدرِ عشاق سے ہے پھول کھلا

مژہ پہ قطرۂ خونِ عاشقوں کے مت سمجھو
یہ آبنوس کی ہے شاخ سے اُگا مونگا

---

۱ - ل : انتظار

۲ - ک : تازگی [illegible]

۳ - ک : [illegible]

نظر بھی ہووے کسی کو تو یہ ہی کہتے ہیں
کہ اس کو سبز پری کا ہے ہوگیا سایا

شکوہ فوجِ بہاری یہ ہے کہ گلشن میں
بجائے کوس ہے بس غنچہ ہائے گل کی صدا

یہ حسن کا قول تھا ہوتا ہے انطباعِ صُوَر
خروجِ نور کے قائل ہوئے ہیں وہ حکما

جہاں میں دیکھ کے اس طرح کا یہ جوشِ بہار
میں ہو کے محوِ تماشا چمن میں جا نکلا

وہاں گلوں کا جو دیکھا تو اور ہے عالم[2]
کہ باندھتے ہیں وہ اپنی نئی طرح سے ہوا

لچک رہی ہے اُدھر شاخِ گل نزاکت سے
اکڑ رہا ہے اِدھر پہنے سرو سبز قبا

اکڑ اکڑ کے وہ یہ کہہ رہا ہے گلشن میں
وہ قد کہ جس کو جہاں میں کہیں قدِ رعنا

جہاں میں ہے جو وہ مشہور قامتِ موزوں
کہ جس کو دیکھ کے دے راستی بھی سر کو جھکا

میں وہ ہوں دیتے ہیں تشبیہ اُس کو سب مجھ سے
بتاؤ جھوٹ ہے یا سچ ہے یہ مرا دعوا

اُدھر کو دیکھو تو سنبل کو اور ہی بل ہے[3]
کہے ہے پھولوں سے یہ بات وہ کہ نامِ خدا

وہ زلفِ یار کہ جس میں پھنسیں ہزاروں دل
وہ چینِ زلف کہ عالم کو جس کا ہو سودا

وہ ناگن ایسی کہ بس اک بلا ہے اُس کا پیچ
وہ کافر ایسی کہ زاہد کو دے بھلا کعبا

نہ اُس کا بل ہو مجھے کس طرح بتاؤ تو
یہ جس کا ذکر ہے ہم زلف ہے مری وہ بلا

کہے تھی مستِ مئے ناز یہ چمن میں کھڑی
خماری انکھڑیاں مَل مَل کے نرگسِ شہلا

وہ آنکھ فتنہ گری جس کی اک تغافل میں
تمام شعبدہ بازی فلک کو دیوے بھلا

وہ آنکھ جس کی کہ ادنا سی اک فسوں سازی
ہزار سحر نئے، سامری کو دیوے سکھا

وہ آنکھ جس کی کہ نیم نگاہ کی شوخی
کرے جو برق پہ کوڑا تو دے فلک پہ نچا

اجی سنا مری ہم چشم ہے وہ کافر آنکھ
مے غرور کا کیوں اُس کی مجھ کو ہو نہ نشا

یہ پھول پھول کے کہتا تھا گل نزاکت سے
چمن میں ہو کے مخاطب بہ بلبلِ شیدا

وہ رُخ کہ جس سے ہو خورشیدِ چرخ شرم آگیں
وہ رُخ کہ تاب سے ہو جس کی ماہ شرمندہ

۱۔ ک : پھے

۲۔ ل : وہاں گلوں کو جو دیکھا تو اور عالم ہے

۳۔ ک : ادھر کو دیکھو تو سنبل کو اور ہے بل ہی

وہ رُخ کہ دیکھے سے آنکھوں میں جس کے چین آوے — وہ رُخ کہ ہو دلِ عاشق کا جس سے کام روا
وہ رُخ کہ جس کی طرف بس بغور حیرت سے — نہیں ہے آئینے کو کام دیکھنے کے سوا
سو بس وہ رُخ مرا ہم رنگ ہے سُن اے بلبل! — بھلا نہ کیونکہ بندھے میری اب چمن میں ہوا
غرورِ گُل کا تو احوال یہ سُنا تم نے — اب اس سے آگے سُنو اور طرفہ تر قصّا
کہ کہہ رہا ہے ہر اک برگِ گُل نزاکت سے — جُدا جُدا بہ سرِ شاخِ گُل بصد دعوا
نہ ہووے کیوں مجھے اِس کا غرور میں وہ ہوں — بیان جس سے کروں حال، سب کہیں کہ بجا
وہ لب، کہ لعل ہو بیتاب جس کے دیکھے سے — وہ لعلِ لب، جسے دیکھے سے خوں بہ دل ہو حِنا
سُنا ہو وہ لبِ جاں بخش جس کی اک جنبش — ہزار مردۂ صد سالہ دیوے دم میں جلا
اب آگے کیا کہوں اعجاز میں کہ اجی، وہ لب — کہ دم بخود ہوں جسے دیکھ حضرتِ عیسا
مثال مجھ سے نزاکت میں اُس کو دیتے ہیں — بھلا بتاؤ مجھے[1] اِس کا کیوں نہ ہو غرّا
گلوں کا رنگ تھا یہ اور سنو کہ غنچۂ گل — نہ بولتا تھا مگر دل میں اپنے کہتا تھا
کسی کو حال سے میرے نہیں ہے آگاہی — ابھی کہوں تو کہیں سب کے سب، ہی آمنّا
میں وہ ہوں اس کا بھلا کیوں نہ ہو غرور مجھے — دہانِ یار کی خوبی یہ ہے کہ ہو مجھ سا
غرض کہ دیکھ کے یہ عالمِ غرورِ بہار — مثالِ آئینہ حیرت سے رہ کے بس چپکا
دبیرِ عقل سے میں نے کہا کہ عالم میں — نسیمِ فیض سے کس کی ہوا ہے یہ جلوا
شمیمِ لطف یہ کس کی ہوئی ہے راحت بخش — کہ یوں ہے جوشِ بہار اور اعتدالِ ہوا
نہیں خموشی کی یہ جا، مجھے بتا تو بھی — یہ فیضِ عام ہوا ہے جہان میں کس کا
یہ عرض میری ہوئی گوش زد جب اُس کے تو بس — یہ سُن کے پیرِ خرد نے مجھے جواب دیا
یہ اُس کی ذاتِ مقدّس کا فیض عام ہے بس — کہ جس کے فیض کا ہے آفتاب اِک ذرّا
اِسی انبساطِ خدا داد کا سبب وہ ہے — کہ جس کے ابرِ کرم کا ہے بحر اک قطرا
وہ، وہ ہے جس کی بلندیِ قدر کے آگے — رکھے ہے چرخِ بریں دیکھ حکم تحتِ ثرا

١- ک : ہمیں

وہ، وہ ہے بحرِ عطا و کریم ابنِ کریم — کہ جس کے دست نگر ہیں سکندر و دارا
بیان کیا کروں بس ایک جُود و بخشش میں — وہ، وہ ہے حاتمِ طائی ہے جس کے دَر کا گدا
سنا وہ، وہ ہے کہ بس آگے جس کی رفعت کے — فلک کو دیکھ لے پابوس کو رہے ہے جھُکا
وہ، وہ ہے جس کا کہ بس کیقباد و کیخسرو — ہر ایک غاشیہ بردار ہے ثنا، اُدنا
بیاں کروں میں اگر اُس کی وسعتِ بخشش — تو مثلِ نقطہ ہو سب یہ جہان کا عرصا
تجھے خبر نہیں اے بے خبر، کہ وہ، وہ ہے — خدا نے ذات بنائی ہے جس کی عُقدہ کشا
یہ عہد عہد ہے اُس کا کہ عہد میں جس کے — کھِلا ہوا ہی نکلتا ہے شاخ سے غنچا
وہ، وہ ہے نکہتِ الطاف نے سُنا جس کی — جہاں میں غنچۂ تصویر تک کیا بُویا
وہ کون سایۂ حق، نائبِ رسولِ خدا — سراج الدینِ[1] بہادر شہنشہِ والا
یہ اُس کے جُود سے ہے انبساط عالم میں — اُسی کے ابرِ کرم سے ہیں سب ترو تازا
نسیم فیض سے اُس کی ہی لہلہاتا ہے — جہاں کے باغ میں ہر سمت، ہر طرف سبزا
یہ میں نے سُن کے کہا اُس سے اے دبیرِ خرد! — خدا کے واسطے تدبیر کوئی مجھ کو بتا
کہ اُس جنابِ مقدّس میں، مَیں بھی حاضر ہوں — یہ جس کی ذات سے ہے کامیاب ارض و سما
کہا یہ اُس نے کہ کیوں پوچھتا ہے تو تدبیر — ضرور اُس کی تو بخشش کو کچھ نہیں چلا
وہاں ہے بخششِ عام اُس کی بے سبب سب پر — خصوص تُو تو قدیمی ہے خانہ زاد اُس کا
جو اس پہ بھی ہے تو پابندِ عالمِ اسباب — تو ایک بات بتاؤں تجھے میں، چل اچھا
خدا نے ذات بنائی ہے اُس کی مستغنی — اُسے بس اور کسی شے کی کچھ نہیں پروا
مناسبت ہو طبیعت کو تیری شعر سے گر — تو چند شعرِ دعائیہ کہہ کے تو لے جا
میں عرضِ حال کو اپنے سمجھ کے ترکِ ادب — زباں پر نہیں لایا ہوں رُو برو شاہا
مگر یہ عرض کہ بے اس کے زندگی ہے محال — رُکا ہے اگلے مہینے سے میرا درماہا
خدا ہی جانے کہ یہ کس نے گُل کھلایا ہے — مجھے خبر نہیں، دریافت کر تُو، دادرسا

۱۔ ل : سراج دین

یہ جس کے ہاتھ سے پہنچی ہے میرے دل کو گزند — تری جناب مقدس میں عرض ہو گی جدا
مرے کلام سے ظاہر یہ بد حواسی ہے — کہ پہلے آپ ہی کہا آپ ہی کہہ کے میں چوکا
تو جرم بخش ہے، میری خطا کو بخشے گا — کریم بخشتے ہیں، ہو جو معترف بہ خطا
چل اب دعا کی طرف، بے ادب! زیادہ نہ بک — کہ اس جگہ کے مناسب نہیں تھا یہ جملا
سو چند شعر دعائیہ کہہ کے لایا ہوں — تری جناب مقدس میں اے شہِ والا!
شہا، غریب نوازا، سخنورا، بخدا — خدا سے حق میں ترے رات دن یہی ہے دعا
الٰہی![1] رہوے یہ تا حشر سلطنت قائم — جہان میں رہے سب پر سدا ترا سایا
رہے قدم سے ترے تختِ سلطنت قائم — ہو تیرے فرقِ مبارک سے تاج کو جلوا
یہ جب تلک رہے لیل و نہار دنیا میں — رہے جہان میں جب تک ظہورِ نشو و نما
ترانہ سنج رہے جب تک کہ دورِ شمس و قمر — رہیں زمیں پہ جاری یہ جب تلک دریا
ترانہ سنج رہے جب تک عندلیبِ چمن — شگفتہ ہو بسرِ شاخ جب تلک غنچا
سب انتظام جہاں ہوئے تیرے زیرِ نگیں — رہے جہان میں تیرا ہی سکہ و خطبا

دعائیں عیش کی یہ سب قبول ہوں یارب!
بحقِ سورۂ یٰسین و سورۂ طٰہٰ

قصیدۂ تہنیت در جشنِ محمد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ بہادر غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

(۳)

ہلالِ عید کو ہوتا کبھی نہ شرفِ کمال — رکاب سے تری دیتے اگر نہ اس کو مثال
اسی سے خلق میں ہے احترام اس کا شہا — کہ آئے ہے ترے پابوس کے لیے ہر سال
نہ دیکھتا کبھی کوئی آنکھ بھر کے اس کی طرف — نہ جانتا ترے ابرو کا گر اسے تمثال
اسی سے پایا ہے عالم میں اس نے شرفِ قبول — اسی سے کہتے ہیں اس کو کہ عید کا ہے ہلال

۱۔ ل: رہوے

جو یہ سمجھ کے اُسے دیکھیں ہے غلط فہمی ‏ — بیاں کروں جو کرے کوئی اس میں استدلال

شہنشہا ترے ابرو کلیدِ قدرت ہیں ‏ — ہلال اُس کو سمجھنا تو عقل کا ہے زوال

ہلالِ عید ہے تیرا تراشۂ ناخن ‏ — کہ اُس کو چرخ نے سر پر رکھا بہ عزّ و جلال

اسی سے روزہ کشائی شعار ہے اُس کا ‏ — چھٹے ہے خلق کے دل کا اسی سے رنج و ملال

اسی سے یہ سبب انبساطِ عالم ہے ‏ — اُسی سے ہے دہنِ بستہ کو کلیدِ ہلال

یہ آپ دے کے میں تشبیہ کیوں نہ نادم ہوں ‏ — مُقِر نہ کیوں ہوں کہ باطل ہے یہ مرا بھی خیال

وہ ایک روزہ کشا ہے یہاں ترا ناخن ‏ — ہر ایک عقدۂ عالم کا ہے شہا حلّال

ہلالِ عید نہیں ہے تری رکاب کی "رے" ‏ — کہ لکھی کاتبِ قدرت نے ہے سنبھال سنبھال

شہا ہلال کی یہ سُن کے مجھ سے ماہیّت ‏ — بس ایک شخص نے وو ہیں کیا یہ مجھ سے سوال

کہ بس ہلال کی تو سُن چکا حقیقت میں ‏ — مگر بیان تو کر مجھ سے عید کا احوال

وہ عید کیا ہے کہ جس سے خوشی ہے عالم میں ‏ — وہ عید کیا ہے کہ جس سے ہر ایک ہے خوشحال

بطرزِ سہل و برق و ملائمت شاہا! ‏ — جواب اُس کو دیا میں نے سُن کے اس کا سوال

تجھے خبر نہیں گر عید کی حقیقت ہے ‏ — تو میں بیان کروں، سُن اس کو اے حمیدہ خصال

وہ جو کہ جس کا جہاں میں نہیں عدیل و مثال ‏ — غریب پرور و کانِ سخا و بحرِ کمال

فلک بھی تابعِ فرماں، اُسی کے ہے شب و روز ‏ — اُسی کی مرضی موافق ہے ماہ و خور کی چال

چلیں خلاف جو مرضی سے اس کی یک سرِ مو ‏ — تو ہو وے وو ہیں کسوف و خسوف ان کو وبال

اُسی کی ذات ہے ہاں تاج بخشِ ہفت اقلیم ‏ — اُسی کے فیض کا دریا جہاں میں ہے سیّال

اُسی کو بھیجے ہے خاقانِ چین و قیصرِ روم ‏ — بس اپنے ملکوں سے تحصیل کر کے مال و منال

نسیمِ مکرمت فیض سے اُسی کے سُنا ‏ — کھلیں ہیں غنچۂ دلہائے بستہ گل کی مثال

یہ اُس کا عدل ہی پالے ہے شیر بکری کو ‏ — شفیق اپنا سمجھتا پلنگ کو ہے غزال

وہ کون حامیِ دینِ متین و شرعِ تعال ‏ — مطلع ‏ سراجِ دیں بہادر شہِ مبارک فال

بیان کیا کروں احوال اُس کی بخشش کا ‏ — کہ جس کے آگے زرِ سرخ ہے بجائے سفال

خزانچی کو خزانہ میں اُس کا حکم یہ ہے ‏ — کہ کانِ زر اُسے بخشو جو مانگے اک مثقال

اب اُس کے عہد میں عنقا ہے کم نہیں مفلس
اسی طرح تو کم اکسیر ہے نہیں کنگال

یہاں تلک تو غنی ہو گئے ہیں سنتے ہو
رکھے ہے چرخۂ مفلوک بھی کمر میں مال

یہ عیدِ جشن کا اُس کے مقدمہ ہے، سُنا
اب اُس کے جشن کا بھی حال سُن لے بالاجمال

یہ[1] پہلے جشن سے، ہوتی ہے تورہ بندی وہاں
جہاں میں پہنچے ہے ہر اک کو اُس کا خوانِ نوال

اور ایک رسم مقرر ہے بیشتر دو دن
جلوسِ جشنِ مبارک سے بھیگتی ہے دال

اور اُس کے دوسرے دن اس کو ہیں کر پیٹھی
بڑا کڑاہی میں ڈالے ہیں مل کے خیر سگال

مگر ہوئی نہیں اس رسم کی مجھے صحت
سُنے ہیں میں نے بہت اس میں مختلف اقوال

ولے خیال میں میرے یہ بات آئی ہے
کہ ہے تیمناً اس ملک میں یہ رسم کمال

کہ پہلے شادی سے ہوتا ہے رت جگا بھی ضرور
ہوئی اسی سے مروج ہو یہ جہان میں چال

اور اُس کا تیسرا دن عین دن ہے شادی کا
کہ جمع ہوتے ہیں سب، آ کے دیکھنے کو جمال

وہ[2] حکم ہوتا ہے دربارِ عام کا اُس دن
جو چاہے روکے کسی کو، کوئی نہیں ہے مجال

ہے اُس مکان کا دیوانِ خاص نام سُنا
کہ جس میں ہوتا ہے یہ جلوۂ ظہورِ جلال

رکھے ہیں پہلے وہاں لا کے تختِ طاؤسی
وہ تخت، چرخ ہے بس جس کا پایۂ اجلال

حضور آ کے بس اُس تختِ عرش عظمت پر
جلوس کرتے ہیں باصد شکوہ و عز و جلال

پھر اُس کے بعد مقرر ہیں جو قرینے[3] وہاں
کھڑے ہوئے ہیں اُسی طرح سب قرین و فضال

ہیں آگے سب سے ولیعہد عصر تخت کے پاس
بزیرِ سایۂ ظلِ خدائے باافضال

کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح شاہرخ مرزا
بصد متانت و تمکین و عزت و اجلال

اور اُن کے پاس کھڑے ہیں گے فخرِ دیں مرزا
بہ پیشِ تختِ شہنشاہِ دیں بریں[4] منوال

جناب میرزا فرخندہ شاہ عالی قدر
کہ اُن پہ چشمِ عنایت حضور کی ہے کمال

سو اُن کی جا دلِ حضرت میں ہے کہوں کیا بس
کہ اُن کے واسطے کس طرح کا ہے عز و جلال

کھڑے ہوئے ہیں وزیر الممالک اور بخشی
ہر ایک اپنی جگہ شاد و غم سے فارغ بال

---

۱ ک : کہ

۲ ک : اور

۳ ل : قریبی

۴ ک : برین نوال

حکیم اور ارکینِ سلطنت سارے
کھڑے ہوئے ہیں قرینے سے سب یمین و شمال

خواص اپنے قرینے سے سب کھڑے ہیں لیے
اُگالدان، کوئی مورچھل، کوئی رومال

ہیں ایک سمت کھڑے خوشنویس اور شاعر
کھڑے ہوئے ہیں نجومی کہیں، کہیں رمّال

کھڑے ہوتے ہیں مؤدّب کہیں نظارت خاں
کہیں ہیں شیدی زمرّد، کہیں ہیں[1] شیدی بلال

نجومیوں میں جو ہندو ہیں اُن[3] کا حال ہے یہ
بھڑا بھڑا[2] قدم اور ہاتھ کو نکال نکال

وہ اپنی بولی میں آشیر باد دیتے ہیں
کہ رکھے جلوہ یہ قائم سدا سری گوپال

اسی طرح سے غلامی میں اُس کی حاضر ہیں
کہاں تلک کہوں ہر ایک فن کے اہلِ کمال

بجے ہے ایک طرف بین ایک طرف قانون
کوئی رباب بجاتا ہے اور کوئی کھڑتال[4]

وہ اپنی اپنی جگہ گاتے ناچتے ہیں کھڑے
چمک چمک کے خوشی سے طوائف و قوّال

عجب طرح کا سماں بندھ رہا ہے کیا کہیے
کہیں ہیں بھانڈ، کہیں بھگتیے کہیں نقّال

ہر ایک روپ میں بہروپیے دکھاتے ہیں
کمال اپنا وہاں بس بدل بدل اشکال

جھنگڑ جھنگڑ بڑی نوبت خوشی کی بجتی ہے
خوشی سے تھرکے ہیں ہاتھوں میں جھانجھ دیکے تال

اِدھر کو گاتے ہیں شہنا نواز شہنا میں
کہ ہو دیں شدیاں مبارک پُھلا پُھلا کر گال

یہاں تلک کہ جو ہیں تخت پر بنے طاؤس
خوشی سے ناچے ہیں وہاں وہ بھی کھول کر پر و بال

قلار اپنی جگہ اُس ہجومِ خلقت میں
لیے کھڑے ہیں پے اہتمام چھڑیاں لال

ہر اک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مُجرا
بہ پیش گاہِ شہنشاہِ صاحبِ اقبال

وہاں کھڑے ہوئے بس چوبدار اور نقیب
خوشی سے اپنی جریب اور چھڑی سنبھال سنبھال

پکارتے ہیں کہ آداب سے کرو مُجرا
جہاں پناہ سلامت کا ہو فزوں اقبال

اِدھر سے گزرے ہے ملکوں سے پیشکش اور نذر
اُدھر سے ہوتے ہیں خلعت علیٰ فراخور[5] حال

۱۔ ک : کہیں کھڑے ہیں بلال
۲۔ ک : بڑھا بڑھا قدم
۳۔ ک : اُن
۴۔ ک : کھڑتال
۵۔ ک : مراتب

کہیں کھڑی ہیں سلامی کے واسطے توپیں — کہیں کھڑے ہیں شُترنال اور کہیں گھڑنال
اور اُس کے صحن میں بس فیلِ کوہ پیکر بھی — ہوئے ہیں مجرے کو حاضر لگا لگا کر ڈھال
اسی طرح سے جو حاضر ہیں اسپ خوش رفتار — بھرے ہوئے ہیں سنا موتیوں سے ان کے ایال
ہرت[1] پھرت میں وہ محبوبیاں ہیں اُن کی کہ بس — سمندِ ناز بھی دیکھے تو بھول جاوے چال
اور اُس مکاں کے جوانب میں وہ جو ہیں نہریں — رواں ہیں اُن میں اجی کیا کہوں وہ آبِ زلال
کہ تلخ کام محبت جو اُس کا اک قطرہ — پیے تو اُس کو ملے لذّتِ شرابِ وصال
اُدھر بھرو[2] وکوں کی جانب. جو دیکھیے دریا — تو دم بدم اُسے آتے ہیں بس خوشی کے اُبال
اور اُس سے مچھلیاں یہ سُن کے جوشِ شادی کا — تکے ہیں بس اسی جانب کو منھ کو نکال نکال
یہ موج زن نہیں دریا بنا کے چھوڑا ہے — صبا نے مچھلیوں کے واسطے خوشی کا جال
مبالغہ نہیں اُس بزمِ عشرت آگیں کو — جو دیکھے چرخ پہ زُہرہ تو اُس کی ٹپکے رال

مطلع

رہا نہ نام کو دل میں کسی کے رنج و ملال — کیا خوشی نے یہ غم کا جہاں سے استیصال
نسیم صبح طرب ریز آج یہاں تک ہے — کہ اس خوشی سے[3] چمن میں ہیں گُل نہال نہال
جہان میں نہیں چھوڑا فلک نے غم کا نام — خوشی سے ہنستے ہیں آغوشِ دایہ میں اطفال
بقدرِ حوصلہ کچھ مجملاً بس اس کو شہا — سنایا جشنِ مبارک کا میں نے یوں احوال
سنا کے میں نے کہا، کہا نہیں خبر تجھ کو — کہ ہے مقدمۂ جشنِ غرّۂ شوّال
جو اس قصیدے میں ہے عرض، عرض کرتا ہوں — اور اس سے ہوگی جُدا عرضِ حقیقتِ حال
اب عرضِ عیش ہے بس مطلعِ دعائیہ — کہ اس بیاں سے تھا مطلب یہی یہی تھا مآل
ہو جشن و عید مبارک تجھے شہا ہر سال — خدا کا فضل سدا رہوے تیرے شاملِ حال
یہ آرزو ہے خدا سے یوں ہی رہے سب پر — جہاں میں سایہ فگن تیرا نیّرِ اقبال
رہے غلامی میں حاضر تری خوشی ہر دم — بحول و قوت و تائیدِ ایزدِ متعال

۱۔ ک: چلت پھرت
۲۔ ک: بھروں کدل
۳۔ ک: میں

یہی دعا ہے طفیلِ محمدِ عربی
رہے مزاجِ مقدس خوشی سے مالامال

الٰہی ہوویں دعائیں یہ سب قبول مری
بحقِ سورۂ یاسین و سورۂ انفال

قصیدہ

(۴)

جہاں میں دیکھو تو اللہ رے فیضِ ابرِ بہار
کہ دھو دیا ہے زمیں تو زمیں، دلوں کا غبار

خواص بادِ بہاری کا میں اگر لکھوں
تو ہووے صفحۂ قرطاس غیرتِ گلزار

ہوا نے کی ہے یہاں تک لطافت ارزانی
کہ صاف ہوتی ہے دیکھو نگاہ سنگ کے پار

صفا کے مصقلۂ فیض نے جہاں میں آج
کیا ہے دیکھو ہر اک ذرّہ مطلعِ انوار

صفا زمیں کو وہ حاصل ہوئی ہے نامِ خدا
کہ چشمِ آئینہ وارہ گئی ہے حیراں وار

بدل دیا ہے یہاں تک خواص اشیا کا
کہ اندمال کو دیتے ہیں مرہمِ زنگار

اثر بہار کا پہنچا ہے یہاں تلک دیکھو
کہ سبز ہوتے ہیں پتھر میں دانہ ہائے شرار

صبا نے اب کے بھری ہے وہ مے میں کیفیت
کہ جانتے نہیں میکش جہاں میں کیا ہے خمار

یہ جوشِ نشو و نما ہے شعاعِ مہر نہیں
اُگے ہیں چشمۂ خورشید کے بھی گرد اشجار

یہ جوشِ فیض ہوا ہے کہ آج عالم میں
ہنسے ہے دیکھ کے بل بے گھمنڈ نور پہ نار

یہ فیضِ ابرِ بہاری ہے ان دنوں دیکھو
جہاں میں نور کی چاروں طرف پڑے ہے پھوہار

جہاں میں زلفِ عروسِ چمن کی نکہت سے
خجل ہے عنبرِ سارا سے تا بمشکِ تتار

نویدِ مقدمِ گل ہو مبارک عالم میں
چمن میں بلبلِ شیدا رہی ہے یہ للکار

ہوائے شوق میں دیکھو تو عندلیبِ چمن
پڑھے ہے کیا سبقِ بوستاں پکار پکار

ہوئی ہے جو یہ خبر گرم آمدِ گل
تو بلبلیں ہوئیں خوش اور خزاں ہوئی ناچار

یہ انبساط ہے غنچے تلک نہیں دل تنگ
گلوں میں چہچہے کرتی پھرے ہے بلبلِ زار

عجیب لطف ہے قمری و سرو و بلبل و گل
خوشی سے دیکھو ہیں آپس میں گرم بوس و کنار

بس اب کے سال ہوا آشیانۂ بلبل
گلوں کے ربط سے صد رشکِ خانۂ عطار

ترانہ سنج ہے گلشن میں ہر طرف بلبل ہزار جان سے ہو ہو کے ہاں گلوں پہ نثار
غرض کہ برگ سے تا شاخ و شاخ سے تا گل ہے ایک ایک مئے انبساط سے سرشار
خدا زیادہ کرے کیا ہی فرطِ شوق سے ہے چمن میں زمزمہ پرداز بلبلِ خوش قار
نسیم صبح، رخ و زلف بلبل و گل کو چمن میں دیکھو دکھائی[1] ہے کیا سنوار سنوار
مشامِ جاں نہ ہو کس طرح کہیے عطر آگیں شمیم گل سے معطر ہے کوچہ و بازار
ہوئی ہے اب کے جہاں میں کوئی خوشی سی خوشی کہ ہنس رہے ہیں پڑے زخمِ سینہ ہائے فگار
ہوا ہے ولولۂ شوق اس قدر باعث چمن میں ناچے ہے طاؤس تک بھی پنکھ پسار
ہوس ہے زاہدِ دل سرد کو کہ بنیے مغاں جہاں میں یہ مے و مینا کا گرم ہے بازار
رقم بہار کا عالم کہاں تلک کیجے کہ ہے زمیں سے فلک تک جہاں میں جوشِ بہار
یہ وہ بہار ہے واعظ کا گدگدائے ہے دل رہا جو صوفی، اسے نے تلک نہیں انکار
گلوں سے بلبلِ شیدا و سرو سے قمری ملا ہے شمع سے پروانہ، اور ہم سے یار
غرض کہ جوشِ خوشی اس قدر ہے عالم میں کہ انبساط کو لیتے ہیں عاشقوں سے ادھار
یہ فیضِ عام ہے ابرِ بہار کا دیکھو کہ نام کو نہیں کوئی کسی کا شکوہ گزار
نہیں[2] ہے آج کسی کو کسی سے کوئی گزند بہم دگر ہیں پسندیدہ اس قدر اطوار
یہاں تلک جو فلک کی سرشت میں تھی کجی[3] کہ جس سے دیتا تھا ہر دل کو دکھ وہ کج رفتار
اس[4] اعتدال کے عالم کو دیکھ عالم میں ہوا ہے اس کا جو احوال کیا کروں اظہار
بنا کے دانۂ انجم کو دانۂ تسبیح اور اس میں رشتے کی جاوے کے کہکشاں کو قرار
بصد تضرع و زاری، بصد خشوع و خضوع خدائے پاک سے کرتا ہے، وہ بھی استغفار

۱۔ ک : دکھاتے ہیں
۲۔ ل : نہیں ہے آج کسی کو یہاں کسی سے گزند
ک : نہیں ہے آج کسی کو جہاں میں کوئی گزند
۳۔ ل : میں ہے کجی ک : میں بھی کجی ۴۔ ل : بس

یہ رنگ ڈھنگ زمانے کا دیکھ کر دل نے — کیا یہ پوچھتے ہی پیرِ خرد سے استبشار

کہ کس کا عہد ہے اور کیا خوشی ہے عالم میں — کہ جس سے رنج ہے معدوم اور خوشی ہے بکار[1]

ہوا ہے عقدہ کشا کس کا ناخنِ الطاف — کہ انبساط ہر اک دل سے اس طرح ہے دوچار

ہے کس کے قبضے میں آج انتظام عالم کا — کہ کام بخش ہر ایک کو ہے دورِ لیل و نہار

ہوا ہے کام روا کس کا لطف عالم میں — نسیم لطف سے کس کی ہوا جہان گلزار

ہوا ہے کون خوش ایسا، جہاں میں کہہ تو بھی — کہ جو[2] زمیں سے فلک تک خوشی کے ہیں آثار

نسیم مکرمت و ابرِ جود سے کس کے — قرار دیتے ہیں عالم کو[3] گلشن بے خار

یہ سن کے پیرِ خرد نے کہا مرے دل سے — بعید تجھ سے ہے کیوں ہے تو واقف اسرار

تجھے خبر نہیں اب تک کہ کس کا عہد ہے یہ — یہ کیا خوشی ہے کہ ہر دل ہے جس سے باغ و بہار

نکال پنبۂ غفلت کو گوشِ ہوش سے تو — سن اس نوید کو، ہو جس سے تیری جاں کو قرار

نوید یہ ہے کہ ہے عہد جس کا آج کے دن — جلوس جشنِ مبارک کا اس کے ہے دربار

وہ وہ ہے بحرِ سخا و عطا کہ بخشے گنج — دمِ سوال جو سائل طلب کرے دینار

یہ اس کا عدل ہے دب کر چلے ہے مور سے فیل — یہ اس کا ڈر ہے ڈرے ہے غریب سے سردار

شجاعت ایسی کہ رستم کا آب ہو زہرہ — جو کھینچے روزِ وغا وہ میان سے تلوار

وہ تیغ ایک کے دو، اور دو کے چار کرے — جو ہنستے ہنستے وہ کر بیٹھے ایک کو وہ پہ وار

سمند اس کے جو ہے زیرِ راں وہ ایسا ہے — کہ دم میں عرصۂ عالم کو طے کرے سو بار

جو فیل اس کی سواری کا ہے فلک پیکر — بجا ہے اس کو اگر کہیے کعبۂ دیں دار

گمان خلق کو ہووے یہی کہ ہے شبِ قدر — سوار اس پہ جو وہ ہو گئے باصد عز و وقار

وہ کون یعنی شہِ بو ظفر بہادر شاہ — سراجِ دینِ متینِ محمدِ مختار

جہاں میں وارثِ تاج و نگین و سیف و قلم — فروغ بخشِ سریر و شہِ خجستہ شعار

۱۔ ک: کبار

۲۔ ل: کہ خرمی سے

۳۔ ک: سے

اُسی سے فرش سے تا عرش ہے بہار آگیں — اُسی سے زیست ہے حاصل جہاں میں بے آزار

اُسی سے ہر دلِ پژمُردہ ہے تر و تازہ — اُسی سے ہے طرب آگیں ہر ایک زار و نزار

جہاں سے دُور ہوئی یہاں تلک پریشانی — کہ گھس لگانے کو ملتی نہیں جو ڈھونڈو ہزار

یہ حد ہے رکھے ہے ہر ہر گرہ میں جمعیت — اب آگے کیا کہوں زُلفِ بُتاں کا ہر ہر تار

جہاں میں پیاس بجھانے کو تشنہ کاموں کی — تُلا کھڑا ہے نہ کر دیۂ ابرِ دریا بار

یہ مژدہ سنتے ہی پیرِ خرد نے، دل نے مرے — کیا خوشی سے مرے واسطے یہ حکم اصدار

کہ عیشؔ جلد اٹھا خامہ اور نہ دیر لگا — شتاب وصفِ شہنشاہ میں تو لکھ اشعار

وہ شعر ہووے کہ ہر ایک بیت پر اُس کی — ہزار جان سے قربان ہو دُرِ شہوار

تو بس اٹھاتے ہی خامہ کو میں نے ساقی سے — یہ پڑھ کے مطلعِ موزوں کہا پکار پکار

ق

پلا دے جلد وہ ساقی مجھے مطلعِ گلنار — کہ جس کے پینے سے گلگونِ طبع ہو رہوار

شتاب دے مئے گل رنگ بھر کے ساغر میں — کہ سمتِ قبلہ سے اٹھتا ہے ابر دھوندکار

ہے اعتدال کا عالم زمیں سے تا بہ فلک — خوشی جہاں میں ہر اک قصرِ دل کی ہے معمار

ہر ایک سمت کو آراستہ ہے بزمِ طرب — کھلے ہوئے ہیں خوشی کے ہر اک طرف بازار

ہے بحر بحر خوشی، موج موج ہے شادی[1] — چمن چمن ہے طرب اور جہاں جہاں ہے بہار

ہر ایک دل کو ہے عالم میں انبساط سے ربط — ہر ایک جان کو ہے بس نشاط سے سروکار

اس عہد میں مئے عشرت سے ہے ہر اک سرخوش — کسی کے دل پہ نہیں اب کسی طرح کا بار

جزاے خیر ملے ساقیِ شکر لب کو — کہ میں نے مے جو کیا اپنا یوں لبِ اظہار

کیا نہ ردّ و قدح اُس نے مجھ سے سنتے ہی — بلا مبالغہ کہتا ہوں یہ کہ بے تکرار

وہ مے کہ جس کے پیے سے بدن میں جاں آوے — وہ مے کہ جس کے پیے سے زبان ہو طرّار

وہ جام جس پہ کہ ہو جامِ آفتاب کو رشک — وہ اُس میں مے کہ ہو روشن دلوں کے جی کو قرار

وہ خوشگوار کہ پینے سے جس کے شاد ہو دل — وہ پُر سرور کہ ہے ننگ و عار جس کو خمار

۱۔ ک: شاداب

وہ مے کہ چھوڑے سے چکھے اُسے اگر زاہد
تو سمجھے کعبۂ مقصود خانۂ خمّار

وہ مے کہ سحر بیاں کر دے اپنے شارب کو
وہ مے کہ پیتے ہی ہو جس کے رونقِ گفتار

وہ مے کہ جس سے ہو بزمِ نشاط میں رونق
وہ مے کہ جس کے سبب پہنچے جام تا لبِ یار

وہ مے کہ جس سے ملے کامِ جان کو لذّت
وہ مے نشے کا نہ ہو جس کے حشر تک بھی اتار

یہ ذکر ساقی وے سُن کہیں خباثت سے
یہ خوف ہے نہ کریں بدگمانیاں اغیار

وہ اور ساقی ہے ہاں ہاں وہ اور ہی مے ہے
وہ مے نہیں کہ جو ہے منع شرع میں مُردار

بس اُس کے پیتے ہی اک میں نے مطلعِ روشن
لکھا یہ مدح میں تیری سُن اے سپہرِ وقار

مطلع

جہاں پناہ و جہاں دار و مطلعِ انوار
خدا شناس و خدا ترس و زبدۂ ابرار

سلیم طبع، حمیدہ خصال و نیک گہر
بلند ہمّت و نیکو پسند و نیکو کار

سخی و باذل و قدسی صفات و روشن دل
شفیقِ خلق بالطاف و زبدۂ اخیار

غریب پرور و عالی مزاج و عالی طبع
سپہر شوکت و گیتی ستاں شہِ دیندار

فصیح و شاعرِ غرّا بلیغ و نکتہ شناس
رکھے ہے بخت جواں اور طالعِ بیدار

دعا یہ کرتا ہے مدّاح تیرا ختم کلام
کہ تیری مدح کو ثنا ہا نہیں ہے حدّ و حصار

جلوسِ جشن مبارک ہو تجھ کو اے شہِ دیں
خدا کا فضل سدا رہوے تیرے حامیِ کار

الٰہی رونقِ تاج و نگیں رہے تجھ سے
یہ جب تلک رہے عالم میں دورِ لیل و نہار

جہاں رہے ترے زیرِ نگیں رہیں جب تک
فلک پہ سبعہ سیّارہ و خمسِ سیّار

جو خیر خواہ ہیں تیرے سدا رہیں سرسبز
مدام نخلِ تمنّا کا اُن کی لاوے بار ؟

جو ہو شہا ترا بدخواہ کوئی عالم میں
ہو اُس کا روز سیہ مثلِ سینۂ کفّار

مدام دائرۂ غم میں وہ کھڑا رہوے
ہر ایک سمت سے مانندِ نقطۂ پرکار

دعائے عیش یہ مقبول ہو خدائے کریم
بحقِّ پنجتنِ پاک و چار یارِ کبار

۱۔ ک: وہ
۲۔ ل: ثناہا
۳۔ ک: خدا

در تہنیت جشن

(۵)

نسیم صبح نے دی آج وہ[1] خوشی کی خبر — کہ غنچہ ہائے دلِ بستہ کھل گئے یک سر
رہا نہ نام کو عالم میں انقباض کا نام — یہ اب کے سال کھلا انبساط کا دفتر
لکھے ہے صفحۂ خاکی پہ باخطِ گلزار — نویدِ مقدمِ گل منشی قضا و قدر
جہاں میں آج بچھایا ہے فرشِ مخملِ سبز — صبا نے باغ سے تا بحر و بحر سے تا بَر
اور اس کے سبزے میں ہاں ہاں یہ لہلہاپن ہے — کہ جس کو دیکھ کے سیراب ہووے نورِ بصر
شبِ خزاں گئی، صبحِ بہار آ دھمکی — صدائے غنچوں سے بجنے لگا چمن میں گجر
کرے نہ کیوں کہ گلستاں میں چہچہے بلبل — سنائے ہے سبقِ بوستاں صبا فر فر
یہ جھومتے نہیں غنچے گلوں کی شاخ پہ آج — نسیم صبح ہلاتی ہے باغ میں مگدر
یہ فیضِ ابرِ بہاری ہوا جہاں میں کہ بس — ملا عروسِ چمن کو بہار کا زیور
نہیں یہ خندۂ گل بے سبب خدا جانے — صبا نے پھونکا ہے کیا گل کے کان میں اکثر
ہوا کے فیض سے صد رشکِ گلستاں ہے وہ، جو — زمیں تھی حضرتِ آدم کے وقت سے بنجر
ہوا کے فیض نے کی ہے یہ قلبِ ماہیت — ہوا ہے زہرِ ہلاہل بجائے شیر و شکر
اور اس کے فیض نے آتش کدے جہاں کے کیے — وہ سبز، کانِ زمرد کو رشک ہو جس پر
اثر بہار کا یہاں تک تو ہے کہ سیپ میں بھی — بنے ہے فیضِ ہوا سے زمرّدی گوہر
ادھر بنے ادھر اڑ جائے جوڑ کر گندے — جو کھینچے بلبلِ تصویر، کوئی صورت گر
محال جانتے تھے جو اعادۂ معدوم — مقر بقید[2] ہوئے وہ دیکھ، یہ ہوا کا اثر
کہ چوب بن کے ہوئی سبز، سبز ہو کے پھلی — وہ چوبِ خشک جو جل کر ہوئی تھی خاکستر
ہوا کے فیض سے کھل جائیں وہیں چار چمن — بچھا کے کھیلنے بیٹھے اگر کوئی چوسر

۱۔ ل : یوں
۲۔ ک : بقید

ہوا ہے کاسۂ گردوں تلک زمردگوں — نظر پڑے ہے ہر اک سبز دانۂ اختر

ہوا کے فیض نے مدِ شہابِ ثاقب کو — بنا دیا ہے یہ صد رشکِ چوبکِ گلِ تر

فلک پہ بادِ بہاری کا ہے اثر یہاں تک — کہ سبز رنگ ہوئی ماہتاب کی چادر

ہوئی ہے دوشِ ہوا پر وہ سبز قوسِ قزح — کہ جس کے دیکھے سے ہوتا ہے سبز نورِ نظر

یہ زور شور ہے نشو و نما کا عالم میں — کہ شاخِ خشک بھی گلشن میں لائی ہے گلِ تر

گرے زمیں پہ اگر کوئی دانۂ شبنم — تو بس معاً وہیں ہو کر درخت لائے ثمر

کہاں تلک کہوں یہاں تک تو جوشِ نامیہ ہے — کہ اُس کے فیض سے لائے نکال پھول سپر

یہاں تلک تو لطافت ہوا نے بخشی ہے — خوشی سے ناچتی پھرتی ہے برق اِدھر کی اُدھر

کھبے ہے اور یہ مشاطۂ نسیم بہار — بیاں کنیم بشنو عالمِ بہار دگر

بہارِ حسن کا عالم یہ ہے کہ عالم میں — نظر پڑیں ہیں وہ پریوں کے ہر طرف ہجوم

جو دیکھ لیوے کبھی ماہ اُن کی پیشانی — تو رگڑے اپنی جبیں اُن کے در پہ شام و سحر

اور اُس کے نیچے کھنچے اس طرح کے ہیں ابرو — کہ جن کو دیکھ کے رستم جھکا دے اپنا سر

جو اُن میں ہے کسی ابرو کے نیچے خالِ سیاہ — بعینہٖ یوں ہی نہیں فرق اُس میں اک تل بھر

بغور دیکھو وہ ابرو نہیں ہے تیغِ دودم — وہ تل نہیں نظرِ بد کے واسطے ہے سپر

جبیں وہ نور کا عالم ہے اور بھنویں وہ ستم — وہاں سے جا پڑے گر اُن کی انکھڑیوں پہ نظر

تو انکھڑیاں ہیں وہ بدمست جن کی نیم نگاہ — نہ چین دیں دلِ عاشق کو کر دیں زیر و زبر

وہ شوخی اُن میں کہ آہو بھی جس سے چیں مانے — وہ ساتھ شوخی کے گرمی کہ برق مانگے حذر

بچھا دے نرگسِ شہلا تو اپنی آنکھوں کو — بس اُن کے تلووں کے نیچے جو ہو چمن میں گزر

جلا دے دم میں وہیں وحشتِ خرمنِ صبر — وہ اُن کی برقِ نظر جا پڑے پلٹ کے جدھر

خدا بچائے ہر آفت سے، اُن کی آنکھ تو آنکھ — مژہ وہ قہر کہ جینے نہ دیوے ایک پل بھر

کٹیلی انکھڑیاں وہ، ناوکِ مژہ وہ بلا — کہ جن کے سایہ سے تیرِ قضا چلے بچ کر

۱۔ ک: نامہ

۲: تلوے کے (ک)

صف اُن کی لوٹ لے بس صف کی صف ہو لائے رنگ ہے ایک ایک رگِ جاں کے واسطے نشتر

وہ ایک ایک پری ہے کہ جن کے مکھڑے کا کوئی بیاں جو کرے شام کو تو ہووے سحر

نگاہِ بد رہے دُور اُن سے کیا بیاں کیجے وہ آب و تاب کہ خورشید کی نہ ٹھہرے نظر

صفا پہ اُن کی نظر جا پڑے تو آئینہ بسانِ دیدۂ حیرت[1] زدہ رہے ششدر

وہ زلف و رُخ ہیں کہ چشمِ فلک نے خواب میں بھی نہ ایسی شام ہی دیکھی کبھی نہ ایسی سحر

شمیمِ زلف کو گر اُن کی سونگھے تو وہ بو کہ جس سے مشک ہو شرمندہ اور خجل عنبر

جبیں اُن کی[2] ہے دریائے حُسن کی کشتی اور اُن کی زلفیں ہیں کشتیِ حُسن کا لنگر

کسی کی اُن میں جو چوٹی گندھی ہوئی ہے تو بس نہیں ہے جعد وہ ناگن ہے اک سیاہ بھنور

نہیں تمامی کا موباف اُس میں سنتے ہو رہی ہے کینچلی، تھوڑی سی اور گئی ہے اُتر

گواہی دیتی ہے اُن کافروں کے منھ پہ ناک کہ میری آنکھوں کے آگے ہوا ہے شقِ قمر

وہ لب کہ لعل جسے دیکھ ہونٹ ہی چاٹے[3] وہ لب کہ سامنے یاقوت جس کے ہے پتھر

وہ لب کہ جس کے ثنا خواں ہیں برگِ گل بہ چمن وہ لب کہ حضرتِ عیسیٰ[4] ہوں دیکھ انھیں مضطر

قیامت اُن میں یہ اعجاز ہے کہ جی اُٹھیں سب ہی جہان کے مُردے جو کر دیں چھو منتر

دکھاویں اپنے لبِ لعل وہ ہنسی[5] میں اگر تو آوے چشمۂ حیواں کے منھ میں پانی بھر

وہ ایسے غنچہ دہن ہیں کہ جن کا غنچۂ لب چمن میں دیکھ کے ہو تنگ غنچۂ گُلِ تر

صفا وہ ہے دُرِ دنداں میں اُن کی سنتے ہو کہ جس کے سامنے پانی بھرے ہے آبِ گہر

غرض وہ دانت نہیں، جوہری قدرت نے دھری ہے سلکِ گہر دُرجِ لعل کے اندر

اور اُن کے کان وہ کانِ ملاحت ہیں گے سنا کہ گوشِ دل سے ذکر اُن کا اپنے کان کو دھر

وہ کان ہیں کہ اگر دیکھ لے اُنھیں بلبل تو جا کے باغ میں بس گُل کے ڈالے کان کتر

۱۔ ک: حسرت زدہ

۲۔ ک: اس کی

۳۔ ک: چپلتے

۴۔ ل: موسی

۵۔ ل: مسی

جو دیکھیے کبھی اُن کا فروں کے سیبِ ذقن   تو ہیں جہاں میں وہی روح بخش و جاں پرور
جو اُن کی دیکھیے گردن تو وہ صراحی دار   کہ بس صراحیِ غنچہ کو رشک ہے اُن[1] پر
جو بازو دیکھیے اُن کے تو وہ، وہ آفت ہیں   بغل میں داب کے دل عاشقوں کا جائیں اُکر
لچک ہے ساعدِ سیمیں میں وہ، کہ گلشن میں   جو شاخِ گل کبھی دیکھے تو کانپے بس تھر تھر
جو دیکھے اُن کے کبھی پنجۂ حنائی کو   تو اپنے پنجے کو خورشید بوے جیب میں دھر
بسانِ آئینہ رہ جائے چشم وا، یوں ہی   صفائے سینہ کو گر اُن کی دیکھے اسکندر
نہیں وہ سینے پہ ان کے نمودِ پستاں کی   یہ بحرِ حُسن سے آئے ہیں، دو حباب اُبھر
کچیں نہیں ہیں وہ، دو پہلوان کشتی کو   کھڑے غرور سے میدان میں رہے ہیں بپھر
جو پیٹ دیکھیے اُن کے تو حُسن کے دریا   اور اُس میں ناف ہے دریا میں جس طرح سے بھنور
جو اُن کی دیکھیے کمریں تو ہیں وہ نام خدا   کہ نام ہی نام ہے بس، ہے یہی تو وصفِ کمر
وہ گول گول سُرین ان کی اور وہ کافر گات   کہ اہلِ ورع کے اک دم میں دیں پلٹ تیور
اب آگے اِس سے خموشی ہے عادتِ شعرا   سو تو بھی مخزنِ اسرارِ حق کا ذکر نہ کر
ہے آگے ران سے تا ساق شمع فانوسی   رہے ہے پردے میں اِس واسطے کہ ہو نہ نظر
وہ پشتِ پا ہیں کہ میلے کہیں نہ ہو جاویں   نگاہ کرنے میں اُن کی طرف رہے ہے یہ ڈر
ہلال دیکھ کے گردوں پہ اُن کے ناخن کو   یہ ہو خفیف کہ نیچے زمیں کے جائے اُتر
لطافتِ کفِ پا وہ، کہ مارے حسرت کے   چمن میں دیکھ کے پامال ہو گُلِ احمر
جو دیکھے قدِ موزوں کو اُن کے سروِ چمن   تو مثلِ سایہ گرے اُن کے پاؤں پر آکر
خرامِ ناز کا گر سُن لے اُن کے افسانہ   تو کانپے بید کی مانند فتنۂ محشر
یہ حُسن اُس پہ فزوں عالمِ نشاط وہ ہے   کہ ہو رہی ہیں نئی مستیاں بہم دیگر
اسی طرح سے ہے سارے جہاں میں جوشِ نشاط[2]   اسی طرح سے ہیں سب مستِ بادہ و ساغر

۱۔ ل: اُس پر
۲۔ ک: چمن

نہیں جہاں میں کوئی، جو نہ عشرت آگیں ہو
یہاں تلک تو ہے ناچے ہے گنبدِ اخضر

یہ انبساط ہوا ہے کہ شمع ہنستی ہے
پتنگ ناچے ہیں[1] گرد اُس کے کھول کھول کے پر

نویدِ تازہ، طرب ریز ہے ہر اک دل میں
ہوئی ہے روح کو راحت یہ سُن خوشی کی خبر

جہاں میں آج ہے مینا کو قاہ قاہ سے کام
نئے طرب سے ہے جامِ شراب کو چکّر

پکارتے ہیں پڑے بادہ نوش اے ساقی!
پلا وہ جامِ مئے ناب، جس میں ہو نہ کدر

جہاں میں بادۂ عشرت سے ہے ہر اک سرخوش
مے نشاط سے[2] بدمست ہے ہر اک پیکر

یہ گرمِ جوشیِ مے ہے کہ چرخِ مینائی
رکھے ہے صبح سے تا صبح، دورِ ساغرِ زر

جہاں کا سنتے ہی یہ رنگ روپ، میں نے کہا
کہ تو بتا تو سہی مجھ کو، اے نسیمِ سحر!

وہ کیا نوید ہے، یہ جس سے ہے خوشی ہر جا
وہ مژدہ کیا ہے کہ خوش جس سے ہے ہر ایک بشر

ہوا ہے رشکِ صد آئینہ جو یہ صفحۂ خاک
یہ کس کا مصقلۂ فیض ہے صفا گستر

ہوا ہے ناخنِ الطاف کس کا عُقدہ کُشا
کہ ہو گیا ہے سراپا یہ آب، عقدِ گہر

شمیمِ لطف و عنایات نے کس کی عالم میں
دیا ہے جامۂ گُل عطر سے بہار کے بھر

خوش ایسا کون ہوا ہے جہاں میں کہ تو بھی
خوشی سے جس کی یہ عالم میں ہے خوشی گھر گھر

ہوا ہے کیا سببِ انبساطِ عالم میں
خدا کے واسطے کہ مجھ سے تو دریغ نہ کر

یہ سُن کے مجھ سے نسیمِ سحر لگی کہنے
سبب جو پوچھے ہے تو کیا نہیں ہے تجھ کو خبر

جلوسِ جشنِ مبارک ہے اُس کا آج جسے
خراج دیتے ہیں خاقانِ چیں سے تا قیصر

وہ جلوہ بخش ہوا ہے بہ تختِ طاؤسی
بصد شکوہ، بصد حشمت و بصد کر و فر

وہی ہے وارثِ تاجِ نگینِ عالم میں
وہی ہے مالکِ سیف و قلم بفتح و ظفر

خدائے عزّ و جل نے تمام عالم کا
رکھا ہے قبضۂ قدرت میں اُس کے نفع و ضرر

رکھے ہے حکمِ مساوات اُس کی شفقتِ عام
بہ دیار و بہر ضلع و بہر کشور

اُسی کی ذاتِ مقدس سے رونقِ دیں ہے
اُسی کا اسمِ مبارک ہے رونقِ منبر

۱۔ ل: ہیں

۲۔ اصل: کو۔ ل: سے اصلاح کی گئی

اسی کے صیتِ عدالت کا جوش ہے کہ جو یوں — چلے ہے پیشی میں روباہ شیر سے اُڑ کر
اسی کا دابِ عدالت تو ہے کہ عالم میں — چلے ہے گربۂ مسکیں سے دب کے شیر ببر
علوے مرتبہ اُس کا وہ ہے کہ چرخ بلند — جھکائے رکھتا ہے خدمت میں اس کی اپنی کمر
وہ کون یعنی شہِ بو ظفر سراج الدین — کہ ہے وہ سایۂ حق، جانشینِ پیغمبر
چل اُس کی مدح میں لکھ عیش کہہ کے بسم اللہ — تو چند شعر بطرزِ نو و بنوعِ[1] دِگر!
یہ سُن کے اُس سے اٹھا میں نے خامۂ رنگیں — لکھے یہ شعر تری مدح میں شہا یکسر
مری زباں پہ نہ ہوں کیونکہ بلبلیں عاشق — نہ ہو کلام مرا کیونکہ رشکِ صد گُلِ تر
مرا مدیح ہے تو، اور میں ہوں ترا مدّاح — کہ تیرے در کی غلامی ہے فخرِ صد سنجر

مطلع

سخی و عادل و حامیِ شرعِ آں سرور — سراجِ دینِ محمد شہِ خجستہ سیَر
جہاں کشا و جہاں داور و جہاں آرا — جہاں پناہ و خدیوِ جہاں، جہاں پرور
سخن طراز و سخن سنج و نکتہ دان و فصیح — بلیغ و شاعر و جوہر شناسِ اہلِ ہنر
بدست بحرِ سخا و بدل سحابِ عطا — بناخن عقدہ کشا و بعقل زور آور
جوان بخت و جواں دولت و جواں ہمّت — بعقل پیر و بدانش کبیر و دانش ور
گناہ بخش و خطا پوشِ خلق و عذر نیوش — کریم طبع، حمیدہ خصال و پاک گہر
سپہر مرتبہ انجم سپاہ و کیواں جاہ — بلند رتبہ فلک عتبہ و بلند اختر
بہ تیغ قامعِ[2] بدعت بعدل ماحیِ[3] ظلم — بزر معینِ جہان و بزور دافعِ شر
گراں بحلم و وقار و متیں برائے صواب — بقول و عہد درست و بصدق نام آور
فقیر دوست و عالم نواز و علم پسند — انیسِ جانِ حزیں مونسِ دلِ مضطر
وحیدِ عصر و فریدِ زمن یگانۂ دہر — فہیم و عاقل و فرزانہ، صاحبِ افسر
شفیقِ خلق بہ بخشش ظہیرِ خلق بعدل — بزور ناظمِ عالم بخلق قاسمِ زر
رسید وصفِ تو چوں اندزباں بگوشِ دلم — خطاب کرد دلِ من بمن کہ اے مضطر!

۱- ک : بطرزِ نو و بنو ہو کر (یہ مصرع تقطیع سے گرا ہوا ہے)
۲- ل : قاطع — ۳- ل : قامع

ز روے حالِ تو معلوم می شود مارا — ندادۂ بجنابش زحالِ خویش خبر
چرا کہ گر خبر از حالِ تو بشاہ شدے — بہ لایزال کہ ہرگز نمی شدی مضطر
ہر آں چہ گشت، ہمہ از قصورِ طالعِ تست — الاشتاب بزود عرضیے نویس و ببر
ہمیں کہ عرضِ ترا شاہ گوش کرد ز لطف — فلک بکامِ تو خواہد رسید کُن باور
یقیں بداں و خیالے مکن نخواہد شد — برائے کارِ تو ہرگز حوالہ بہ دگر
صفاتِ شاہ فزوں است زانکہ تو گفتی — مگر تو عیش بطرزِ کلامِ خود بنگر
کمیتِ خامہ ترا ہند سے سُوے فارس — ہوا ہے گرمِ عناں روک، جائے ہے یکدھر
بس اس کو روک کے کردے دعا پہ ختم کلام — مگر زبان میں اپنی کہ ہے یہی بہتر
سو بس دُعا ہے یہی رات دن مری شاہا! — بحقِّ سورۂ اخلاص و سورۂ کوثر
رکھے یہ جشن مبارک تجھے مُدام یوں ہی — طفیلِ سیّدِ کونین و خالقِ اکبر
شگفتہ رہوے سدا تیرا گلشنِ اقبال — مُدام نخلِ تمنا میں تیری آوے ثمر
جو خیر خواہِ دولت میں ہیں غلام ترے — مُدام بادۂ عشرت پییں وہ ہنس ہنس کر
رکاب میں تری حاضر جو ہیں ترے مدّاح — نصیب ہوا نھیں نخواہ واسپ و خلعت و زر
بسانِ سطحۂ غربال خارِ غم سے مُدام — رہے مشبک و منفک، ترے عدو کا جگر

رہیں عدو ترے اوراقِ گنجفے کی طرح
سدا بروے زمیں برہم و ہمیشہ ابتر

قصیدہ در تہنیت جشنِ شاہ جمجاہ ملایک سپاہ محمد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہِ غازی

(۶)

کروں بہار کے عالم کو میں اگر تحریر — تو ہووے نغمۂ بلبل مرے قلم کی صریر
بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ صفحۂ قرطاس — یہ وہ بہار ہے بن جائے رشکِ صد کشمیر
جہاں میں بادِ بہاری کا فیض یہاں تک ہے — کہ ہووے خامہ مرا گلفشاں دمِ تحریر
زبان پہ مری آجائے اگر بہار کا نام — تو ہو جہاں میں سر سبز بس مری تقریر

عطا ہوا ہے نسیم سحر کو یہ اعجاز
کہ جس کے فیض سے گویا ہے غنچۂ تصویر

صفا پذیر ہے گردوں سے تا بہ صفحۂ خاک
یہ کیا طلسم ہے اللہ رے فیضِ ابرِ مطیر

مٹا دیا ہے کدورت کا نام عالم سے
ہوا ہے شیشۂ ساعت تلک بھی صاف ضمیر

یہاں تلک تو ہے فیضِ نسیم عقدہ کشا
کہ باغِ دہر میں غنچے تلک نہیں دلگیر

ہوا ہے دیکھو یہ عالم میں جوشِ کیفیت
کہ مست پھرتے ہیں گلشن میں بلبلانِ دلیر

یہ اختلاط کہ سیدھا ہے سرو قمری سے
ہوئی ہیں باغ میں تو بلبلیں گلوں کی مشیر

کھڑے ہیں آج جوانانِ بوستاں سارے
پہن کے باغ میں ہاں ہاں لباسِ سبز حریر

یہ اب کے سال جنوں خیز ہے ہوائے بہار
زمیں سے ڈالے ہیں غنچے نکل گریباں چیر

اب آگے حد ہے جوانانِ بوستاں کے لیے
جہاں میں موجِ نسیمِ بہار ہے زنجیر

شکست دینے کو فوجِ خزاں کے گلشن میں
ہر ایک غنچہ ہے پیکاں ہر ایک شاخ ہے تیر

مطلع
قرار دے کے مغاں نے فلک کو خم عصیر
کیا ہے مست جہاں میں ہر اک صغیر و کبیر

یہ انبساط ہے شاخیں گلوں کی گلشن میں
لہک لہک کے بجاتی ہیں ہر طرف بم و زیر

کھچا ہی جائے کہو کیوں نہ دل بسوئے چمن
ہزار رنگ سے دلکش ہے بلبلوں کی صفیر

یہ کی ہے ابرِ بہاری نے قلبِ ماہیت
کہ مثلِ آئینہ دشت و جبل ہیں عکس پذیر

جہاں میں فوجِ خزاں کے لیے بحکم بہار
رکھے ہے موجِ صبا حکمِ برّشِ شمشیر

کیا ہے بادِ بہاری کے فیض نے دیکھو
پہنچ کے چرخ پہ بھی سبز، نورِ ماہِ منیر

زمیں سے نکلے ہیں غنچے کھلے ہوئے دیکھو
ملی ہے بادِ بہاری کو اب کے یہ تاثیر

گلوں کے شاخ پہ، لو عندلیبِ بستاں نے
کیے ہیں برگِ گلِ تر سے آشیاں تعمیر

غرض کہ شرق سے تا غرب، بس تمام زمیں
ہوئی ہے فوجِ بہاری کی یکقلم جاگیر

بہار ہے یہ کوئی یا طلسم ہے کیا ہے
گلوں کے نغمۂ بلبل نے دل کیے تسخیر

یہ جوشِ نشو و نما ہے کہ ہو وہیں پیدا
اُتار لیوے سرِ شمع سے جو گل، گل گیر

صبا نے خاک کو بخشی ہے ہاں وہ عطریت
کہ جس کی بو سے ہے شرمندہ بوئے مشک و عبیر

تمام سطحۂ خاکی ہوا زمرد گوں
اب اس بہار کے عالم کو کیجے کیا تعبیر

وہ روح بخش ہے، بادِ صبا جو چھو جاوے
تو کنکرے جوڑ کے اُڑ جائے بلبلِ تصویر

صبا نے کھولے ہیں گلشن میں گُل کے سی پارے
یہ چہچہے نہیں، پڑھتی ہیں بلبلیں تفسیر

یہاں تلک تو ہوئی دیکھو جلوہ ریز بہار
کہ ذرّہ ذرّہ ہے عالم میں ہاں پُر از تنویر

جہاں میں ہاتھوں پہ جمنے لگی ہے اب سرسوں
یہاں تلک ہوئی بالیدگی کی تو توفیر

ہر اک دکھائے ہے باتوں میں باغ سبز سنا
جہاں میں بادِ بہاری کا فیض ہے یہ کثیر

یہ سُن کے مجھ سے فسانہ بہار کا، دل نے
بگڑ کے سینے میں کی مجھ سے اس طرح تقریر

یہ کیا بہار دو روزہ ہے عیش، ہوش میں آ!
بہار وہ کہ نہ ہو ابتدا کو جس کی اخیر

لگی ہوئی ہے خزاں بھی بہار کے پیچھے
یہ اس بہار کے آگے رکھے ہے حکم شعیر

وہ کیا بہار ہے، یعنی جلوسِ جشنِ حضور
کہ جس بہار سے خوش ہے جواں سے لے تا پیر

وہ کون، یعنی شہِ بو ظفر، بہادر شاہ
سراجِ ملّت و دیں، دادرس، جہاں کا ظہیر

جلوسِ جشنِ مبارک کی اُس کے ہے وہ بہار
کہ یہ بہار نہیں اُس کے آگے عُشرِ عشیر

وہی ہے خسروِ گیتی ستاں، جہاں پرور
اسی کی ذات سے ہے زینتِ کلاہ و سریر

ظہورِ جلوۂ حق ہی نہیں بہارِ جلوس
بہار دیکھ اسے ہو غریقِ بحرِ صد تشویر

ہے اس بہار سے عالم تمام باغ و بہار
زمیں سے تا بفلک اور غنی سے تا بہ فقیر

ہے اُس کے عدل سے یہ اعتدال عالم میں
اُسی کا عدل ہے عالم میں جزو کُل کا دبیر

تو وصفِ عدل میں ہاں اُس کی پڑھ اب اک مطلع
کہ ہو ضعیف و توانا کو وہ بشیر و نذیر

یہ دل سے سنتے ہی بے ساختہ زباں پہ مری
فروغ دہ ہوا یہ مطلعِ پُر از تنویر

مطلع

کسی کے ہاتھ سے پھوٹی کسی کی گر نکسیر
تو اُس کا عدل وہ ہے دیوے اُس کی ناک میں تیر

نہیں مجال جو گُل دل دکھائے بلبل کا
نہیں گُلوں کو اطاعت سے بلبلوں کے گزیر

کرے ہے سروِ چمن قمریوں کی دل جوئی
بٹھاتا سر پہ ہے اپنے، انھیں بصد توقیر

ہزار فیلِ توانا و کوہ پیکر ہو
نہیں مجال جو سمجھے وہ چیونٹی کو حقیر

یہ رعب و داب ہے اُس کا کہ شیر جنگل میں
اُٹھا کے آنکھ نہ دیکھے کبھی سوئے نخچیر

جلائے گر پر پروانہ شمعِ مجلس میں
تو اُٹھ کے شمع کا سر کاٹ لے وہیں گلگیر

چھری چلے نہ گلے پر کبھی ہزار برس ۔۔۔ جو نام اُس کا کوئی لے اٹھے، دمِ تکبیر
سُنا شجاع و بہادر وہ، وہ ہے روزِ نبرد ۔۔۔ جو دیکھے اُس کو تو رستم کا رنگ ہو تغیر
ہے اُس کی ذاتِ مقدّس[1] جہاں میں سایۂ حق ۔۔۔ نہیں جہان میں اُس کا کوئی عدیل و نظیر
مشامِ جان کو بوئے شمیم و لطف اس کی ۔۔۔ گرہ کشائے جہاں اُس کا ناخنِ تدبیر
اُسی کے ابرِ کرم سے جہان ہے سرسبز ۔۔۔ نسیمِ جُود سے اُس کی گدا ہوئے ہیں امیر
عطا کے سامنے اُس کے بخیل ہے حاتم ۔۔۔ ہے ننگ برمکیوں کو کہیں گر اس کا وزیر
کرے ہے مس کو طلا کیمیائے جُود اس کا ۔۔۔ جہاں میں خاکِ در اس کی ہے ہاں پہ اکسیر
ہوئے ہیں فیض سے وہ اُس کے صاحبِ قالیں ۔۔۔ جنھیں کبھی نہ میسّر ہوا تھا فرشِ حصیر
عنانِ خامہ کو پھیر انیسؔ اب دُعا کی طرف ۔۔۔ کہ مدحِ شہ میں زباں معترف ہے بالتقصیر
درِ قبول ہیں وَا اور ندائے فادعونی ۔۔۔ اُدھر سے دم بدم آتی ہے اب نہ کر تاخیر
سو یہ دُعا ترے مدّاح کی ہے صبح و مسا ۔۔۔ قبول ہوئے بدرگاہِ خالقِ تقدیر
جلوسِ جشن مبارک تجھے مُدام شہا! ۔۔۔ رکھے عنایتِ عالی سے اپنی ربِّ قدیر
جو خیر خواہ ہیں تیرے شہا مُدام اُن کا ۔۔۔ خدائے پاک رہے حافظ و معین و نصیر
عدو رہیں ترے پامالِ رنج و حسرت و غم ۔۔۔ انیسِ حال رہے اُن کا نالۂ شبگیر

نہ ہو مزاجِ مقدّس کو تیرے رنج کبھی
بحقِ سورۂ اخلاص و آیتِ تطہیر

قصیدہ در تہنیت جشن و مبارکباد عید الضحیٰ[2] حضور لامع النور جمجاہ شہنشاہ محمد ابو ظفر بادشاہ غازی

ہلالِ عید نے کہتے ہیں یہ دیا ہے پیام (۷) ۔۔۔ کہ ساتھ خیر کے رخصت ہوا ہے ماہِ صیام
کہو کہ قفلِ درِ میکدہ کو کھول کے جلد ۔۔۔ پلادے بادۂ گلرنگ ساقیِ گلفام

۱۔ ل: تقدّس

۲۔ عید الضحیٰ کی جگہ عید الفطر چاہیے

یہ روزِ عید ہے ہاں کر کے میکدے کا طواف — کہو پکار کے اب کھولیں بادہ نوش احرام
وہ دن ہے آج کہ صوفی و شیخ و واعظِ شہر — کریں عمامہ کو اپنے رہینِ بادہ و جام
یہ دن خدا نے دکھایا ہے محتسب سے کہو — کہ آنکھ موند کے پی لے نہ گن حلال و حرام
مزے اڑا کہو زاہد سے میکدے کو چل — خدا کے واسطے کعبے کو کر یہیں سے سلام
یہ میکشوں سے کہو نوشِ جان فرما دیں — بیادِ چشم و دہاں نقل و پستہ و بادام
نسیمِ صبح سے کہہ دو کہ بلبلوں سے کہے — چمن میں غنچہ و گل کے کریں صراحی و جام
یہ حکم ہے کہ خبردار دیکھنا نہ رہے! — شراب خواری سے اس دور میں کوئی ناکام
نہ حکم قاضی کا مانیں، نہ محتسب سے ڈریں — بذوق چین کریں، میکدوں میں مے آشام
چھکا دیں عاشقِ شیدا کو چشمِ میگوں کی — نگاہِ مست سے، ہاں شاہدانِ مست خرام
یہ روزِ عید ہے کہہ دو کریں ہم آغوشی — مےِ نشاط سے بدمست ہو کے گل اندام
ہے اس خبر سے مآل اس کا یہ جہان میں آج — کرے نہ بادہ کشی کے سوا کوئی کچھ کام
یہ سن کے رندِ سبوکش پکارتے ہیں پڑے — خدا غفور ہے ساقی، تو اپنا ہاتھ نہ تھام
کہے تو کہنے دے واعظ کو تو کسی کی نہ سن — مغاں کہے ہے کہ الخمر دافع الاسقام
کھلے ہیں آج یہاں میکدے سب، اے ساقی! — پلا وہ مے کہ معطر ہو جس سے جاں کا مشام
یہ سن کے مجھ سے کہا ایک اہلِ دل نے کہ کیا — بیاں کیا ہے کسی نے یہ تجھ سے حال تمام
کہاں شراب، کہاں میکش، اور کہاں ساقی — یہ کیا کلام ہے بے ہودہ، بس زبان کو تھام
غلط بیان کیا ہے کسی نے یہ تجھ سے — ق — ہلالِ عید نے کل میرے سامنے سرِ شام
ہر ایک جانے ہے یہ بام چرخ پر آ کر — جہان میں ہے سبھوں کو کیا یہی اعلام
سوارِ صبح کو ہوگا نماز کو شہِ دیں — کہ نیک کام کا ہوتا ہے نیک ہی انجام
نماز پڑھ کے وہاں سے بصد خشوع و خضوع — دعائے خیر طلب کر کے وہ بلند مقام
سوارِ قلعہ مبارک کو ہوگا نامِ خدا — بصد شکوہ و بصد حشمت و بصد اکرام

ـه اصل: یہ ہے "ل" سے اصلاح کی گئی

غرض وہ قلعہ میں تشریف لاکے باعظمت | سبھوں کو دے گا بدیوانِ خاص جلوۂ عام
جھکائیں گے درِ دولت پہ اُس کے سر آکر | بڑے بڑے متکبّر جو ہیں بصورتِ لام!
تمام خلق وہاں بہرِ نذر آوے گی | خصوص وہ کہ جو اُس کی طرف سے ہیں حکّام
زیارتِ رُخِ انور کے واسطے کہہ دو | کہ کرکے غسل و وضو آویں سب خواص و عوام
ہر ایک شخص[2] پہ تقلید اس کی فرض ہے کیوں[3] | کہ ہے وہ قبلۂ دیں اور کعبۂ اسلام
بیان واقعی یہ ہے جہاں میں وہ مذکور | کیا جو اور کسی سے تو پائے گا الزام
یہ کیوں کہ عہد ہے اُس شاہِ دیں پناہ کا آج | کہ جس کے عہد میں جاری ہیں شرع کے احکام
یہ عہد وہ ہے کہ یہاں جانتا نہیں کوئی | سوائے صوم و صلوٰۃ و بجز سجود و قیام
جہاں کے صفحہ سے فسق و فجورِ بدعت کا | بس اس کی تیغِ قلم نے ہے کاٹ ڈالا نام
یہ رُعب و داب ہے اُس شہ کا دَور میں اُس کے | مجال کیا کہ کوئی ہووے مرتکب بہ حرام
بحکمِ شرع و دیں قاضی حد کرے جاری | کسی کو کوئی معاذاللہ دیوے گر دشنام
خدا دوام رکھے اُس کا دَور عالم میں | ہے اُس کی ذاتِ مقدّس سے قوتِ اسلام
وہ کون یعنی شہِ بوظفر بہادر شاہ | سراجِ ملّت و پیرِ و شرعِ خیرِ انام
وہ عدل و داد ہے اُس شاہِ دیں پناہ کا عیش[1]! | کہ جس کے نام سے کانپے ہے بیشہ میں ضرغام
تو بے خبر تھا چل اب ہو کے جلد حاضر وہاں | دُعا پر اس شہِ دیں کی کر اُس کا تو اتمام
سو چند شعر دعائیہ کہہ کے لایا ہے! | تری جنابِ مقدّس میں اب ترا یہ غلام
الٰہی کہ ہووے سدا تیری سلطنت کو قیام | یہ جشن و عید مبارک رہے تجھے مادام
رہے جہاں کی ترے ہاتھ میں عنانِ مُراد | بہ زیرِ ران رہے تیری ابلقِ ایّام

ہلالِ عید کا جب تک رہے فلک پہ ظہور
رکاب میں تری حاضر رہے جہان تمام

۱۔ صل: عام ”یل“ سے اصلاح کی گئی ۲۔ ک: یوں
۳۔ یہ شعر لندن کے نسخے میں زائد ہے

قصیدہ در تہنیت عید الضحیٰ بادشاہ ملایک سپاہ جمجاہ محمد ابوظفر سراج الدین بادشاہ غازی

(۸)

عید الضحیٰ کے سنتے ہی ہو مضطر آفتاب — آیا ہے بہرِ طوفِ رُخِ انور آفتاب
تہمد بنا کے تارِ شعاعی کا شرق سے — احرام باندھ آیا ہے ننگے سر آفتاب
دولت سرا کو تیری سمجھ کعبۂ مراد — گرد اُس کے کھا رہا ہے پڑا چکر آفتاب
نکلا ہے ذبح کرنے کو دشمن کا[۱] تیرے آج — خطِ شعاع کا ہاتھ میں لے خنجر آفتاب
تو اے ابوظفر شہِ غازی سراجِ دیں — وہ ہے کہ کعبہ سمجھے ہے تیرا دَر آفتاب
وہ نورِ حق ہے رُخ پہ شہا تیرے جلوہ گر — بن جائے جس کو دیکھ کے بس شپّر[۲] آفتاب
تیری جناب قبلۂ اربابِ صدق ہے — کیوں کر نہ سرنگوں ہو ترے دَر پر آفتاب
تیری طرح کرے نہ کبھی ذرّہ پروری — آوے ہزار سر کا اگر بن کر آفتاب
تیرا تو ذکر کیا ہے غلاموں کی بھی ترے — رفعت میں ہو سکے نہ کبھی ہمسر آفتاب
تو وہ ہے تیرے پرتوِ رُخ سے ہے روشنی — لے لے کے بانٹتا ہے پڑا گھر گھر آفتاب
ہاں بہرِ حاصلِ شرفِ سکۂ حضور — ہر صبح بن کے نکلے ہے قُرصِ زر آفتاب
پڑھتا ہے مدح میں تری گردوں پہ عجز سے — یہ مطلعِ خوش آب شہا اکثر آفتاب

مطلع

منھ دیکھے ترا رُخِ روشن گر آفتاب — سر اپنا تیرے پاؤں پہ دیوے دھر آفتاب
سو افتخار ناز کرے چرخِ چار میں — پہنچے جو بزم میں تری ہو ساغر آفتاب
دیکھو نیازِ فرقِ مبارک کرے ہے ہاں — انجم کے روز صبح کو اُٹھ گو ہر آفتاب
ہاں ہاں جہاں میں نیّرِ اقبال کے ترے — ذرّے وہ ہیں کہ اُن کا ہے اک کمتر آفتاب
گر دیکھ لیوے لمعۂ[۳] رخ کو ترے تو بس — رہ جائے آئینہ کی طرح ششدر آفتاب

۱۔ ل : کو — ۲۔ ل : نثار

۳۔ ک : شمع

باطن کے تیرے نور کا یہ فیض ہے کہ جو
عالم میں اس طرح ہے ضیا گستر آفتاب
پروانہ ہوتا اُڑ کے تری شمعِ بزم کا
مثلِ پتنگ رکھتا جو بال و پرِ آفتاب
نورِ جمال کا جو تیرے جلوہ دیکھ لے
غرقابِ بحرِ شرم کے ہو اندر آفتاب[1]
وہ رُعب و داب ہے ترا شاہا کہ چرخ پر
کانپے ہے مارے ڈر کے پڑا تھرتھر آفتاب
ادنا جہاں میں پرتوِ جود کا ترے
ہے جس کو آنکھ دیکھے، ہے مظہرِ آفتاب
دعویٰ بجا ہے اس کو غلامیِ شاہ کا
یارو! غلط بیان نہیں مو بھر آفتاب
ہم دستِ ماہ شب کو موا ہیر نجم سے
بھجوا چکا ہے ایک بڑا محضر آفتاب
اللہ سے یہ ہی عیشِ سخن ور کی ہے دعا
جب تک رہے فلک پہ جہاں پرور آفتاب
جو جو ترے غلاموں میں ہیں تیرے خیر خواہ
اُن کا رہے جہاں میں بنا نوکر آفتاب
دشمن مٹیں مدام کو یوں تیرے جس طرح
تاروں کا دیوے دن کو مٹا لشکر آفتاب

قصیدہ در تہنیتِ سالگرۂ بادشاہِ کیواں بارگاہ محمد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی

عجب طرح کا ہوا ہے ظہور عالم میں (۹)
کہ آج صبح سے برسے ہے نور عالم میں
ظہورِ جلوۂ انوار ہیں[2] نگاہ کرو
ہر ایک ذرّہ ہے صد رشکِ طور عالم میں
جبینِ صبح کا اعجاز آج وہ ہے کہ یہاں
ہنسے ہے دیدۂ گردوں پہ کور عالم میں
یہ رنگ دیکھ کے حیرت سے آئینہ کی طرح
رہا ہے ایک کو یہاں ایک گھور عالم میں
بیان کیا کروں کیفیت اس قدر ہے کہ آج
ہر ایک دل کو ہے جوشِ سرور عالم میں
یہ جوش دیکھ کے عالم میں مَیں نے دل سے کہا
خوشی کا کیوں ہے یہ اتنا وفور عالم میں

۱۔ ک: مجرم

۲۔ ل: ہو

یہ سُن کے دل نے کہا مجھ سے یہ کہ اے نادان!
نہ ہوگا تجھ سا کوئی بے شعور عالم میں
یہ اُس کی سالگرہ کی خوشی ہے سب جس کو
بصد نیاز کہیں ہیں حضور عالم میں
تو بے خبر ہے، اسی کے تو فیضِ باطن سے
رہا نہ نام کو فسق و فجور عالم میں
وہ کون یعنی شہِ بو ظفر بہادر شاہ
کہ جس کا فیض ہے نزدیک و دور عالم میں
وہ فیضِ عام کہ پرتو سے جس کے نام کو بھی
نہیں رہا ہے دلِ ناصبور عالم میں
کیا یہ اُس کی سخاوت نے سب کو مستغنی
نہیں کسی کی کسی کو ضرور عالم میں
یہ زورِ عدل ہے اُس کا، کہ جس کی قوت سے
ہے پچھاڑ ڈالے ہے ہاتھی کو مور عالم میں
خدا نے دی ہے اُسے وہ شجاعتِ ذاتی
کہ جس کے نام سے کانپے ہے سُور عالم میں
اسی کی تیغِ سیاست نے تو مٹائے ہیں
پڑے ہوئے تھے یہ جو جو فتور عالم میں
کلیں ہیں آکے جبینِ نیاز اُس در پر
بڑے بڑے ہیں جو اہلِ غرور عالم میں
یہ سُن کے عیش نے مانگی دُعا بعزت و جاہ
رکھے ہمیشہ اُسے ربِّ غفور عالم میں
الٰہی ہوسے سدا یوں ہی اس کی سالگرہ
یہ جب تلک ہیں سنین و شہور عالم میں
فروغ بخش رہے اس کا نیّرِ اقبال
نسیم کا ہے جب تک مُرور عالم میں
قیام سلطنت اُس شاہ کا رہے جب تک
چلے الٰہی قبول و دبور عالم میں
وظیفہ خور رہیں سب، اُس کے خوانِ بخشش کے
ہے گرم چرخ کا جب تک تنور عالم میں

قصیدہ در شکریہ[1]

(۱۰)

نہ کیوں ہو تیری عنایت کا مجھ کو شکر ضرور
کہ تیرا شکر ہے بس عین، شکرِ ربِّ غفور
ادائے شکر ترا گرچہ غیر ممکن ہے
مگر میں حکمِ الٰہی سے ہوں شہا معذور[2]

۱۔ بہادر شاہ ظفر کے شکریہ میں

۲۔ مضامین فرحت (۲: ۱۹۸) : مجبور

کہ اُس نے خود لَاَزِیدَنَّکُم ہے فرمایا ۔۔۔ تو ہو چکے ہیں ہم اس کام کے لیے مامور
اسی سبب سے زباں پر ہے نامِ شکر نہیں ۔۔۔ یہ تاب ہے کہ کرے دعوتِ سلیماں مور
ادا ہو شکر یہ کس طرح واقعی سچ ہے ۔۔۔ کہ ہے زبان تو ایک اور نعمتیں بہ وفور
عنایتیں ہیں تری لاتعداد ولا تحصیٰ ۔۔۔ زبان کیا ہے کہ جو اُن کو کر سکے محصور
ادائے شکر کا لوں نام میرا کیا منھ ہے ۔۔۔ بَر آؤں عہدے سے اُس کے سو یہ تو کیا مذکور
سبب ہے وسعتِ رحمت کا تیری یہ بھی شہا! ۔۔۔ نہیں زبان مری اور نامِ شکر، کیا مقدور

ق

ادائے شکر تو معلوم، سرگزشت اپنی ۔۔۔ بیان کرتا ہے تھوڑی سی یہ غلامِ حضور
نہ ہوتی تیری حمایت تو میرا شیشۂ دل ۔۔۔ کیا تھا سنگِ حوادث نے صاف چکنا چور
ہجومِ غم سے یہی بس فلک نے چاہا تھا ۔۔۔ کہ میرے دل کو بنا دیوے خانۂ زنبور
مگر تفقدِ عالی نے تیرے ہی شاہا! ۔۔۔ گزند اُس کا رکھا میری جان و تن سے دُور
بچا ہوں تیرے کرم سے، نہیں فلک کو مرا ۔۔۔ ہوا تھا سُرمہ کی مانند پیسنا منظور
کیا تھا اُس نے غرض اس جہاں کے عرصے کو ۔۔۔ ترے غلام پہ بس تنگ مثلِ تنگیِ گور
یہ تیرے عدل نے اُس کو بنا دیا سیدھا ۔۔۔ چلا تھا ٹیڑھ[1] کی مجھ سے وہ کجرو مغرور
بچا ہوں نیکیِ نیت سے میں تری ورنہ ۔۔۔ بدی میں اپنی تو اُس نے نہیں کیا تھا قصور
یہ چرخِ شعبدہ گر میرے روزِ روشن کو ۔۔۔ بنانا چاہتا تھا خسروا شبِ دیجور
یہ آفتابِ عنایت کے تیرے پَرتو سے ۔۔۔ بسانِ شب پرہ کے رہ گیا بسُور بسُور
شہا ترے ہی شفاخانۂ عنایت سے ۔۔۔ جہان جانے ہے اچھا ہوا ہے یہ رنجور
اور اُن عنایتوں کے ماسوا ہوا یہ کرم ۔۔۔ نہ کیوں کہ عرض رسا ہوں بحکمِ فیضِ نشور
ملا علوفہ ترے خانہ زاد کو شاہا! ۔۔۔ تصدقِ سرِ اقدس، موافقِ دستور
علاوہ اس سے عنایت ہوئی غلام پہ شے ۔۔۔ کہ جس کا حال ہے اس قطعہ میں ہوا مذکور
جنابِ میرزا فرخندہ شہ کی خدمت میں ۔۔۔ کیا حضور نے جب خانہ زاد کو مامور

۱- ل : بھڑکے

۲- ل : پھر

تو یے کے ہند سے تا چین وچین سے تا بفرنگ
وہاں سے روم تک اور وہاں سے تا بہ نیشا پور

ترا حکیم، ترا خانہ زاد اور تیرا مدّاح
ہوا ہے مُلکوں میں اِس اِس لقب سے یہ مشہور

میں کس زبان سے اس کا ادائے شکر کروں
ادائے شکر میں ہوں پہلے معترف بہ قصور

مگر یہ بات کہ مانگوں دُعا خدا سے شہا[1]
رہیں غلام ترے شاد اور عدو مقہور

وظیفہ خور رہیں سب تیرے خوانِ بخشش کے
حساب میں رہیں جب تک کہ یہ سنین و شہور[1]

قدم سے تیرے رہے تختِ سلطنت روشن
یہ آفتاب کا جب تک رہے فلک پہ ظہور

دُعا ہے عیش کی حق سے یہی، رہے قائم
جہان میں ترا جلوہ بحقِ سورۂ نور

قصیدہ در مدح میرزا شاہ رخ بہادر[2]

(۱۱)

کروں جو صفحۂ کاغذ پہ تیری مدح رقم
عجب نہیں ہے کہ ہو دُر فشاں زبانِ قلم

ز فیضِ عام ہو کس طرح تیرا عالم میں
خدا نے تجھ کو بنایا ہے صاحبِ عالم

ترا وہ رُتبۂ عالی ہے شاہ رُخ مرزا!
نہ ہو سکے ترے ہم جنب رتبہ رتبۂ جم

مناسبت دوں بھلا کس سے تیری رفعت کو
فلک بہ ایں ہمہ رفعت ہوا ہے دیکھ کے خم

بیانِ قدر ترا ہوئے کس طرح مجھ سے
تیری وہ قدر رہے عالم میں اے سپہر حشم[3]

اگر بنائے ترازو فلک بہ ایں صورت
کہ ماہ و خور کو کرے لے کے کہکشاں سے بہم

وہ دونوں پلڑے ہوں اور خطِ کہکشاں ڈنڈی
یہ پوچھو جس سے ترازو ہے وہ کہے کہ نعم

بنائے چوٹی ترازو کی عقدِ پرویں کو
کہ ہونا اُس کا اٹھلنے کے واسطے ہے اہم

شعاعِ مہر سے بل دے کے ڈوریاں ڈالے
وہ کر چکے اُسے جب خوب اس طرح محکم

۱۔ ک : شعور
۲۔ عنوان، اضافہ از مرتبہ
۳۔ ک : حشم

تو تیری قدر سے سارے جہاں کی قدر کو پھر ۔۔۔ کرے موازنہ تو بھی ہو تیری قدر سے کم
تری شجاعتِ ذاتی کا کیا بیان کروں ۔۔۔ نہ کانپے آگے ترے آتے کس طرح ضیغم
خواص نام کا تیری وہ ہے کہ روزِ نبرد ۔۔۔ کسی کے سر پہ عدو آئے کر جو تیغ علم
عدو وہ ہووے بہادر کہ جس کا نام اگر ۔۔۔ سنے تو سنتے ہی غش کھا کے گر پڑے رستم
ارادہ اُس کا یہ ہووے، کہ ایک وار میں، میں ۔۔۔ لگا نہ رہنے دوں تسمہ کروں سر اُس کا قلم
یہ اُس کو دیکھتے ہی اپنی حفظِ جاں کے لیے ۔۔۔ زباں پہ نام ترا لائے اے بلند ہمم!
اِدھر یہ نام ترا لے، کہ بس اُدھر اُس کی ۔۔۔ رواں ہو جان بدن سے، نکل کے سوئے عدم
تری وہ تیغ ہے، ہو برق جس سے شرمندہ ۔۔۔ وہ تیغِ ابروے دلبر ہو جس کو دیکھ کے خم
اُسے جو کھینچ کے میداں میں تو بروزِ وغا ۔۔۔ کرے اشارہ پئے قتل اور کہے کہ نہ تھم
کرے وہ ایک کے دو، دو کے چار، چار کے آٹھ ۔۔۔ وہ دس کے بیس کرے، بیس کے دو چند اک دم
اب آگے اُس کی صفت کیا کروں عدو کے لیے ۔۔۔ ہے وہ قضائے مجسم نہیں ہے تیغِ دو دم
تری سواری کا گلگونِ خوش خرام وہ ہے ۔۔۔ سمندِ ناز کا ہو بند جس کو دیکھ کے دم
ہرت پھرت میں وہ گل پھل ہے اُس کی نام خدا ۔۔۔ کہ جس سے ہووے خجل شوخیِ نگاہِ صنم
میں کیا کہوں کہ وہ ہے کسی قدر سریع السیر ۔۔۔ ہوا نہ پہنچ سکے اس کے تا بہ گردِ قدم
وہ گردن اُس کی کہ طاؤسِ باغ بھی اُس کو ۔۔۔ جو دیکھ لیوے تو ہو جائے غرقِ بحرِ ندم
اور اُس پہ چھوٹی ایال اس طرح کی ہے کافر ۔۔۔ کہ جس کے پیچ میں آجاوے دیکھ زلف کا خم
کرے یہ پیکِ خیال اس کے ساتھ قصد اگر ۔۔۔ چلوں میں دوڑ کے اور وہ چلے قدم تھم تھم
یہ ایک بار نہ طے کر سکے وہ عرصہ کہ وہ ۔۔۔ کرور بار اُس عرصے کو طے کرے باہم
جو خوبیاں ہیں سب اُس میں ہیں اور اُس کا نام ۔۔۔ کوئی کہے ہے فلک سیر، اور کوئی ہمدم
تری سواری کا ہاتھی سُن اے خجستہ سیر! ۔۔۔ نہیں ہے شوکت و رفعت میں کچھ سپہر سے کم
جھمکی ہیں اُس کی جو دونوں طرف سے گجگائیں ۔۔۔ بس اُس کو دیکھ کے ہر ایک کو یہی ہے بھرم
کہ رات اندھیرے میں گردوں سے کہکشاں شاید ۔۔۔ لٹک پڑے ہیں زمیں پر برائے طوفِ حرم
اور اُس کے ہودے میں، اور جھول میں جواہر جو ۔۔۔ نصب ہیں، اُس کا یہ نظروں میں سب کی ہے عالم

جواہرات نہیں جانتے یہ سمجھے ہیں ! اندھیری رات میں تارے جھلکتے[1] ہیں جھم جھم
سوار اُس پہ جو تو ہو تو طُور پر جلوا ہوا ہے بارِ دویم یہ گماں کرے عالم
کسی کو ہوئے گماں یہ کہ ہے یہی شبِ قدر بلا مبالغہ کہتا ہوں اے سپہر حشم
سمجھتے اُس کو ہیں ہندو کہ ہے گنیش[2] یہی نہ پوجیں اُس کو بھلا کیونکہ ہے وہ اُن کا دھرم
خدائے پاک نے ہاں جُود و عدل دونوں کو کیا ہے تیرے مزاجِ شریف میں توام
ترا وہ عدل ہے گر دیکھے شیر بکری کو تو پڑھ کے سورۂ اخلاص اُس پہ کر دے دم
جہاں میں بھاگ گئے ہے بیداد تیرے نام سے یوں کہ جیسے دیکھ کے سورج کو دانۂ شبنم
یہاں تلک تو ترا عدل ہے کہ بادِ صبا نہیں مجال کہ زلفِ بتاں کرے برہم
غرض جہاں میں یہاں تک ہے امن و آسائش کہ جانتا نہیں کوئی کہ کیا ہے جور و ستم
ترا سحابِ کرم وہ ہے ابرِ نیساں سے مناسبت دوں بھلا کیونکہ اے خجستہ شیم
وہ ایک فصل میں بخشے ہے سیپ کو گوہر ترا مدام گہر ریز ہے سحابِ کرم
مناسبت تجھے نوشیروان و حاتم سے میں جُود و عدل میں گر دوں جہاں میں ہو مجھ دم
اگرچہ کہتے ہیں وہ بھی کریم و عادل تھے یہ تیری ذاتِ مقدس ہے اعدل و اکرم
تری وہ ذات ہے اللہ نے لطف و جُود ترا بنا دیا ہے دلِ ریش کے لیے مرہم
جہاں میں دستِ نگر ہیں ترے سب اہلِ سخا وظیفہ خواہ ہیں تجھ سے جہاں میں اہلِ کرم
یہ انتظام ہے تیرا کہ مارے ڈر کے ترے فلک نے نام کو چھوڑا نہیں جہان میں غم
گلِ امید شگفتہ ہیں آج یہاں تک تو کہ ہے زمیں سے فلک تک بہار کا موسم
کھلے ہیں غنچۂ دل اس قدر کہ صفحۂ خاک نسیمِ لطف سے تیری ہوا ہے باغِ ارم
گرفتہ دل نہیں عالم میں الغرض کوئی ہوا ہے عُقدہ کُشا بسکہ تیرا فیضِ اتم

۱۔ ک : چمکتے
۲۔ تینوں نسخوں میں "گنیش" سے پہلے لفظ "یہی" درج ہے۔ یہ لفظ "یہی" اگر گنیش کے بعد لکھا جائے تو مصرع موزوں رہتا ہے۔ سابقہ صورت میں وزن سے خارج ہوا جاتا ہے۔

ترے ہی ناخنِ تدبیر سے جہاں میں آج / کھلے ہیں عقدۂ کارِ جہاں خدا کی قسم
اب آگے عرض مری تجھ پہ آپ روشن ہے / زباں پہ نہیں لایا اِسی سے ہے مُبہم
پر اتنی عرض ضروری ہے سب رہیں سرسبز / میں تشنہ کام رہوں ایک اے سحابِ کرم
دعا پہ کرتا ہوں اب آگے عیش ختم کلام / خدا رکھے تجھے باصد شکوہ وجاہ و حشم
جو خیر خواہِ دولت میں ہیں ترے وہ ہمیش / رہیں خدا کی عنایت سے ہاں خوش و خرّم

ترے عدو ترے بدخواہ اور ترے حاسد
رہیں جہاں میں سدا مبتلائے رنج و الم

قصیدہ در مدح محمد ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہِ غازی[1]

(۱۲)

لکھے ہے باخطِ گلزار اشتہار اب کے / زمیں کے صفحہ پہ یوں واقعہ نگار اب کے
نسیم لائی ہے گلشن میں وہ بہار اب کے / کہ حکمِ گل کا رکھے ہے ہر ایک خار اب کے
یہاں تلک تو لطافت ہے دیکھو عالم میں / صفا پہ مارے ہے چشمک پڑا غبار اب کے
جہاں کے باغ میں ہر موجۂ نسیم بہار / خزاں کے واسطے تلوار کی ہے دھار اب کے
یہ وہ بہار ہے ہاں ہاں کہ چرخِ اعظم پر / زمیں بجا ہے کرے جو جو افتخار اب کے
خدا زیادہ کرے اہلے گہلے گلشن میں / چہکتی[2] پھرتی ہے کیا عندلیبِ زار اب کے
صبا جہان میں ہے اس قدر لطافت بخش / کہ صاف سنگ کے ہوتی نظر ہے پار اب کے
یہ فیضِ ابرِ بہاری کا ایک شمّہ ہے / کہ سبزہ رنگ ہے ہر ایک گلعذار اب کے
چمن میں آئینہ رویوں کے آبِ رخ سے سوا / ہر ایک گل نظر آتا ہے آبدار اب کے

۱۔ درجِ ذیل قصیدہ میں بنیادی نسخے اور کراچی کے نسخے کے اشعار برابر ہیں۔ لندن کے نسخے میں سات اشعار زائد ہیں۔ ترتیبِ اشعار میں بھی اختلاف ہے۔

۲۔ ل : چہکتے پھرتے ہیں

سنا ہو آگ سے بھاگے ہے جس طرح سیماب — خزاں جہان سے یوں کر گئی فرار اب کے

نہ دیکھا ہووے گا چشمِ فلک نے عالم میں — وہ ہے عروسِ چمن نے کیا سنگھار اب کے

نہ پوچھو کیا کہوں ابرِ بہار کا جلوہ — پڑے ہے چاروں طرف نور کی پھوہار اب کے

صبا جہان میں چاروں طرف ہے عنبر بیز — نسیم صبح ہے عالم میں مشکبار اب کے

عجب طرح کا ہے کچھ جلوۂ بہار یہاں — ہوا ہے غیب کے پردے سے آشکار اب کے

جو حد و حصر ہو اُس کا تو کچھ بیان کیجے — بہشت کہتے ہیں دوزخ کو اہلِ نار اب کے

جو یہ ہی آمدِ فصلِ بہار ہے تو یہاں — کسی کو دل پہ نہ رہوے گا اختیار اب کے

جنوں کے ہاتھ سے اس فصل میں یقیں مجھو — رہے گا ہو کے گریبان کا تار تار اب کے

میں کیا بیان کروں مستیِ بہار کا رنگ — غرض صغار سے ہیں مست تا کبار اب کے

قیاس اسی پہ کیا چاہیے کہ صوفی کے — ق — یہاں تلک ہے حواسوں میں انتشار اب کے

کہ ایک جرعۂ مے کے لیے سرِ بازار — وہ ساتھ رندوں کے کرتا ہے تُو تکار اب کے

وہ کُوٹ کُوٹ کے مے میں بھری ہے کیفیت — کہ گھس لگانے کو ڈھونڈے نہیں خمار اب کے

نہ ہو گا پاس، اگر کچھ تو جامِ مے کے لیے — رکھے گا دیکھیو زاہد گرو ازار اب کے

عمامہ شیخ کا رندوں سے کچھ بعید نہیں — یہ لطف دیکھ کے لیویں اگر اُتار اب کے

رہے نہ ہوش بجا عقل ہو گئی حیراں — جہاں میں دیکھ کے یہ جلوۂ بہار اب کے

کہا یہ دل نے خدا جانے اس کا کیا ہے سبب — کہ اس ترا[1]قی پہ ہے رنگِ روزگار اب کے

خیال دل میں یہ آتے ہی بس نقیبِ بہار — لگا پکارنے، ہو جاؤ[2] ہوشیار اب کے

سراجِ دین بہادر شہِ بلند مکاں — ہوا ہے سیرِ چمن کے لیے سوار اب کے

یہ اُس سے سنتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں، سوچا — یہ لطف اسی سے ہوا ہے بروے کار اب کے

بنا ہے جعدۂ سنبل یہ مژدہ سنتے ہی — چمن میں غیرتِ صد نافۂ تتار اب کے

۱۔ ل: ترقی

۲۔ ل: ہوجائے

لو یدِ مقدمِ شہ شن کے عندلیبِ چمن — لیے پھرے ہے گلوں کو پئے نثار اب کے
سمجھ حصولِ قدم بوس اس کا فخر اپنا — فلک سے رگڑے ہے سر، سرو جوئبار اب کے
یہاں تلک تو خوشی ہے گلوں کو گلشن میں — نہیں رہا غمِ آسیبِ روزگار اب کے
پئے نشاط سے پُر ہے صراحیِ غنچہ — بنا ہے ساغرِ گل جامِ قدح خوار اب کے
نہیں خمیدہ فقط شاخِ گل پئے تعظیم — جھکے ہیں بہرِ زمیں بوس رُد بکار اب کے
گلوں کو بلبلِ شیدا سے صلح خواہی ہے — نیا یہ لطف ہے عالم میں برگ و بار اب کے
نہیں خموشی کی جا عیش ہاں بطورِ غزل — سنا حضور میں تو شعر پانچ چار اب کے
مطلع
نہیں جہان میں کوئی بھی دلفگار اب کے — غرض کہ رشکِ گلستاں ہے خارزار اب کے
نہیں کسی کو شکایت کسی کی عالم میں — بلا مبالغہ کہتا ہوں ذرّہ دار اب کے
یہ راہِ راست پہ ہے گردشِ فلک کوئی — نہیں جہان میں برگشتہ روزگار اب کے
اب آگے کیا کہوں یہاں تک تو ہے کہ سیدھی تھی — برشتہ جانوں سے مژگان و زلفِ یار اب کے
تری ہی ذاتِ مقدس کے فیض کے باعث — ملا ہے چرخ کو یہ رنگِ اعتبار اب کے
کرے کے شرق سے تا غرب کیجیے گر غور — پُر از بہار ہے ہر ملک و ہر دیار اب کے
ہے تیرے فیض سے یہاں تک ہوئی سبک دوشی — کسی کے دل پہ کسی کا نہیں ہے بار اب کے
یہ فیض عام ہے تیرا کہ تیری بخشش سے — ہوا ہے چرخۂ مفلوک مالدار اب کے
ہے تیری صیتِ عدالت کا یہاں تلک شہرا — کہ عندلیبوں کو گل بھی کریں ہیں پیار اب کے
یہی سبب ہے کہ یوں قمریوں کو گلشن میں — کیا ہے سرو نے اپنے گلے کا ہار اب کے
ہر اک بشر کو ترے عہد میں ہے آسایش — جو لیجے نام ستم ہے یہ ننگ و عار اب کے
خلاصہ اس کا یہی ہے کہ گردشِ افلاک — ہے تیرے ڈر سے جہاں میں بیک قرار اب کے
پر اک کھٹر پچ ہے مجھ سے کہ اس[1] جینے میں — یہی کہے ہے کہ تو خرچ کر ادھار اب کے
اور اس[2] کے ساتھ ملانے کو ہاں میں ہاں دیکھو — ہوئے ہیں یک صد و ہفتاد و پنج بار اب کے

۱۔ پر اک کھٹر پچ ہے مجھ سے کہ دو مہینے سے

۱۔ یہ اور بعد کے چار اشعار بنیادی نسخے میں درج نہیں۔ ل، سے شامل کیے گئے۔

سو کاٹ لیتے ہیں سرکار سے تبرک جو — ملے ہی اس کو، مہینے ہوئے ہیں چار اب کے
نہ ڈر خدا کا، نہ دہشت تری معاذ اللہ — غرض بڑے متدیّن ہیں اہلِ کار اب کے
اگر ہیں ڈھنگ یہی ان کے اور یہی کوتک — تو دل میں اپنے وہ یہ کر رکھیں بچار اب کے
دُعا کا تیر ہے واللہ نہیں یہ ڈوم کا تیر — ہوا ہی سمجھیں یہ جان و جگر کے پار اب کے
سو داد خواہ میں ہوں تجھ سے ان کے کانوں کو — مروڑ دے تو ذرا شاہِ نامدار اب کے
نہ دے گا داد اگر تو تو ہے امیدِ قوی — کہ ان کو چھوڑ نہ دیوے گا کردگار اب کے
زیادہ اور تو میں کیا کہوں، یہی ہے جی کہتا — نہ ہوں یہ تیرِ بلا کے اگر شکار اب کے
اب اور کیا کہے کرتا ہے یہاں ترا مدّاح — تری دعا ہی یہ بس اس کا اختصار اب کے
اگرچہ دل سے دُعائے خفی ہے وِرد اس کا — پر اس بہار میں ہے یوں اُٹھا پکار اب کے

الٰہی حشر تلک رہوے تو سریر آرا!
زیادہ اس سے ہو ہر دم، ہے جو بہار اب کے

قصیدہ در تہنیتِ غسلِ صحت بادشاہ کیواں بارگاہ محمّد ابو ظفر سراج الدّین بہادر شاہ

(۱۳)

نسیمِ صبح نے دی آج وہ خوشی کی ترنگ — کہ غنچہ ہائے دلِ بستہ کھل گئے گل رنگ
گرہ کشائیِ کارِ جہاں ہوئی یہاں تک — کہ باغِ دہر میں غنچے تلک نہیں لب تنگ
خوشی کی جھولیاں بھر بھر کے بھیجتی ہے صبا — نسیمِ صبح جہاں میں بھر بہار النگ
نویدِ تازہ طرب ریز ہے ہر اک دل میں — یہ رَے کے ہند سے تا چین و چیں سے تا بہ فرنگ
عجیب طرح کا ہے انبساط عالم میں — کہ چہچہے میں ہیں سب بلبلانِ خوش آہنگ

لے یہ اور بعد کا شعر اس، میں نہیں، ''ل'' سے لیے گئے۔

وہ تن نزار جو تھے بارِ غم سے دنیا میں ۔۔۔ سو آج فرطِ خوشی سے وہ ہو گئے ہیں دبنگ
یہ جھک کے خندۂ قلقل کہے ہے ۔ اغ سے ۔۔۔ بھری ہے شیشے کے دل میں خوشی کی اور امنگ
جنھیں تعلقِ دنیا نہیں اب اُن کا ۔ ی ۔۔۔ یہ انبساطِ خدا داد سے ہوا ہے ڈھنگ
کہ عینِ وجد میں موجیں خوشی کی آتی ہیں ۔۔۔ بشکلِ لمعۂ انوار دل میں رنگ برنگ
یہ جوشِ فرحتِ بے حد ہے اہلِ فقر میں آج ۔۔۔ کہ بس خوشی سے زمیں پر اچھل رہے ہیں ملنگ
چمن میں شاخوں کو گل کے بہم ہیں یوں خم و چم ۔۔۔ کہ جوں پھکیت کھڑے ہو کے پھینکتے ہیں اپانگ
یہ انبساط ہوا ہے کہ شمع ہنستی ہے ۔۔۔ خوشی سے گرد پڑا اس کے ناچتا ہے پتنگ
یہاں تلک تو خوشی کا ہے جوش عالم میں ۔۔۔ کہ گنجفہ باز بھی کھیلے ہیں گنجفے میں رنگ
بیاں کروں میں کہاں تک بھلا وفورِ نشاط ۔۔۔ ہر ایک دل میں بھری ہے یہاں خوشی کی اُچنگ
دکھایا بادِ بہاری نے اب کی عالم وہ ۔۔۔ کہ جو جہان میں دیکھا نہ تھا کبھی نیرنگ
غرض کہ دیکھ کے عالم میں یہ خوشی ہر سو ۔۔۔ بسانِ آئینہ حیرت سے رہ گیا میں دنگ
یہ دل میں کہتا تھا یارب، خوش ایسا کون ہوا ۔۔۔ خوشی سے جس کی ہر اک دل میں ہے خوشی کی امنگ
یہ فکر[1] تھا ہی کہ بس آئی گوشِ دل میں صدا ۔۔۔ کہ تو بھی خوش ہو نہ کر دیکھ اس خوشی میں درنگ
خوشی سے اس کی ہوئی ہے خوشی یہ عالم میں ۔۔۔ نسیمِ فیض سے جس کے ہے گل کو آب و رنگ
وہ کون، یعنی شہِ بوظفر سراج الدین ۔۔۔ کہ جس کے فیض کو یہ عرصۂ جہان ہے تنگ
وہ ہے شہنشہِ عادل، کہ عہد میں جس کے ۔۔۔ مجال کیا جو کوئی لا سکے کسی سے جنگ
یہ عدل اس کا ہے پالے ہے شیرِ بکری کو ۔۔۔ گلے لگا کے سُلا رکھے ہے ہرن کو پلنگ
یہ اس کا رعب ہے، ممکن نہیں جو چھیڑ سکے ۔۔۔ اک آشیانے میں رہتے ہیں مل کے باز و کلنگ[2]
وہ عادل ایسا کہ نوشیروانِ عادل کا ۔۔۔ نہ ہوئے عدل کبھی اس کے عدل کا پاسنگ
سخاوت ایسی کہ ادنیٰ دکا اس کے سبزہ فروش ۔۔۔ جو مانگے ایک بَرِ کھ دے اُسے وہ صوبہ بنگ

۱۔ لفظ فکر مذکر استعمال کیا ہے

۲۔ ک : پلنگ

خدانے اس کو عطا وہ کیا ہے بارِ وقار — سبک ہے کوہِ گراں اُس کا ہاں نہیں ہم ہنگ

خدانے بخشا ہے بس اُس کو وہ دلِ بیدار — کہ جس کے فیض سے ہر اک جہان میں ہے پینگ

وہ بارگاہ ہے اُس کی کہ شاہِ چین و فرنگ — ہے اُن کا فخر جو وہ اس کے در کے ہوں سرہنگ

خوشی جہاں میں ہے یہ اس کے غسلِ صحت کی — یہاں سے چاروں طرف بس کہ دوڑا فرسنگ

یہ سنتے ہی میں گیا اُس کی بزمِ عشرت میں — تو دیکھا جا کے خوشی کا وہاں عجیب ہے ڈھنگ

کہ سارے جمع ہیں اُس جا، نشاط کے ارباب — سو اُن کی شرح کروں تا کجا کہ عقل ہے دنگ

الاپتا ہے کوئی بھیروں، کوئی رام کلی — کوئی بہباس کوئی توڈی اور کوئی سارنگ

جو گانے والے ہیں ٹپّوں کے اُن میں گاتا ہے — کوئی جھنجھوٹی، کوئی بردہ، اور کوئی ملنگ

یہ گا رہا ہے بس اُس بزمِ عشرت افزا میں — کوئی خیال، کوئی دھرپت اور کوئی چترنگ

بجا رہا ہے کوئی بین، اور کوئی قانون — کوئی رباب بجاتا ہے اور کوئی چنگ

ہوا زمیں پہ جب اس طرح سے خوشی کا وفور — تو پہنچی چرخ پہ زُہرہ کے کان میں بھی بھنگ

یہ کر کے ساز دُرست اپنے وہ ثنا حاضر — ہوئی حضور میں مجرے کے واسطے اس ڈھنگ

شعاعِ مہر سے طربیں ملا کے سارنگی — لگی وہ چھیڑنے قوسِ قزح[1] سے رنگ برنگ

یہ نغمہ سازی تو دیکھو کہ بُرجِ عقرب کو — بنا کے لائی ہے بزمِ طرب میں وہ موچنگ

عجیب لطف ہے سنگت میں وہاں بجاتے ہیں — پکھرا پڑے مہ و خورشید کی بنا مردنگ

بنا کے جوڑی مجیرے کی نسرِ واقع کو — یہ شعر عیش کے وہ گا رہے ہیں خوش آہنگ

مُدام رہوے سلامت تو شاہِ[2] با فرہنگ — قدم سے ہے ترے ہی زیب و زینت اور رنگ

ہو تیرا مصقلہ فیض سب کا زنگ زدا — کبھی نہ آئینۂ دل پہ تیرے آوے زنگ

دُعا یہی ہے شہا، تیری بزمِ عشرت میں — مُدام دور میں ہو، جامِ بادۂ گُل رنگ

وہ شاد کام رہیں جو ہیں تیرے دولت خواہ — رہے ہمیشہ عدو تیرا وقفِ کامِ نہنگ

۱۔ ک : فرح

۲۔ ک : بادشاہِ فرنگ

عدو کے واسطے مدّاح کا ترے خامہ ۔۔۔ کبھی ہو[1] نیزہ، کبھی تیر، اور کبھی ہو تفنگ
الٰہی رہوے جہاں میں یہ جب تلک جاری ۔۔۔ زمیں کی سطح پر آبِ جمن اور آبِ گنگ
شگفتہ ہو بسرِ شاخ غنچہ جب تک اور ۔۔۔ ترانہ سنج رہیں بلبلانِ خوش آہنگ
رہے یہ زیرِ نگیں تیرے ہند سے تا چین ۔۔۔ بس اور چین سے تا روم و روم سے تا زنگ

غرض دعا ہے یہی عیش کی شہا، کہ مدام
قدم سے تیرے رہے زیب و زینتِ اورنگ

تمام شد در ۱۲۵۹ھ

---

[1] ک: ہے

قطعۂ مدحیہ[1]

ہے سخا پیشہ، مروّت آئیں   یعنی خوش طینت و فرخندہ جبیں

خوش طبع خوش روش و خوب مزاج   ذی حیا صاحب و فخرِ تمکیں

عاقل و ذی خرد و اہلِ شعور   رحم دل باذل و دانش آگیں

مردِ دیانت و پسندیدہ خصال   مونسِ حالِ غریب و مسکیں

مرد اشراف و جوانِ خوش خلق   فرح بخشِ دل و جانِ غمگیں

کون وہ یعنی کہ فورٹ صاحب   جس کا ثانی کوئی دنیا میں نہیں

دوست پرور ہے وہ اور دوست نواز   ہے وہ احسانِ مجسم بزمیں

خوش قلم، خوش رقم و خوش لہجہ   خوش بیاں، قابلِ مدح و تحسیں

ساتھ ان جوہروں کے رکھتا ہے   طبعِ موزون و مزاجِ رنگیں

ہے وہ اے عیش سراپا (اخلاق)
اس کا حق رہوے مددگار و معیں

[1] یہ قطعہ "ن" کی ردیف میں شامل تھا، اسے قصائد کے آخر میں جگہ دی گئی۔

دیوان دوم

الف

(۱)

قدرت سے اپنی مردوں کو زندہ کرے گا تو مالک ہے خالقا تو ہی یومِ نشور کا[1]

ابرِ کرم سے اپنے تو دھو دے مرے کریم!
اعمال نامہ عیشؔ کے فسق و فجور کا

(۲)

مدّاح خود خدا ہے رسولِ کریم کا
رتبہ ہے یہ مخاطبِ خُلقِ عظیم کا

والشمس اس کے ہی رُخِ روشن کی ہے صفت
واللیل وصف کاکلِ عنبر شمیم کا

رحمت ہے عالموں کے لیے اس کی ذاتِ پاک
مخزن ہے وہ ہی حق کے تو فیضِ عمیم کا

اللہ نے اس کی ذاتِ مقدّس کو خلق میں
اسرار داں کیا ہے الف لام میم کا

وہ، وہ جناب ہے، کہ جسے دو جہان میں
ہادی کیا ہے حق نے رہِ مستقیم کا

---

[1] دیوان دوم کا مخطوطہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہے۔

اس نام کے نثار ہو، سو جان سے کیوں نہ دل
ہے فرح بخش نام وہ جانِ سقیم کا
اللہ، وہ غفور، رسول اس کا، وہ شفیع
کیوں دغدغہ ہو عیش کو نارِ جہیم کا

(۳)

دکھائے رنگ چرخِ دوں نے ہر شام و سحر کیا کیا
اٹھائے شعبدے ہر دم بہ اندازِ دگر کیا کیا
یہ سرگرداں ہیں دیکھو رات دن شمس و قمر کیا کیا
پھرایا اہلِ جوہر کو فلک نے در بدر کیا کیا
بہے اشکوں میں مل خونِ دل و لختِ جگر کیا کیا
ملائے چشمِ تر نے خاک میں لعل و گہر کیا کیا
پھٹا ہے جیب و دامن تا جگر دل ٹکڑے ٹکڑے ہے
سیے گا آن کر فرماؤ تو یاں بخیہ گر کیا کیا
خدا جانے کہ اس دل میں ہوا کیا آہ کو اپنی
وگرنہ اس سے پہلے اس میں تھے یارو اثر کیا کیا
جلایا خیمۂ گردوں تلک تو آہِ سوزاں نے
اٹھائے گی یہ اب طوفان دیکھیں چشمِ تر کیا کیا
ہمارے حالِ سوزِ دل کو سن شب بزمِ جاناں میں
کفِ افسوس کو مل کر دھنا کی شمع سر کیا کیا
دل و جان و جگر تاب و تواں صبر و شکیبائی
کیا الفت میں ہم نے وقفِ یک نیم نظر کیا کیا
بتاؤ تو سہی ایسے سے کیا عہدہ برآئی ہو
صریحاً لے کے دل کرتا ہے وہ آنکھوں میں گھر کیا کیا

بسانِ نقشِ پا اس چرخِ کج رفتار نے دیکھو
ملائے خاک میں، افسوس ہے اہلِ ہنر کیا کیا
یہ عیش ان کی حماقت دیکھنا، کرتے ہیں عالم میں
غرور و نخوت و عُجب و تکبّر اہلِ زر کیا کیا

(۴)

حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا، کیا ہوا
یا اولی الابصار دیکھو، دم میں کیا تھا، کیا ہوا
جائے عبرت ہے کہوں کیا تم سے اے اہلِ نظر
دفعتاً دیکھو تو رنگ عالم میں کیا تھا، کیا ہوا
پیچ و خم سے چرخِ دوں پرور کے ہم واقف نہیں
آگے اس عالم کے پیچ و خم میں کیا تھا، کیا ہوا
فصلِ خوردی و جوانی تو کٹی اس چین سے[1]
اب رہی پیری ہو اس موسم میں کیا تھا، کیا ہوا
زخمِ دل مرہم سے دُونا ہو گیا واحسرتاً
خوبیِ قسمت، اثر مرہم میں کیا تھا کیا ہوا
جس طرح اَوراق کو ہو گنجفے کے ابتری
ویسے ہی اس دورۂ عالم میں کیا تھا، کیا ہوا
کیا کہوں میں تفرقہ پردازیاں اس چرخ کی
اختلاط، افسوس ان میں ہم میں، کیا تھا کیا ہوا[2]

---

[1] فصلِ خوردی و جوانی تو وہ گذری چین سے (ف۔ د: ۶۲)

[2] دوستوں میں اختلاط اور ہم میں کیا تھا کیا ہوا (ف د: ۶۲)

اے دلِ نادان، تو اُس بات کا شاکی نہ ہو
ربط باہم دیکھ جام و جم میں کیا تھا کیا ہوا

جز خداوندِ جہاں حالِ دل اپنا عیش اب[1]
کس سے کہیے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

(۵)

یہ ہوا کیسی چلی برہم زمانہ ہو گیا
حالِ دہلی بزمِ عالم میں فسانہ ہو گیا

دل کسی فردِ بشر کا خالی اس غم سے نہیں
غم یہ شائع کُو بہ کُو خانہ بخانہ ہو گیا

ہر سرِ مژگاں نہ ہو فوّارۂ خوں کس طرح
غم زدوں کے دل میں جب غم کا خزانہ ہو گیا

ایک ہو تو رو دیے کس کس کو روئیں یاد کر
دیکھ کر اس حادثہ کو دل دیوانہ ہو گیا

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں میں آ گئے اپنے یاں
دم کے دم میں اور ہی کچھ کارخانہ ہو گیا

آہ گلگونِ بہارِ گلشنِ دہلی کو عیش
موجۂ بادِ خزاں کیا تازیانہ ہو گیا

(۶)

عشق میں ہوا اُن کے دشمن اِک جہاں اپنا
دردِ دل کریں کس سے جا کر اب بیاں اپنا

رکھتے ہیں زباں لیکن بات کر نہیں سکتے
حال بزم میں اس کی [اب] ہے شمع ساں اپنا

حیف تو یہ آتا ہے، چل دیے دمِ بسمل
یہ بھی تو نہ سمجھے وہ، ہے یہ نیم جاں اپنا

دیکھیں ہم نہیں ہوتا کس طرح اثر اُن کو
گوش زد ہو گر ان کے نالہ و فغاں اپنا

تھی یہی خوشی ان کی اس لیے سنا ہم نے
جان و دل کیا ان کے وقفِ امتحاں اپنا

ہوشوں کے بن دیکھے دل ہے اپنا صد پارہ
چاک کیا دکھاوے گا آ کے یاں کتاں اپنا

کام کیا ہے ناصح کو کیوں وہ آیا سمجھانے
دے دیا جسے چاہا دل تھا ہاں جی ہاں اپنا

---

[1] بس، الف۔د: ۶۲۔

رشکِ باغِ جنت ہے وہ گلی جہاں کے ہم یار رہنے والے ہیں، دل لگے کہاں اپنا
ایک دم میں دیں گے ہم بس دھوئیں بکھیر اس کے ہو گیا تو ہو لے دو دشمن آسماں اپنا
بھول جائے سب سیماب بے قراریاں اپنی دیکھے خواب میں بھی گر یہ دلِ تپاں اپنا
عیش اس جفا جو سے کہیے اے ستم پیشہ
تا کجا کوئی رکھے دردِ دل نہاں اپنا

(۷)

تیرے کشتہ کو مسیحا سے چلایا نہ گیا اور تجھ سے لبِ جاں بخش ہلایا نہ گیا
[نالہ قلب مرا] ضعف کے مارے ہے ہے لب تلک سینے سے اٹھ کر کبھی آیا نہ گیا
[اپنا سر کوچے سے] اس بت کے اٹھاویں کیونکر اک قدم جس کی گلی میں سے اٹھایا نہ گیا
ہے ـــ ـــ ـــ ـــ ستانے والا جس نے اوروں کو ستایا وہ ستایا نہ گیا
پہنچے مرمٹ کے تو ہم سامنے اس کے لیکن ہم سے افسانۂ غم اپنا سنایا نہ گیا
کیا لگی پاؤں میں تھی ایسی تمہارے مہندی جو تصور میں بھی تم سے کبھی آیا نہ گیا
عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے دردِ دل لاکھ چھپایا، پہ چھپایا نہ گیا
عمر بھر ظلم سہے اس کے، ولیکن ہم سے شکوۂ یار زباں پر کبھی لایا نہ گیا
غنچۂ گل تو صبا نے ہیں کھلائے لاکھوں
عیش پر غنچۂ دل اس سے کھلایا نہ گیا

(۸)

ہدف ہے دل مرا سینے میں کس کے تیرِ مژگاں کا
کہ ہر زخم جگر، لوں تشنہ لب ہے آبِ پیکاں کا
نہ ہو وہ رنگ مل کر نیلم و لعلِ بدخشاں کا
مسی آلودہ لب پر ہے جو عالم سرخیِ پاں کا
نہ پوچھ اے ابرِ تر احوال میری چشمِ گریاں کا
گرہ میں اس کے ہر قطرے کے ہے اک جوش طوفاں کا

ے اصلی مخطوطے میں یہاں سے الفاظ اڑ گئے ہیں

جو سخن لے باغ میں مذکور ہاں ہاں قد جاناں کا
تو ہر گز بھی نہ لیوے نام قمری سروِ بستاں کا
ہوا عالم میں شہرہ جب مری چشمِ دُر افشاں کا
تو گردوں پر ہوا دم بند سُن کر ابرِ نیساں کا
تصرّف ہو مرے شعر و سخن میں کیونکہ شیطاں کا
سرِ دیواں ہے بسم اللہ پھاٹک میرے دیواں کا
ترے وحشت زدہ کو جوشِ وحشت گر یہی ہے تو
رہے گا حشر تک جھگڑا یوں ہی دست و گریباں کا
نہ پوچھا جائے گا عاصی کوئی ہاں سب سے گر پہلے
کھلے گا حشر کے دیواں میں دفتر میرے عصیاں کا
ڈراتا کیا ہے بیداد و ستم سے اپنے تو مجھ کو
میں ہوں طفلی سے خوگر اے فلک بیدادِ خوباں کا
لبِ لعلیں کو اس کے دیکھ کر حیرت ہے کیا کہیے
وہ دُرج لعل ہے چشمہ ہے یا وہ آبِ حیواں کا
مرے اس سینے میں پُر داغ سے لالہ کو کیا نسبت
مرا صدر رشک ہے سینہ پرِ طاؤسِ بستاں کا
کریں گے نرگس و مہتاب کیا دعوائے ہم چشمی
ہے ادنیٰ حیرت آموز آئینہ اس چشمِ گریاں کا
چھڑک دے سودۂ الماس یوں ہی دل کے زخموں پر
نہیں ہونا ضرور اے چارہ گر کچھ یاں نمکداں کا

سہ اصل : پُر داغوں

مروّت جس کو کہتے ہیں وہ شرطِ آدمیت ہے
جہاں میں چاہیے ہے پاس ہو انساں کو انساں کا
یوں ہی گر واعظِ بےہودہ بکتا ہے تو بکنے دو
سنے ہے کون بکنا اس طرح کے لغو ناداں کا
کہوں کیا تم سے یا دِ نشترِ مژگانِ قاتل میں
تڑپنا جو مزہ دیتا ہے سینے میں رگِ جاں کا
رخِ تاباں پہ چھوٹیں جب وہ زلفیں پھر کہو کیونکر
نہ ٹوٹے سبحہ و زنّار ہندو و مسلماں کا
زباں کنجی ہے منہ میں آدمی کے قفلِ دانش کی
کھلے ہے قفل اس سے جوہر ذاتیِ انساں کا
زمیں کے عیش دسترخواں پہ جو اہلِ لیاقت ہیں
مزہ لیتے ہیں نانِ خشک سے وہ زیر بریاں کا (کذا)

(۹)

اس لبِ شیریں کا جو ذکر انجمن میں آگیا
بس مزہ قندِ مکرّر کا دہن میں آگیا

باغ میں دیکھا جو اس سروِ چراغاں کو تو بس
دیکھتے ہی خم قدِ سروِ چمن میں آگیا

ابروے قاتل کے آگے آ کے بچنا ہے محال
کیا بچے وہ جو دمِ شمشیر زن میں آگیا

میرے بہکانے کو بدلے لاکھ روپ اس نے مگر
میں نے پہچانا اسے وہ جس برن میں آگیا

ہے یہ جو گھٹتی کا پہرا قدر سب کی گھٹ گئی
نقص اس باعث فنِ ہر اہلِ فن میں آگیا

یا الٰہی یہ ہوا دنیا میں کیسا انقلاب
اک زمانہ گردشِ چرخِ کہن میں آگیا

(چرخ کی) نیرنگیوں کا کیا کروں تم سے بیاں
(دیکھتے ہی) میں تو آبادی سے بن میں آگیا

شیریں اس نے دی ----- ؎
؎ ------- میں آگیا

؎ اصل میں یہاں کی تمام عبارت اڑ گئی ہے

(۱۰)

خانۂ دل کو کیا میرے منوّر ایسا | نہیں روشن ہوا دنیا میں کوئی گھر ایسا
کیا سبب اس کا ہے بتلاؤ تو حضرت ہم سے | کیوں مزاج آپ کا رہتا ہے مکدّر ایسا
میلِ خاطر نہیں گر برق وشوں کی جانب | کیوں رہا کرتا ہے دل سینہ میں مضطر ایسا
ہچکچی کرتے ہیں دل دینے میں اس واسطے ہم | لے کے جاتے ہیں مکر، ہوتا ہے اکثر ایسا
چرخ ہر چند ہے مشہور ستمگاری میں | لیکن اس نے بھی نہیں دیکھا ستمگر ایسا
لب و دنداں کو میں دوں یار کے کس سے تشبیہ | نہ تو ایسا ہے کوئی لعل، نہ گوہر ایسا

عیش حالِ دلِ حیرت زدہ وہ ہے کہ نہ پوچھ
آئینہ کا ہے کو کمبخت ہے ششدر ایسا

مستزاد

---

(۱۱)

دوستو کیا کروں میرا دلِ بے تاب نہیں/رہے قابو میں رہا
آشنا نام کو بھی مجھ سے خور و خواب نہیں/کیا ہے جینے کا مزا
عندلیبانِ چمن گلشنِ عالم میں کہیں/اس کو تم جانو یقین
اس کے مکھڑے کے مقابل گلِ شاداب نہیں/ہے یہ بے رُد و ریا
بخشی اللہ نے ہے جن کو کہ جمعیّت دل/ہے انھیں اک زرِ گل
ان کو کچھ حاجتِ جمعیتِ اسباب نہیں/ہیں وہ خوش بے سر و پا
دل وہ بے تاب ہے اب کہیے یہ آگے کس کے/کہ مقابل اُس کے
کچھ بھی تو شعلۂ جوالہ و سیماب نہیں/ہے یہ ان سب سے سوا
جو کہ اس چشم سیہ مست کے مستانے ہیں/انھیں سب جانے ہیں
وہ ہیں سرخوش انھیں پروائے مئے ناب نہیں/ہے مدام ان کا نشا
مے کے پینے کے لیے چاہیے ہو عالی ظرف/تا کہ عائد نہ ہو حرف
آتے جس شخص کو مے پینے کے آداب نہیں/اسے مے پینے سے

نور بھی نار ہے بے یار نہیں اس میں خلاف سچ تو یہ بات ہے صاف
عیش بے یار خوش آتی شب مہتاب نہیں مجھے ہر گز بخدا

(۱۲)

کہیں ہم تم سے اے احباب کیا کیا
جہاں میں آکے دیکھے خواب کیا کیا

رہا تجھ بن یہ دل بے تاب کیا کیا
ہوا ہے منفعل سیماب کیا کیا

صبا لائی جو اس کی نکہتِ زلف
چھپا نافہ میں مشکِ ناب کیا کیا

شب فرقت میں تجھ بن اے پری وش
یہ تڑپا ہے دلِ بے تاب کیا کیا

خزاں میں رو کے یہ کہتی تھی بلبل
چمن میں تھے گلِ شاداب کیا کیا

فلک نے زخمِ دل پر عاشقوں کے
لگایا ہے اجی تیزاب کیا کیا

ترے آرام کو اللہ نے عیش
مہیّا کر دیے اسباب کیا کیا

(۱۳)

اک عیب تو آئینے میں ہے پردہ دری کا
اور دوسرے پکا ہے پریشاں نظری کا

دل پر ہی بھروسا ہے وہاں نامہ بری کا
کیوں کر کہ یہ ہے کام بڑے مردِ جبری کا

جاتی ہے چلی عمرِ گراں مایہ یوں ہی مفت
قائل ہوں میں اے دل تری اس بے خبری کا

اس ہستیٔ موہوم پہ نازاں نہ ہو غافل
کیوں اس کی نمائش ہے تماشا گزری کا

آیا ہے دھڑک اس بتِ سفّاک کے آگے
اس دل نے کیا کام ہے کیا بے جگری کا

جائیں گے دھوئیں چرخِ ستم گر کے بکھر اب
گر چل گیا چھرا کسی آہِ سحری کا

پھاڑے ہے مرا دستِ جنوں دامنِ صحرا
کیا عیش ٹھکانا ہے اس آشفتہ سری کا

(۱۴)

آئینہ جانے ہے حالِ دلِ حیراں میرا
پوچھ تو زلف سے احوالِ پریشاں میرا

میں ہوں جاں دادۂ تیغِ نگہِ حسنِ ملیح
زخمِ دل کیونکہ نہ ہو وقفِ نمکداں میرا

کیا کہیں کھوئے گئے ہیں یہ مرے دستِ جنوں　　بخیہ گر سیوے گا کیا چاک گریباں میرا
یار دامن ہی نہیں رکھتے جب اے ہم نفسو!　　خارِ صحرا کہو کیا پکڑیں گے داماں میرا
میں وہ ہوں آبلہ پا دشتِ جنوں میں مجنوں　　لے ہے اٹھ اٹھ کے قدم خارِ بیاباں میرا
اُس کو ہر چند میں کہتا ہوں نہ مل اس سے نگر　　مانتا ہی نہیں کہنا دلِ ناداں میرا

اک نظر اُس کی عنایت کی ہو محشر میں تو عیشؔ!
رشکِ صد طاعتِ زہّاد ہو عصیاں میرا

(۱۵)

اُس کی زلفیں جس نے چھیڑیں وہ صبا تھی، میں نہ تھا
میرا کیا مقدور یہ اس کی خطا تھی میں نہ تھا
مجھ سے بولے کل نشے میں خوب بنکاریں ہیں آپ
یہ نہ سمجھے، اور ہی وہ بے حیا تھی، میں نہ تھا
میرا کیا مقدور جو میں در تک آتا آپ کے
وہ رقیبوں کی اجی آواز پا تھی، میں نہ تھا
پوچھا جب منصور سے، تم نے انا الحق کیوں کہا
یہ کہا اس نے کہ وہ شانِ خدا تھی، میں نہ تھا
میں نے کیا افشا کیا راز ان کا سوچ اے ہمنشیں
باعثِ افشائے راز ان کی حیا تھی، میں نہ تھا

عیشؔ سب ادنیٰ سے اعلیٰ تک وہاں حاضر تھے کل
بزم میں ایک اُس کے خالی، ری جا تھی، میں نہ تھا

(۱۶)

چمن ہے نام خدا خانہ باغ بلبل کا　　اور اس میں گل سے ہے روشن چراغ بلبل کا
ہوئی ہے دوشِ صبا پر سوار نکہت گل　　فلک پہ کیوں کہ نہ ہوئے دماغ بلبل کا
چلا ہے سوئے چمن دام لے کے جو صیّاد　　ملا ہے شاید اُسے داں سراغ بلبل کا

خزاں سے سینہ میں ہے رشکِ صد پرِ طاؤس   ملا کے دیکھ لو ایک ایک داغ بلبل کا (؟)

کلامِ غیر ملے تیرے کب کلام سے عیشؔ
ہو ہم صفیر بھلا کیونکہ زاغ بلبل کا

(۱۷)

حال آئینے سے پوچھو مری حیرانی کا   سلسلہ پوچھ لو زلفوں سے پریشانی کا
دیکھنے والا ہوں میں اس بتِ لاثانی کا   مہر اک ذرّہ ہے جس کے رُخِ نورانی کا
میں وہ ہوں بے سر و پا دشتِ جنوں میں مجنوں   خاک ساماں ہے مری بے سر و سامانی کا
جمع مژگاں پہ ہیں لختِ جگر و دل دونوں   اب تہیہ مژۂ تر کی ہے مہمانی کا
کیا بیاں اس کی نزاکت کا ہو عالم جس کے   خار پاؤں میں چبھے مخملِ کاشانی کا
ہوئے اس واسطے رضواں درِ جنت پہ یقیں   کام آسان نہ تھا یاد کی دربانی کا
نہ رہے ہوش بجا نوح کے طوفاں کے جب   چل پڑا ذکر مرے اشک کی طغیانی کا
خط لکھا کرتے ہیں گو چھپ کے وہ غیروں کو یہاں   حال معلوم ہے سب ان کی بدعنوانی کا
بُرّشِ ابروے قاتل وہ ہے جس کے آگے   ہوتا دم بند ہے شمشیرِ صفہانی کا
خط وہ رخ پر نہیں ہے کاتبِ قدرت نے لکھا   ترجمہ حاشیے پر آیۂ قرآنی کا
کشتۂ حسن و خطِ سبز بتاں ہے یہ تو   مستحق ہے کفنِ پستۂ دھانی کا
بحر میں عالمِ فانی کے دل اتنا نہ ابھر   بلبلا کیوں کہ ہے انسان سنا پانی کا
دے دیا آپ کو دل میں نے نہ پوچھا نہ گچھا   آپ قائل ہوں میاں اپنی میں نادانی کا
آتشِ غم میں برشتہ جگروں کو تیرے   دلِ بریاں سے مزا ملتا ہے بریانی کا

منھ پہ جوں شیشۂ ساعت ملیں اور دل میں غبار
نہیں آئین یہ [اے] عیشؔ مسلمانی کا

اصل : چھبے

(۱۸)

بدلتا ہے یہ ہر دم رنگ کیا کیا دکھاتا ہے فلک نیرنگ کیا کیا
دلِ عاشق پہ ڈھاتا ہے نت اندھیر خیال کا کلِ شب رنگ کیا کیا
تصور میں ترے تیرِ مژہ کے رہا سینہ میں دل سے جنگ کیا کیا
چمن میں دیکھ اس کے فندقِ پا ہوا نا دم گلِ ارژنگ کیا کیا
دل اس غنچہ دہن کی یاد میں، عیش!
کیا کرتا ہے مجھ کو تنگ کیا کیا

(۱۹)

جو قبولِ خاطرِ اہلِ نظر ہو جائے گا گر حقیقت میں وہ مس بھی ہو تو زر ہو جائے گا
سر ہوا گر نالۂ اپنا کوئی لبریز اثر جب تجھے معلوم چرخ کینہ ور ہو جائے گا
گر یہی بیتابیاں ہیں جانِ مضطر کو تو بس خود ہوائے شوق میں دل نامہ بر ہو جائے گا
ناصحا مجھ کو ڈراتا ہے تو ناحق ہر گھڑی اور کیا ہے، یہ ہی نا دل کا ضرر ہو جائے گا
گر بچائے گا کوئی آنسو کا قطرہ اپنے عیش
تو بقولِ درد وہ بے شک گہر ہو جائے گا

(۲۰)

آپ کے عشق میں ہم سے تو زمانا چھوٹا
تم سے افسوس نہ اک غیر کا ملنا چھوٹا
بے حجابانہ تھے بیٹھے ہوئے اغیار کے پاس
دیکھتے ہی مجھے والان کا پردہ چھوٹا
رند تو رند، اجی، زاہد و واعظ سے بھی تو
دیکھتے ہی اُسے تسبیح و مصلا چھوٹا

ے "جنگ" بالاتفاق مونث ہے

ہوسِ دل میں خدا جانے کہ کیا لذت ہے کہ جو لب سے نہ کبھی حرفِ تمنا چھوٹا

تانک جھانک آپ کی ویسی ہی بڑھاپے میں بھی ہے
عیش بوڑھے بھی ہوئے پر وہ نہ لپکا چھوٹا[*]

(۲۱)

جس کو یہاں غرور ہوا عِزّ و جاہ کا
اس کو فلک نے رشک کیا سنگ راہ کا

ہے طرفہ ماجرا دلِ بے دستگاہ کا
طاقت نہ ضبط کی ہے، نہ مقدور آہ کا

ہاتھ آئے گر غبار مجھے اس کی راہ کا
سرمہ بناؤں قوتِ نورِ نگاہ کا

مورد ہو کون رحمتِ حق کا مری طرح
ایسا ہے کس کے پاس ذخیرہ گناہ کا

دے گا دھوئیں بکھیر فلک کے ادھر سے بھی
چھرّا اچلا جو آہِ دلِ داد خواہ کا

وہ ربط وہ تپاک گئے گزرے اب تو یاں
ملنا رہا سو وہ بھی فقط گاہ گاہ کا

رندوں نے بزم میں گلِ بازی بنا دیا
عمامہ آج شیخِ مشیخت پناہ کا

آداب میکدہ سے نہیں بہرہ آپ کو
رستا لو جاؤ شیخ جی تم خانقاہ کا

روتی ہے شمع بزمِ طرب میں کھڑی اِدھر
شیشوں میں شور و غل ہے اُدھر قاہ قاہ کا

توأم ہے سچ ہے شادی و غم بزمِ دہر میں
اہلِ نظر کو ہے یہ مقامِ انتباہ کا

قطعہ

یارو خدا کے واسطے انصاف تو کرو
سنتا نہیں وہ عذر تلک عذر خواہ کا

ظلم و ستم جہاں سے نرالے ہیں یار کے
کرتے ہیں ظلم اور بھی پھر واہ واہ کا

دونوں جہاں کی عیشؔ اسے نعمتیں ملیں
مقبول جو کہ حق کی ہوا بارگاہ کا

(۲۲)

خانۂ دل میں بسا کون سا گل رُو ایسا
کہ جو آتا ہے پسینہ تجھے خوشبو ایسا

---

[*] رہا شباب تلک تانک جھانک کا لپکا۔ وہی ہیں آنکھیں تو لیکن وہ دیکھ بھال نہیں (رندؔ)

لے لیا دل مرا اک نیم نگہ میں اس نے — یاد اس شوخِ فسوں گر کو ہے جادو ایسا
تم اجی جیسے ہو خوش خو مرا جی جانتا ہے — جانو جب تم ملے جب تم کو بھی خوش خو ایسا
کہتے ہیں اہلِ جہاں سوزِ قیامت جس کو — سو تو وہ کوچۂ قاتل میں ہے ہر سو ایسا
کل بدل، تیوری کہنے لگے مجھ کو، چل بے — نام چاہت کا مری لیوے، ہوا تو ایسا
اس کے مکھڑے سے نہ مہتاب کو دینا تشبیہ — کہاں مہتاب نے پایا رخِ نیکو ایسا

ے
- - - - - - - - - - - -
پی کے مدہوش نہ ہوئے کوئی دارو ایسا

ے خطی نسخے میں یہاں بیاض ہے

ب

(۱)

دل لگائیں گے ہم اُس شوخِ پری زاد سے اب
بدلے سب لیویں گے چرخِ ستم ایجاد سے اب

تنگ عشّاق ہیں ظالم تری بیداد سے اب
اُن کے، کانپے ہے فلک، نالہ و فریاد سے اب

برق و سیماب کو دعوے تھے تڑپنے کے بڑے
ہوں مقابل کہو آکر دلِ بیتاب سے اب

توڑ دے جب کمرِ شاخ ثمر ہو اُس کا
کیا توقع رکھے اپنی کوئی اولاد سے اب

پھنس چکی دام میں صیّاد کے جب بلبلِ زار
رونا کیا فائدہ بے رحمیِ صیّاد سے اب

دل لیا، جان بھی موجود ہے، لو بسم اللہ
مجھ کو چارہ نہیں ہے آپ کے ارشاد سے اب

عیش، آسودگی دارین کی ہو تجھ کو نصیب
ہے دعا یہ ہی مری خالقِ جواد سے اب

(۲)

یار کے جیسی ہے دندانِ گہر تاب میں آب
اس کے پاسنگ نہیں گوہرِ نایاب میں آب

جیسے مژگاں کے ہے پرنالے سے آنسو جاری
نکلے اس طرح سے کب آ کے ہے میزاب میں آب

نہ بجھی آتشِ دل اشک کے سیلاب سے کچھ
رکھتا ہر چند بہت تھا اثر اسلاب میں آب

آب جو اُس لبِ تر میں ہے سنا، اے بلبل!
وہ کہاں پایئے تیرے گُلِ شاداب میں آب

آب و تاب اس رخِ روشن میں ہے جو نام خدا
وہ کہاں چشمۂ خورشیدِ جہاں تاب میں آب

دل کی بیتابی ہے بالذّات اور اس کی بالعرض باعثِ جنبشِ سیماب، ہے سیماب میں آب

ہے ظہور اس کی یہ رحمت کا فقط عیشؔ کہ جو
باعثِ زیست ہے اس عالمِ اسباب میں آب

(۳)

جان پر میری کر کرم، یارب! دُور کر دل سے میرے غم، یارب!
بغض و کینہ کو صفحۂ دل سے دے مٹا میرے یک قلم، یارب!
ہم گنہ گار تیرے بندے ہیں تجھ سوا کہویں کس سے ہم، یارب!
ہے دعا تجھ سے چرخِ کج رو کے دور کر مجھ سے پیچ و خم، یارب!
مونسِ جان و دل رہے میرا ق ذکر تیرا ہر ایک دم، یارب!
اور رہِ مستقیم پر تیری! رہوے ثابت مرا قدم، یارب!
عیشؔ تیرا ہے دور رکھ اُس سے
درد و رنج و غم و الم، یارب!

(۴)

جہان میں ہوئے گی جس شخص کی کہ چال خراب
نہ ہوگا اُس کا بھلا کہیے کیونکہ حال خراب
نہ ہوگا مال کبھی طیّب و حلال خراب
خراب ہوگا وہی ہوگا جو کہ مال خراب
نکال منھ سے نہ تو اپنے دیکھ فالِ خراب
یہ کیوں کہ کرتی ہے فالِ خراب حال خراب
یہ واقعی ہے، کہ بد کام کا ہے بد انجام
نہ ہوئے کیونکہ بُرے کام کا مآل خراب
فغاں سے کہہ دو کہ بنت العنب کہیں ہیں جسے
رہی ہے رِندوں کے نت ساتھ وہ چھنال خراب

کمال کی ہے یہاں تک کساد بازاری !
پھرے ہیں در بدر اب صاحبِ کمال خراب

سلامتی کبھی افعال کی نہیں ممکن
مزاج کا ہوا جس وقت اعتدال خراب

اُچھل خزانے پہ اپنے نہ مثلِ فوّارہ
کرے گا دیکھ یہ تیرا تجھے اُچھال خراب

جہاں میں بدوسِ خطباتِ حُبِّ دنیا ہے
تو دل سے دُور کرائے عیش یہ خیال خراب

ت

(۱)

کہہ نہیں سکتے ہم اپنے دل کی بات — کس سے کہویں، ہے بہت مشکل کی بات
وادیِ الفت کیا ہو جس نے طے — اس سے پوچھو سختیِ منزل کی بات
نیم بسمل کر کے وہ چلتے بنے ! — پھر نہ پوچھی آہ اس بسمل کی بات
سچ ہے منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی — چھپ سکے کیوں کر بھلا محفل کی بات
کون پہچانے ولی کو جز ولی — اہل دل جانے ہے اہلِ دل کی بات
رات دن اس زلف و رخ کا ہے خیال — کیا کہوں میں اس دلِ مائل کی بات

ہے اسے بکواس بکنے دے اسے
عیشؔ مت سن، واعظِ جاہل کی بات

(۲)

ساتھ غیروں کو نہ لاؤ حضرت — دل جلوں کو نہ جلاؤ حضرت
ہم بھلی طرح سے کہتے ہیں تمھیں — باز ان باتوں سے آؤ حضرت
کہہ دو پھر حضرتِ واعظ سے کہ تم — کام اپنا کرو، جاؤ حضرت
باتیں ہم آپ کی سب جانتے ہیں — جھوٹی باتیں نہ بناؤ حضرت

بھولے بسرے تو کبھی عیشؔ کو بھی
بزم میں اپنی بلاؤ حضرت

ث

ہے تجھے فکرِ معاش اے دلِ بیکار، عبث
اس کے پیچھے نہ ہو، آمان کہا، خوار، عبث
جس کو عشاق کے آتا ہو ستانے میں مزہ
دردِ دل کرنا ہے اس شوخ سے اظہار، عبث
نقدِ جاں دیتے ہیں ہم اس کے عوض، مان کہا
ایک بوسے پہ نہ کر جانے دے تکرار عبث
ایسی کب سنتا ہے فریاد کسی کی وہ شوخ
آہ و نالہ ہے ترا یوں ہی دل آزار عبث
دل یہاں پہلے ہی ہے جورِ بتاں کا مارا
تیری بیداد ہے، اے چرخِ جفاکار، عبث
تیغِ ابرو کا ہے عاشق کو اشارہ کافی
کھینچتے اس پہ ہو ناحق یوں ہی تلوار عبث
مرضِ عشق کا بیمار ہے، اے چارہ گرو
ہے تمہیں فکرِ علاجِ دلِ بیمار عبث
وادیِ عشق میں ثابت قدموں سے اے عیشؔ
سرزنش کرتا ہے یہ نوکِ سرِ خار عبث

ج

چارہ گر، عشاق کے، بجز وصل، غم کا کیا علاج
اس سوا اور اس درد والم کا کیا علاج
یہ تو مانا ہم نے مر پٹ کر کیا ضبطِ فغاں
عقل حیراں ہے کریں اس چشمِ نم کا کیا علاج
کج رویِ چرخِ کج رو سے نبٹیں گے، مگر
ہم نشیں، بتلا تو خفگیِ صنم کا کیا علاج
اور تو جور و ستم ان کے بجان و دل قبول
ربط ہے غیروں سے، کہیے اس ستم کا کیا علاج
اور تو سب کا علاج اے عیش ہو سکتا ہے پر
جو سفر در پیش ہے ملکِ عدم کا کیا علاج

ح

قیس نے تنہا گزاری عمر بَن میں کس طرح
کی بسر اوقات اس دیوانہ پن میں کس طرح

جرأتِ مردانہ کہتے ہیں اسے مردانہ وار
شمع جلتی ہے کھڑی دیکھو لگن میں کس طرح

یہ تماشا یا اولی الابصار دیکھو تو سہی
دے رہا ہے جلوہ وہ ہر ہر برن میں کس طرح

دل لگی کہتے ہیں جس کو وہ تو ہے یاروں کے ساتھ
جب نہ وہ ہوں تو لگے دل پھر وطن میں کس طرح

ذکر اس شیریں دہن کا ہے مرے وردِ زبان
ہو نہ شیرینی بھلا میرے سخن میں کس طرح

چرخ پر موقوف کیا ہے جو کہ ہوں گے کج سرشت
راستی ہوگی بھلا ان کے چلن میں کس طرح

سرد مہریِ فلک سے عیش بتلا تو سہی
ہو بھلا تخفیف اس دل کی جلن میں کس طرح

خ

(۱)

رکھے ہے نامِ خدا وہ کیا ادا و ناز شوخ
برتے ہے عشّاق سے ہر دم پہ انداز شوخ

کب اثر ہووے ہے اس کو لاکھ سمجھائے کوئی
اپنے ظلموں سے بھلا کرتا ہے کب وہ ناز شوخ

مرد بدتے ہیں اُسے جو پائے اس کے دل کا بھید
کس کو دیتا ہے بھلا وہ اپنے دل کا راز شوخ

عاشقوں کی جان و دل سے ہے اُسے ذلّت پسند
اور غیروں کے کیا کرتا ہے وہ اعزاز شوخ

آتشِ غم سے مرے سینے میں کہنا اے صبا
شمع کی مانند دل رکھتا ہے سوز و ساز شوخ

عندلیب بے ادب کرتی نہیں گل کا ادب
گوشِ گل کے پاس جا دیتی ہے وہ آواز شوخ

(۲)

چھیڑ کرتا ہے جو یوں میرے دلِ زار سے چرخ
نہیں واقف سری کیا آہِ شرر بار سے چرخ
کیا ہوا فائدہ حاصل تجھے بھلا تو سہی
یوں جدا کرکے مجھے اس بتِ عیار سے چرخ
دیکھ تو جان نہ زنہار مقابل کرنا!
ابرِ نیساں کو مری چشمِ گہر بار سے چرخ
اس کے وحشت زدہ گو پائے برہنہ ہو ویں
کیا وہ ڈر جائیں گے اس سرزنشِ خار سے چرخ
مثلِ غربال کے سینہ ہو شناچھن کے ترا
گر میں کہہ دوں ابھی تیرِ نگہِ یار سے چرخ
اس کو کب یاد تھے اے عیشؔ جفاکاری کے
طرز سیکھا ہے یہ اس شوخ جفاکار سے چرخ

د

گلچیں نہ کیونکہ ہو دل و جان و جگر میں درد
کیسا بھرا ہے نالۂ مرغِ سحر میں درد
ہے جیسے دل کو ہجرِ تپِ سیم بر میں درد
اہلِ سقر کو ہوگا نہ ایسا سقر میں درد
اتنا نہ بک خدا کے لیے کر زباں کو بند
ہوتا ہے ناصحا تری بک بک سے سر میں درد
کھینچے گر آہ بزم میں وہ تیرا دردمند
پیدا اثر سے اس کے ہو دیوار و در میں درد
بیداد بھول جائے گا سب اپنی یہ فلک
اٹھا اگر کسی دلِ آشفتہ سر میں درد
دہلی کی سرزمیں پہ ہے ہر ایک دردناک
ارزاں ہے کس قدر اجی دہلی نگر میں درد
آگاہ اس سے عیش دلِ اہلِ درد ہیں
جو ہے کلامِ حضرت درؔد و اثرؔ میں درد

تم ایک کہتے ہو، بھیجے ہیں ہم نے دس کاغذ
غرض کہ تھک گئے ہم بھیج بھیج بس کاغذ
جواب ایک کا بھیجا نہ اس نے ہم کو کبھی
روانہ ہم نے کیے اس کو پیش و پس کاغذ
اسی سے کہتے ہیں ہم عیش رازِ دل اپنا
جہاں میں اپنا ہے وہ ایک ہم نفس کاغذ

ر

(۱)

رکھا ہے دل (ان) بتوں سے ہم نے چھپا چھپا کر چھپا چھپا کر
بلا یہ ٹالی ہے سر سے اپنے خدا خدا کر خدا خدا کر

ستم تو دیکھو یہ کیا ستم ہے بلا کے غیروں کو پاس اپنے
وہ کس ڈھٹائی سے ہیں بٹھاتے دکھا دکھا کر دکھا دکھا کر

زباں پہ لانے سے فائدہ کیا مجھے خبر ہے عدو نے ان کو
مری طرف سے کیا ہے بد ظن لگا لگا کر لگا لگا کر

سُنی حقیقت نہ کان دھر کے کبھی نہ پوچھا کہ حال کیا ہے
فسانۂ غم ہم ان کو ہارے سُنا سُنا کر سُنا سُنا کر

بھلا نہ غصّے سے ہم چبائیں بتاؤ کیوں کر نہ ہونٹ اپنا
رقیب کرتے ہیں ہم سے باتیں چبا چبا کر چبا چبا کر

جتائے دیتے ہیں اتنا ہم یہ، تم ان کے دم میں کہیں نہ آنا
وہ جان و دل لیں ہیں چھین، باتیں بنا بنا کر بنا بنا کر

جو ہاتھ بندوں کا عیش اس نے کرم سے خالی نہیں ہے رکھا
دعائیں مانگیں ہیں اس سے (وہ) ہاتھ اٹھا اٹھا کر اٹھا اٹھا کر

(۲)

جو بات شمع کو پروانہ جل بجھا چھو کر
تو شمع بولی چلا تھا مجھے مُوا چھو کر

یہ لائی بُو ہے دل آویز پھر کہاں سے کہو
جو اس کی زلف کو آئی نہیں صبا چھو کر

یہ اپنے پند تو رہنے دے واعظا اپنے پاس
تو ہم پہ سورۂ یوسف کو پڑھ کے آ چھو کر

یہ تو نے پایا ہے رنگِ قبول عالم میں
اسی کے پائے نگاریں کو اے حنا چھو کر

(۳)

محبت اولیاء اللہ کی آتی ہے کام آخر
کہ ان کے نام میں اللہ کا آتا ہے نام آخر

اکڑنا سرو کا ہم دیکھ لیویں گے اکڑنے دو
کبھی تو آئے گا گلشن میں وہ بھی خوش خرام آخر

عیادت کو مریضِ غم کی وہ آئے تو کب آئے
جب اس ناکامِ الفت کا کیا فرقت نے کام آخر

کیے وعدے تھے کیا کیا اس نے وہ پیماں شکن دیکھو
ہوا پھر بزمِ اعدا میں شریکِ دورِ جام آخر

نہ مانا تم نے کہنا اس نے کیوں جی ہم نہ کہتے تھے
بچھایا مرغِ دل کے واسطے زلفوں کا دام آخر

نہ پڑ جھگڑے میں زلفوں کے دلِ ناداں سنتا ہے
نہ ہووے گا قیامت تک بھی یہ طولِ کلام آخر

تکبر، نخوت و پندار جو چاہو یہاں کر لو
تہِ خاک اہلِ غفلت ایک دن ہوگا مقام آخر

جلا گر آتشِ الفت میں پروانہ تو شمع بھی
ہوئی جل جل کے اس کے غم میں تا صبح تمام آخر

بہانہ پاؤں میں مہندی لگانے کا جو کرتا تھا
دکھا اس بت کو تو نے رنگ سے اے عیش کیا آخر

ڑ

اے صبا، یار کی تو کاکلِ پیچاں کو نہ چھیڑ
ہو گی تو جان پریشان پریشاں کو نہ چھیڑ

چارہ گر، دیکھ مرے سینۂ سوزاں کو نہ چھیڑ
اس میں ہے آگ بھری آتشِ پنہاں کو نہ چھیڑ

میں گنہگار ہوں زاہد، مجھے تو طعن نہ کر
تو ہے پاکیزہ، مجھ آلودۂ عصیاں کو نہ چھیڑ

اس طرح اے بتِ خونخوار، جگر ریشوں کے
دم بدم نشترِ مژگاں سے رگِ جاں کو نہ چھیڑ

یوں مسیح آئیں تو آئیں، پہ یہ کہنا اُن سے
نبضِ جاں سوختۂ آتشِ ہجراں کو نہ چھیڑ

عیش، انسان کو ہے حفظِ مراتب لازم
اس میں ہے ترکِ ادب، یار کے داماں کو نہ چھیڑ

ز

(۱)

اِس سے پہلے تو نہ تھی یہ چرخِ زنگاری کی طرز
اُس سے اب سیکھی ہے یہ ظالم جفاکاری کی طرز

دیکھ کر بیمارِ غم کو تیرے، یہ بولے مسیح
فاتحہ پڑھ دو کہ ڈھب ہے اس کی بیماری کی طرز

اور کی تو کیا حقیقت ہے، اجی شیطان بھی
سیکھ جائے شیخ جی صاحب سے مکاری کی طرز

عیشؔ! بدمستی بھی تیری، خالی از حکمت نہیں
کیونکہ نکلے ہے تیری مستی سے ہشیاری کی طرز

(۲)

دل بتوں سے نہ لگانا ہرگز
اُن کے پھندے میں نہ آنا ہرگز

دل، تجھے اپنی ہے گر جان عزیز
کوے قاتل میں نہ جانا ہرگز

مانگ بیٹھا وہ تو دل دینے میں
نہیں بننے کا بہانا ہرگز

عندلیبانِ چمن کو صیاد!
فصلِ گل میں نہ ستانا ہرگز

شکوۂ یار زباں پر اپنی
دل، خبردار نہ لانا ہرگز

ہدفِ تیرِ نگاہِ قاتل — مرغِ دل کو نہ بنانا ہرگز
اس سے وابستہ ہیں دل لاکھوں کے — زلف میں کھینچو نہ شانا ہرگز
رہنے دیتا نہیں انساں کو یاں — اک وطیرے پہ زمانا ہرگز
انقلاب اس میں ہے دم دم اے دل! — اس کا افسوس نہ کھانا ہرگز

گر خدا دے تجھے توفیق اے عیش!
دل کسی کا نہ دُکھانا ہرگز

س

ہے اُس کی ذات سزاوارِ حمد و شکر و سپاس
نہ پہنچے کُنہِ حقیقت کو جس کی فہم و قیاس

خدا کے واسطے، ہوئے نہ یار جن کا پاس
طبیعت اس کی بتاؤ نہ ہووے کیونکہ اداس

شمیمِ زلف پہ مائل نہ ہو طبیعت کیوں
مشامِ جان کو تازہ کرے ہے وہ بُو باس

تو زخمِ دل کے لیے عاشقوں کے، اے جرّاح!
ملا کے لا نمک و سنگ و سُودۂ الماس

ہزار میٹھے ہوں قند و نبات و شہد، مگر
مقابل اُس لبِ شیریں کے کب ہے اُن کی مٹھاس

نصیحتیں مجھے کرتا ہے ہر گھڑی، ناصح
لگی رہے ہے اُسے رات دن یہی بکواس

جو دیکھ لیوے سنا اس کو تو پری کیا ہے
بجا نہ رہویں کبھی حور کے بھی ہوش و حواس

جناب شیخ جی صاحب کو رند کہتے ہیں
کہ ان کی ذات جہاں میں ہے غیرتِ خنّاس

خدا نے عیش، دیے جن کو ہیں دلِ روشن
نظر میں ان کی ہے یکساں سُنا حریر و پلاس

نہ نقص خط میں ہے ان کے نہ (کوئی) خال میں نقص
ہے بے وفائی کا اک صاحبِ جمال میں، نقص

اجی، مزاج کے آیا جب اعتدال میں نقص
تو کہیے کیونکہ نہ صحت کے ہو کمال میں نقص

سمجھ کے پہلے ہی جو لوگ ہیں مآل اندیش
وہ کام کرتے ہیں جس کے نہ ہو مآل میں نقص

یہ بوسۂ لبِ لعلیں زکوٰۃِ حسن ہے، دو!
وگرنہ آئے گا دیکھو تمھارے مال میں نقص

جو اہلِ حال ہیں، قال ان کا ہے موافقِ حال
یہ بات جب نہ ہو، ہے ان کے حال و قال میں نقص

کسی سے اہلِ غرض تم بجز خدائے کریم
سوال مت کرو، عزت کا ہے سوال میں نقص

عروس ڈھونڈے ہے دنیا کی نت نیا دھگڑا
زیادہ سب سے برا ہے یہ اس چھنال میں نقص

وہ نقص اور کا کب دیکھتے ہیں عیش، جنھیں
رہے ہے اپنا ہی آٹھوں پہر خیال میں نقص

جو حصول ان کو ہوا احمدِ مختار سے فیض
تا ابد رہوے گا وہ حیدرِ کرّار سے فیض

ہے وہاں اہلِ بدخشاں کو لبِ یار سے فیض
ابرِ نیساں کو ہے یاں چشمِ گہربار سے فیض

گلِ تصویر نہ کہیے، تو اسے کیا کہیے
گلشنِ دہر میں جب ہووے نہ سرِ دار سے فیض

دور میں چشمِ سیہ مستِ بتاں کے، ساقی!
ہو گیا بند درِ خانۂ خمّار سے فیض

آبلہ پاؤں کو کیا دشت نوردی میں بھلا
سرزنش کے ہے سوا رشتۂ زنّار سے فیض

ٹکڑے کر کرکے بنائی ہے لنگوٹی اپنی
لوٗیہ رِندوں کو ہوا شیخ کی دستار سے فیض

ط

(۱)

آرزو رکھتا ہے یہ عاشقِ دلگیر فقط
وہ لگا دے نگہِ ناز کا اک تیر فقط

پا کے اس شوخ کو تنہا، کہیں دھمکائیے خوب
اب جو ہونا ہو سو ہو، ہے یہی تدبیر فقط

یوں تو سب اچھے ہیں، پر مجھ سے جو تم پوچھتے ہو
دل پسند اپنی ہے طرزِ سخنِ میر فقط

اور کچھ کام نہیں اہلِ دلوں کو، تو وہ
قصرِ دل ہی کی کیا کرتے ہیں تعمیر فقط

شیخ کا جُبّہ و دستار جو تم دیکھتے ہو
ہے یہ سب اس کی بناوٹ پئے تزویر فقط

تم سے ہم اپنا قصور آپ بیاں کرتے ہیں عیشؔ!
ان کے عاشق ہوئے، یہ اپنی ہے تقصیر فقط

(۲)

میں نذر کرتا ہوں، رکھتا ہوں ایک جان فقط
جو آکے بیٹھے مرے پاس وہ اک آن فقط

تو گرمِ ناز ہے واں، شمعِ ناز کی مانند!
وہ تفتہ جاں ہے کوئی دم کا میہمان فقط

جو آنکھ ہووے تو دیکھے سمک سے تا بہ سماک
یہ جلوہ گر ہے ہر اک شے میں، اس کی شان فقط

کچھ (اور) کام نہیں یاں مدام صبح و مسا
رہے ہے زلف و رخِ یار کا دھیان فقط

نہ دوست ہے کوئی اپنا، نہ کوئی دشمن، عیشؔ!
جو کچھ کہ ہے سو یہ ہے اپنی ہی زبان فقط

(۲)

لکھا جو یار کو حالِ دلِ فگار میں خط
وہ ٹکڑے ہو کے گیا اے لو بزمِ یار میں خط

وہاں سے آیا بڑے ایک انتظار میں خط
سو وہ بھی آیا تو آیا خطِ غبار میں خط

نگاہِ بد رہے دُور اُس سے اُس کے مکھڑے پر
بہار دیتا ہے کیا عمرِ نوبہار میں خط

جہاں ہزاروں کے آتے ہوں خط پڑے دن رات
وہاں بتاؤ ہمارا، ہو کس شمار میں خط

بتاؤ تو سہی عالم میں سر فروش ایسا
وہ کون ہے کہ جو لے جائے کوئے یار میں خط

وہ خط جو یار کا آیا ہے، میرے سینے پر
جوابِ نامہ کی جا رکھیو، وہ مزار میں خط

خلافِ طبع نہ لکھا گیا ہو، ڈرتا ہوں
لکھا ہے یار کو کل میں نے انتظار میں خط

خط آپ ان کو یہ لکھ لکھ کے بھیجتے ہیں عبث
نہیں پہنچنے کے جائیں گے یوں ہی نار میں خط

جواب خط کا کسی طور واں سے آوے عیشؔ!
نہیں ہے رسم ہی لکھنے کی اس دیار میں خط

ظ

کل اس نے ہو کے نشہ میں سرِ شام، بے لحاظ
دی کھول منھ پہ زلفِ سیہ فام بے لحاظ
کرتا ہے میرے سامنے غیروں میں مے کشی
اتنا ہوا ہے وہ بتِ خود کام بے لحاظ
لازم ہے آدمی کو لحاظِ مآلِ کار!
کرنا نہیں ہے خوب کوئی کام بے لحاظ
کہتا ہے دردِ دل کس و ناکس کے سامنے
ایسا ہوا ہے یہ دلِ ناکام بے لحاظ
ہے بے لحاظ یوں نشۂ حسن میں وہ عیشؔ!
ہو پی کے مے کو جیسے مے آشام بے لحاظ

ع

رازِ دل کی ہو نہیں سکتی کسی کو اطلاع
ہاں مگر ہوئے تو ہوئے جن کے جی کو اطلاع

گر چھپاؤ لاکھ چھپ سکتا نہیں رہے ہشک و عشق
اس کی ہو جاتی ہے عالم میں سبھی کو اطلاع

دے دیا دل اُس کے اِن ڈھنگوں سے ہم واقف نہ تھے
کیا کرے اس کو نہ ہو جب آدمی کو اطلاع

شمع جل کر خاک ہو جائے ابھی یک دم میں گر
سوزِ دل سے میرے ہو اُس دل جلی کو اطلاع

ٹکڑے ہو جائے جگر نے کا ابھی گر نے نواز
نالۂ دل سے مرے ہو باقُلی کو اطلاع

بھولے سب اپنی پریشانی کو عاشق کی اگر
ہو پریشانی سے زلفِ عنبری کو اطلاع

دم بخود ہو رہ گئیں اس غنچہ لب کی باغ میں
آمد آمد کی ہوئی جب ہر کلی کو اطلاع

ہم تو اُن آنکھوں کے متالے ہیں ہم کو مے سے کیا
دے دو اس کی اہلِ بزمِ میکشی کو اطلاع

اطلاع و آگہی کے ایک ہی معنی ہیں، عیش!
کہتے ہیں عربی زباں میں آگہی کو اطلاع

جا کے دیکھا جو میں نے سوے باغ
بلبلوں کا ہے آسماں پہ دماغ
کیوں نہ ہو خانۂ چمن روشن
قمقمے گل کے ہیں بجاے چراغ
عاشقی کا نشان ہے یہ ہی
دلِ بریان و سینۂ پُر داغ
کیا کرے کوئی فکرِ شعر و سخن
نہیں خاطر کو ایک دم بھی فراغ
رفتگانِ عدم کا، عیش! کہیں
آج تک تو نہیں ملا ہے سراغ

(۱)

ہوا ہے جب سے یہ دل اُس بتِ خود کام سے واقف
قسم لے لو جو مطلق ہو کبھی آرام سے واقف
تصوّر اس کے زلف و رخ کا جس کے دل میں بستا ہے
نہ ہے وہ صبح سے آگاہ نہ وہ شام سے واقف
جو اس کے چشم و لب کے دیکھنے والے ہیں عالم میں
نہیں ہرگز وہ نامِ پستہ و بادام سے واقف
ہزاروں خط (اُسے) لکھ لکھ کے ہارے آج تک ہم تو
نہ خط سے آشنا اُن کے نہ ہیں پیغام سے واقف
خوش آوے بوئے مشک و عنبر اس کو عیش کب جس کا
مشامِ جاں ہو بوئے زلفِ عنبر فام سے واقف

(۲)

ہمدمو! آتا ہے ایسے شخص کی یاری سے خوف
جس ستم گر کو نہ آتا ہو دل آزاری سے خوف
جس نے بیداد و ستم اُس کے سہے ہوں گے بھلا
اس کو کیا آوے گا جورِ چرخِ زنگاری سے خوف

اور تو تعریف اس کی کیا کروں، شیطاں کو بھی
شیخ جیو صاحب کی بس آتا ہے مکّاری سے خوف

حضرتِ عیسیٰ کو بھی آتا ہے، اے خانہ خراب!
تیرے بیمارِ غمِ ہجراں کی بیماری سے خوف

دل تو کیا ہے جان تک دینے کو ہم حاضر ہیں، عیشؔ!
اک مگر آتا ہے اس ظالم کی عیّاری سے خوف

(۱)

کیا اُس کا اعتماد، ہو جس کی زباں میں فرق
بے شک دلیلِ کذب ہے ہونا بیاں میں فرق

پیدائش ان کی خاک سے اور اس کی آگ سے
ہو آسمان زمیں کا نہ کیوں انس و جاں میں فرق،

بھاگے ہیں کج سرشتوں سے جو راست باز ہیں
اس واسطے ہے صحبتِ تیر و کماں میں فرق

ملتا ہے دل جبھی کہ بہم ہوں صفائیاں
کیونکر ملے جب آوے ابھی درمیاں میں فرق

آبادی اتفاق سے ہوتی ہے، سو کہاں
عیشؔ آ گیا ہے اب دلِ اہلِ جہاں میں فرق

(۲)

ہے دلِ شیدا کو اس کی ناز برداری کا شوق
جس پری وش کو ہے عاشق کی دل آزاری کا شوق

گوش زد ان کے، ہوئی ہے وسعتِ رحمت تری
عاصیوں کے دل کو اس سے ہے سیہ کاری کا شوق

دل میں جس کے شمع کی مانند ہو سوز و گداز
کیوں نہ ہوئے اس کو کبھی گریہ وزاری کا شوق

زاہدِ مکّار کے دم میں نہ آ جانا کبھی
وہ بڑا مکّار ہے، ہے اس کو مکّاری کا شوق

رات دن آویزۂ گوشِ بتاں کی یاد میں
چشم گو ہر بار کو ہے گا گہر باری کا شوق

ہر نگہ میں کیوں نہ ہو اُس کے بھرا سحر و فسوں
ہوئے جس چشمِ فسوں گر کو فسوں کاری کا شوق

رات دن صدقے نہ ہوں سَو جان سے کیوں اس کے ہم
عیشؔ جس دل کو ہے عشقِ حضرتِ باری کا شوق

(۱)

آ کے کہتے ہیں کہ جاں دیتا ہے یار ایک پہ ایک
یا یہ اب بل بے حسد کھاتا ہے خار ایک پہ ایک

کبھی سچّا نہ کیا وعدہ سدا جھوٹ یونہی
ہم سے کرتا وہ رہا قول و قرار ایک پہ ایک

اُس نے بھیجا نہ جواب ایک کا بھی میں نے (تو) خط
متواتر اُسے بھیجے ہیں ہزار ایک پہ ایک

انتظامِ فلکِ پیر میں آیا یہ خلل
لُوٹ یاں تک ہے کہ کھاتا ہے اُدھار ایک پہ ایک

شبِ فرقت میں تری دیکھ پروتا ہے گہر
کس سلیقہ سے ترے اشک کا تار ایک پہ ایک

"بعضکم ببعض" کا مصداق یہی ہے کہ یہاں
یعنی رکھتا ہے سوا عزّ و وقار ایک پہ ایک

ناز و انداز و ادا واں ہیں یہاں ایک یہ دل
اس پہ آتی ہے چلی دیکھو کہار ایک پہ ایک

بزم میں رندوں کی کل واعظ و ناصح و فقیہہ
بس لگا پھینکنے عمّامہ اتار ایک پہ ایک

کوچۂ یار ہے صد غیرتِ بازارِ منیٰ ; ;
کیوں کر تڑپے ہے وہاں سینہ فگار ایک پہ ایک
بچ سکے کیوں کہ کوئی روز اٹھاتا ہے نئے
شعبدے یہ فلکِ شعبدہ کار ایک پہ ایک

(۲)

جو اپنی چال کے وہ سج دھج دکھائیں سر سے پاؤں تک
تو لے لے فتنۂ محشر بلائیں سر سے پاؤں تک
جو داغ عاشق کبھی اپنے دکھائے سر سے پاؤں تک
تو گل اے یار (سارے خار کھائیں) سر سے پاؤں تک ؎
بتاؤ تو سہی جو دل کو بھائیں سر سے پاؤں تک
تو پھر کیوں کر نہ وہ دل میں سمائیں سر سے پاؤں تک
تمھارے دیکھنے کے واسطے رستوں میں نرگس کے
یہ پیدا کیوں کہ آنکھیں ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک
بسانِ کاغذِ آتش زدہ یہ تفتہ [illegible] وہ ہیں
جلے پر بھی بہار اور ہی دکھائیں سر سے پاؤں تک

؎ (اصلاح قیاسی ہے)

ل

(۱)

نہیں حالِ دہلی سُنانے کے قابل
یہ قصّہ ہے آنسو بہانے کے قابل

اُجاڑے ہیں وہ قصر ایک ایک اُس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل

نہ آئی خوشی آبادی ان کی فلک کو
نہ تھے ورنہ وہ تو مٹانے کے قابل

نہ پایا کوئی اور ان کے سوا کیا
فلک کیا وہی تھے ستانے کے قابل

کیا آہ برباد چمن کے ان کو
نہ تھے جو کہ برباد جانے کے قابل

ملایا جنھیں خاک میں تونے، وہ تو
نہ تھے خاک میں یوں ملانے کے قابل

نہیں گھس لگانے کو چڑیا تلک وہ
جہاں جمع تھے اک زمانے کے قابل

ستم سا ستم تونے ڈھایا ہے ظالم
نہیں بات یہ منہ پہ لانے کے قابل

انھیں خاکِ ذلت پہ پٹکا ہے تھے وہ
جو آنکھوں کے اوپر بٹھانے کے قابل

کہیں ہیں سب احباب، دہلی کو چلیے!
رہی ہے کہاں اب وہ جانے کے قابل

جسے دیکھ کہتے تھے سیّاحِ عالم
یہ ہے جائے آرام پانے کے قابل

اسے دیکھ بلبل بھی کہتی ہے یہ جا
نہیں آشیاں اب بنانے کے قابل

سُنا جس نے یہ حال افسوس کھایا
یہ ہے حالِ افسوس کھانے کے قابل

الٰہی بسا پھر تو اپنے کرم سے!
اُسے کیونکہ ہے وہ بسانے کے قابل

دکھائے ہیں افسوس وہ دل فلک نے
نہ تھے عیش جو دل دکھانے کے قابل

(۲)

نہ تھا قصرِ دل آہ ڈھانے کے قابل — یہ گھر تھا خدا کا بنانے کے قابل
سیے گا مرا زخمِ دل چارہ گر کیا — رہا ہی نہیں وہ سِلانے کے قابل
مرے دل کو وہ حُبّ کا تعویذ سمجھے — جو کہتے ہیں ہے یہ جلانے کے قابل
بتا تو بھلا تیرِ بیداد، قاتل — یہی دل ہدف تھا بنانے کے قابل
کہے ہیں جسے دخترِ رز سو وہ تو — نہیں فاحشہ منھ لگانے کے قابل
کہیں حضرتِ دل کا کیا حال تم سے — ق — نہیں حال ان کا سنانے کے قابل
غرض ساتھ اپنے انھوں نے ہمیں بھی — نہ رکھا کہیں آنے جانے کے قابل
سُن اے عندلیبِ چمن، غنچۂ گل — نہیں آگے اُس لب کے آنے کے قابل
بس اس غنچۂ لب کے آگے وہ غنچہ — اگر ہے تو ہے مُنھ چُرانے کے قابل

بہار آئی پھر عندلیبِ چمن کو
یہ ہے عیشؔ مژدہ سنانے کے قابل

(۳)

اشکوں کے ساتھ ہو کے بہا خون یہ ہائے دل
ہر ہر مژہ سے لیویں گے ہم خوں بہائے دل

تاب و توان نے تو اُسے (رہتا) دے دیا جواب
الفت میں ایک غم ہے فقط آشنائے دل

ہے یہ ہی شور کوچۂ قاتل میں ہر طرف
کہتا ہے کوئی ہائے جگر، کوئی ہائے دل

چاہیں فلک سے مطلبِ دل ہم، بتاؤ کیا
حاصل ہوا ہے اس سے کبھی مدعائے دل

پیکاں ہے یا کہ خار ہے یا آبلہ ہے، عیشؔ!
کیا جانیے کہ سینے میں کیا ہے بجائے دل

(۴)

مجھ سے پوچھے ہیں وہ کہ کیا ہے دل
کیا کہوں خانۂ خدا ہے دِل

کیا کہوں کیا بُری بلا ہے دل
اس کی زلفوں سے جا اُلجھا ہے دِل

تیری فرقت میں اے بتِ دم باز
ہو کے آنکھوں سے خوں بہا ہے دل

مِل کے اس سے ہوا مرا دشمن
دیکھ کیا سخت بے وفا ہے دل

جب سے عاشق ہوا ہوں اس کا میں
رات دن صرفِ مدّعا ہے دل

عنصرِ خاک سرد و دل یہ گرم!
کون سی خاک سے بنا ہے دل

اے ہوَس، جو یار کے در پر
خاک ہوئے تو کیمیا ہے دل

غمِ ہجراں میں ہو کے قطرۂ خوں
نوکِ مژگاں پہ آرہا ہے دل

سینہ میں اک کھٹک سی ہے بس اور
ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل

یاد میں اس کے تیرِ مژگاں کے
ہدفِ ناوکِ بلا ہے دل!

تجھ سے کوئی بھلا ملے کیوں کر
تیرا ہر حرف خود جدا ہے دل

قدرِ دل عیشؔ! کوئی کیا جانے
مخزنِ رازِ کبریا ہے دل

(۵)

جا کے اس کوچے میں دل کہتا ہے اب یاں سے نہ چل
اور جو میں چلتا ہوں واں سے تو وہ جاتا ہے چل

بے خبر، اس میں ہے ہر ایک قدم پر ہل چل
پاؤں رکھتا ہے تو رکھ منزلِ جاناں میں سنبھل

دلِ مضطر تری فرقت میں رہے ہے بے کل
ہر گھڑی ہر دم و ہر لحظہ ہر اک ساعت و پل

اس میں سچ پوچھو تو بس ہے یہی قولِ فیصل
آگے اس لب کے ہیں پھیکے شکر و قند و عسل

بیش و کم اس میں نہیں ہوتا ہے ہرگز سرِ مو
جو کہ تقدیر میں لکھا گیا ہے روز ازل

یاد میں مصحفِ رخ کے ہے دعا یہ ہی مدام
نورِ ایمان کی روشن رہے دل میں مشعل

اُس فرنگی بچہ سے میں نے جو مانگا بوسہ
ہاتھ پستول پہ رکھ کر وہ لگا کہنے کہ ڈل

اعتماد اس کے ہو کیا قول وقسم پر جس کے
ہر سخن میں ہو فریب اور ہر اک بات میں چھل

ہمسری کی دہنِ یار سے گر غنچے نے ! !
تو ابھی بادِ صبا ڈالے گی منہ اس کا مسل

یار دل بستگی اُس سے بڑی نادانی ہے
ہو وے جو شخص کہ پیماں شکن و عہد گسل

عیش اب کہیے ملے دل تو بھلا کس سے ملے
ہو گئے جب کہ سب ابنائے جہاں اہلِ دغل

ے قافیہ انگریزی (ڈل)

م

(۱)

نہ خاکِ در تری اکسیر دے کے لیں گے ہم
وہ جاں تک آوبتِ بے پیر دے کے لیں گے ہم
ٹھنی ہے اب یہی دل میں کہ کامِ دل اس سے
شرابِ تلخ گلوگیر دے کے لیں گے ہم
دریغ جان تلک جب نہیں، تو دل کیا ہے
جو ان کو یہ دلِ دلگیر دے کے لیں گے ہم
صبا جو نکہتِ زلف اس کی لے کے یاں آئے
ختن کی اس سے وہ جاگیر دے کے لیں گے ہم
ہمارے قابو میں آئے وہ گر تو سب بدلے
بس اپنے در کی یہ زنجیر دے کے لیں گے ہم
نہ دے گا مقصدِ دل گر فلک تو ہم بھی وہ ہیں
کہ اس کی ناک میں ہاں تیر دے کے لیں گے ہم
ہم اس کا بوسۂ لب یوں تو لے نہیں سکتے
دم ان کو عیشؔ بہ تدبیر دے کے لیں گے ہم

(۲)

جس کو ہو چشمِ سیہ مستِ دل آرام سے کام
وہ تو ہرگز نہیں رکھنے کا مَے و جام سے کام

جان و دل سے ہیں جو اُس نام کے عاشق وہ تو
نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام

کیا کہوں دیکھیے کیا ہوتا ہے انجام اِس کا
ہے پڑا دل کو میرے اِک بتِ خودکام سے کام

جو کہ ہیں قید سے اُس نام و نشاں کے آزاد
ایسے بے نام و نشاں رکھتے ہیں کب نام سے کام

واعظِ بے ہودہ گو بکتا ہے بکنے دو اسے
وہ تو دیوانہ ہے تم اپنے رکھو کام سے کام

دیکھنے والے جو ہیں اس کے رخ و زلف کے بس
نہ انھیں صبح سے مطلب ہے، نہ کچھ شام سے کام

گردشِ چشم کے سرگشتہ جو ہیں ان کو نہیں
عیش کچھ نیک و بدِ گردشِ ایّام سے کام

(۱)

مت لگا مہندی کو تو اپنے نگارا، ہاتھ میں
گر یہی ہے شوق، خوں مل لے ہمارا ہاتھ میں

خیر جو کچھ ہو سکے یاں تجھ سے، کر لے آنہ چوک
وقت آنے کا نہیں پھر یہ دوبارا ہاتھ میں

تم صریحاً مجھ کو مکراتے ہو، کل آیا رقیب
سب کے آگے پہن کے چھلا تمھارا ہاتھ میں

ہاتھ میں دل لے کے کرنا نرم اُسے مشکل ہوا
موم ہو جاتا تھا جس کے سنگِ خارا ہاتھ میں

پہنچا جب تیری کمر تک، کچھ نہ بن آئی اُسے
رہ گیا لے کر قلم مانی بچارا ہاتھ میں

گر نصیب اچھے ہوں، تو ہاں خاک بھی ہو جائے زر
اور بُرے ہو دیں تو حلوہ بھی ہو گارا ہاتھ میں

عیشؔ کو تیری ہی جوادی کا تکیہ ہے فقط
کچھ ہُنر رکھتا نہیں یہ ہیچ کارا ہاتھ میں

(۲)

شوق سے لیجیے یہ حاضر دل وجاں دونوں ہیں
کر چکے نذر یہ ہم آپ کے ہاں دونوں ہیں

عاشق و شمع کی طاقت نہیں جو بول سکیں
رکھتے اس بزم میں ہر چند زباں دونوں ہیں
شکوۂ غیر ہو کیا اپنے جو ہیں دیدہ و دل
وہ بھی کم بخت مرے دشمنِ جاں دونوں ہیں
ہم کو دھمکاتے ہیں یوں ابرو و مژگاں کو دکھا
دیکھ لو پاس مرے تیر و کماں دونوں ہیں
نام کیوں عشق کا بد کرتا ہے ہر کام میں یاں
ناصحا دیکھ یوں ہی سود و زیاں دونوں ہیں
ایک ہیں سینے میں آفت، جگر و دل دونوں
الغرض جان کے دشمن یہ یہاں دونوں ہیں
دیدۂ تر جگر و دل کی بدولت شب و روز
فرقتِ یار میں خوں نابہ فشاں دونوں ہیں
اس سے ہے ربط سوا بلبل و عاشق میں صنم!
کیوں وہ ہم مشرب و ہم دردیہاں دونوں ہیں
رات دن عیش مری طرح سے وہ بلبلِ زار
وادیِ ہجر میں سرگرمِ فغاں دونوں ہیں

(۳)

تو نے ان دانتوں کی سی آب اے گہر پائی کہاں
لعل نے[1] اس لعلِ لب کی سی درپائی کہاں

---

[1] ناقل نے پہلے لفظ "نے" لکھا اور پھر اسے قلم زد کر کے "میں" تحریر کیا۔ اس لیے کہ قافیہ میں لفظ دریائی پڑھا گیا دراصل قافیہ پائی تھا۔ اسی مضمون کو عیش نے ایک دوسرے مطلع میں بھی نظم کیا ہے۔ مطلع :- متقابل اس دُرِ دندان کے گُہر کیا ہے
اور عیش لعل کی اس لب کے آگے در کیا ہے

جوشِ وحشت میں چلیں ہم دو قدم دل کھول کر
عرصۂ صحرا نے وسعت اس قدر پائی کہاں
کہتے اس بے رحم سے ہم دردِ دل اپنے بھلا
ہم نے فرصت تجھ سے اے دردِ جگر پائی کہاں
جو کہ سرخی و نزاکت اس لبِ نازک میں ہے
وہ نزاکت تو نے اے گلبرگِ تر پائی کہاں
ہم نگاہوں میں پرکھتے ہیں جواہر کی طرح
جوہرِ انساں، کسی نے یہ نظر پائی کہاں
ہستیِ موہوم اپنی ہے یہ جیسی بے ثبات
بے ثباتی تو نے ایسی اے شرر پائی کہاں
ناسخؔ و آتشؔ سے یہ کہ دو کوئی تم نے بھلا
طرزِ عیشؔ و حضرتِ ذوقؔ و ظفرؔ پائی کہاں

(۴)

آئے گی اجل، نہیں ہے چارہ اس میں
بچ رہوے، نہیں کسی کو یارا اس میں
افشا کیا راز سب حیا نے ان کی
ہے، کہیے، قصور کیا ہمارا اس میں
آنکھوں نے تو کی یہ لڑکے آفت برپا
مارا گیا مفت دل بچارا اس میں

(ق)

کھوتے ہو جو عمر فکرِ دنیا میں تم
تم جانو ہے سر بسر خسارا اس میں
دنیا نہیں جائے استقامت، سمجھو
ایک آن کی آن ہے گزارا اس میں

ے پاؤں کیا وحشت نکالے وسعت صحرا ہے کم
دو قدم دل کھول کر چلیے زمیں اتنی تو ہو (عیشؔ)
ایک قدم وحشت میں اٹھا تھا کہ یاں
دیکھیے کیا ہیں کہ صحرا ہو چکا (عیشؔ)

جو ہو سکے خیر اس میں، تم بھی کر لو　　آنا نہیں جا کے پھر دوبارا اس میں
ہو گزرے ہیں بادشاہ کیسے کیسے　　جمشید و سکندر و دارا اس میں
پھر آخر کار اجل نے، دیکھو　　کس کس حسرت سے ان کو مارا اس میں
تم سوچو بقولِ عیشؔ سچ ہے یہ بات
ایک آن کی آن ہے گذارا اس میں

(۵)

دردِ دل کس سے کہیں طاقتِ تقریر نہیں
اور اگر لکھیے تو وہ قابلِ تحریر نہیں
کارگر ہوتی کسی طرح کی تدبیر نہیں
جب تلک ہوئے موافق اجی تقدیر نہیں
اس کو کیا کیجیے، اس کی کوئی تدبیر نہیں
کرتا ہر بات پہ ہے وہ بتِ بے پیر "نہیں"!
جو کہ پابند ہیں اس زلفِ مسلسل کے، انھیں
چھوڑ دو شوق سے، کچھ حاجتِ زنجیر نہیں
ہم چکھا دیتے مزا اس فلکِ پیر کو عیشؔ
کیا کریں آہ میں پہلی سی وہ تاثیر نہیں

(۶)

بیٹھا جب مونڈ منڈا یار کے در پہ میں ہوں
کیوں نہ دعویٰ ہو مجھے یہ کہ قلندر میں ہوں
دیکھتا بدلے ہوئے آپ کے تیور میں ہوں
یہ تو فرمایئے کیا آپ پہ دو بھر میں ہوں
برق بھی اس کو اگر دیکھے تو چھکے چھٹ جائیں
رکھتا پہلو میں وہ اپنے دلِ مضطر میں ہوں

فرصتِ زیست بہت کم ہے، جو آنا ہو تو آ
منتظر تیرے لیے اور بھی دم بھر میں ہوں

کیونکہ خاطر نہ پریشاں ہو، کہے ہے شانہ
داخلِ سلسلۂ زلفِ معنبر میں ہوں!

کس کی چھاتی ہے کہ جو سامنے اس کے ٹھہرے
ہدفِ ناوکِ مژگانِ ستم گر میں ہوں

چھیڑ کچھ خوب نہیں، جانے دے اے بت، باز آ
آگے تو جان سے بری ہو گیا کہ کر میں ہوں

مجھ کو معلوم ہے سب دیدہ و دانستہ صریح
ٹال دیتا تری ہر بات کو ہنس کر میں ہوں

دیکھ اُس رخ کی طرف رکھتے ہیں آئینہ جسے
وہ بھی حیران ہے اور ساتھ ہی ششدر میں ہوں

میں کی گردن پہ چھری یوں کہے خورشیدِ فلک
سامنے میرے رخِ یار کا ہمسر میں ہوں

جس کا دل ہوئے تونگر وہ یہ کہوے تو بجا
دل تونگر ہے مرا عیشؔ، تونگر میں ہوں

و

(۱)

کر نہ فرسودہ تو اپنے ناحقِ تدبیر کو
سونپ دے سب کام اپنے خالقِ تقدیر کو

اس کو لکھ رکھ، دم کے دم میں کچھ سے کچھ ہو جائے گا
مت ستا، آمان کہنا، عاشقِ دلگیر کو

لے نہ کوئی اصفہانی اور الماني کا نام
دیکھ لیوے ابروے قاتل کی گر شمشیر کو

ضبطِ آہ و نالہ تو ممکن ہے عاشق سے مگر
یہ بتاؤ کیا کرے وہ رنگ کی تغییر کو

چشمِ کم سے خاکساروں کو نہ دیکھا چاہیے
اُن کو وہ حاصل ہے جس پر رشک ہے اکسیر کو

یہ وہی آہیں ہیں جو کرتی تھیں خارا میں اثر
ان کی اب، کیا جانیے کیا پتھر پڑے تاثیر کو

یہ تو بتلا دو کہ ایسا تم کو کیا دو بھر تھا عیش!
دے دیا جو تم نے دل ایسے بتِ بے پیر کو

(۲)

دل کہا مان تو وہ کاکلِ بلدار نہ چھو
کہہ دیا، دیکھ وہ کافر ہے سیہ مار، نہ چھو

برق و سیماب کو تو چاہے تو ہاں شوق سے چھیڑ
پر کسی کے دلِ بیتاب کو زنہار نہ چھو

سوزِ الفت ہے بھرا اس میں مسیحا تو جان
ہاتھ جل جائے گا نبضِ دلِ بیمار نہ چھو

کبھی زخموں سے نہیں بھرنے کی نیت اس کی
زخمِ دل لیوے گا جب تک لبِ سوفار نہ چھو

چھوتا اس آہِ شرر بار کا کچھ کھیل نہیں
برق سے کہہ دو کہ ہو جائے گی فی النار نہ چھو

مرغِ دل خالِ رخ و زلف سے ہے دانہ و دام
دیکھ، اس دانے کو، ہوئے گا گرفتار، نہ چھو

پاس ایمان ہے تو مصحفِ رخ کو اس کے
بے وضو عیشؔ تو ہوئے گا گنہگار نہ چھو

(۳)

جو پہنچے ختن میں اُس زلفِ عنبریں کی بُو
تو ہووے منفعل اُس بُو سے مشکِ چین کی بُو

چمن میں کرتی ہے شرمندہ نکہتِ گل کو
نسیم اس عرقِ روے مہ جبین کی بُو

بن اُس کے زہرِ ہلاہل ہے ساقیا میرے
مشامِ جاں کو مئے لعلِ آتشین کی بُو

رہے ہے دست و گریباں دل و جگر سے مرے
الٰہی کس کے گریبان و آستیں کی بُو

وہ بُو ہے اس تنِ صد رشکِ گلستاں میں کہ عیشؔ
نہ بوے گل اسے پہنچے، نہ یاسمین کی بو

(۴)

دل کی دل ہی کو خبر ہووے تو ہو
مطلع وہ ہے اگر ہووے تو ہو

نامہ لے کر جاسکے کون اُس کے پاس
مرغِ دل ہی نامہ (بر) ہووے تو ہو

سیر اُس عالم کی کچھ آساں نہیں
اِس طرف سے بے خبر ہووے تو ہو

اے دلِ ناداں! اُس دل میں اثر
تیرے نالوں میں اثر ہووے، تو ہو

یوں ملاقات اس سے ہوسکتی ہے کب
اُس کو بھی مدِ نظر ہووے تو ہو

عشق سے ناصح، نہ باز آئیں گے ہم
جان کا اُس میں ضرر ہووے، تو ہو

اور ہوسکتا ہے کون اُس سے دوچار
عاشقِ آشفتہ سر ہووے، تو ہو

سیر نخچیروں کی نیت زخم سے
پار تیر اس کا دوسر ہووے تو ہو

سوزنِ مژگاں سے بس اس کے ہی عیشؔ
بخیۂ چاکِ جگر ہووے تو ہو

(۵)

رچی دماغ میں ہو جس کے اس بدن کی بو
خوش آوے کب اسے نسرین و نسترن کی بو

وہ جس نے سونگھی ہو اک دفعہ اس کے تن کی بو
نہ عطر کی اسی بھاوے، نہ یاسمن کی بو

ہزار جان سے مشکِ ختن ہو حلقہ بگوش
جو سونگھ لے کبھی اس زلفِ پُرشکن کی بو

بسا ہو دل میں بھلا جس کے وہ گُلِ خوبی — پسند آئے اسے کس طرح چمن کی بو
مشامِ جاں ہوئی یعقوب کی وہیں تازہ — جو پہنچی مصر سے یوسف کے پیرہن کی بو
کہاں ہے سیب میں سیبِ ذقن کی سی بو باس — جہاں میں روح فزا ہے تو ہے ذقن کی بو
مشامِ جاں کو تر و تازہ عیشؔ کرتی ہے
جہاں کے باغ میں گلدستۂ سخن کی بو

---

(۶)

چشمِ گلگوں ہیں کہ اینڈے ہیں یہ مستانے دو
یا بھرے ہیں مئے گلرنگ کے پیمانے دو
شوق سے آکے بسے اس میں تصور تیرا
دیدۂ تر کے یہ طیار میں خسخانے دو
دیدہ و دل میں پری زادوں کی بستی ہے شبیہہ
یہ دل و دیدہ ہیں یا ہیں پری خانے دو
دیکھنے والے ہیں اپنے ہی جہاں میں وہ بھی
قیس و فرہاد جو مشہور ہیں دیوانے دو
کیوں نہ ہو ان کا تن عریان و برہنہ سر و پا
عاشقی میں یہی عشاق کے ہیں بانے دو
واعظِ بے ہودہ گو، ناصحِ بے ہودہ سرا
روز آ بیٹھتے ہیں مجھ کو یہ سمجھانے دو
وہ بھی چاہے تو ہے لطفِ عیشؔ بقولِ شاعر
ورنہ کہنے کو تو مل بیٹھے ہیں بیگانے دو

(۷)

کیونکہ سینے میں نہ تڑپیں جگر و دل دونو — ہیں وہ تیغِ نگہِ یار کے بسمل دونو

دوست ہم جانتے تھے دیدہ و دل کو اپنا ہو گئے وہ بھی مری جان کے قاتل دونو
قلعی کھل جائے مہ و خور کی جہاں میں سب پر گر کیے جائیں وہ اس رخ کے مقابل دونو
قیس و فرہاد جو سرخیل ہیں دیوانوں کے وہ بھی ہیں اس ترے دیوانے کے قائل دونو

قافیے اس غزلِ تازہ میں ہم نے دیکھو!
عیشؔ کس زور سے باندھے ہیں بمشکل دونو

---

(۸)

دخترِ رز دیکھے جو اس چشم کے مستانوں کو
تو ابھی آگ لگا دے مے و میخانوں کو
آگ میں عشق کی جلتے ترے دیوانوں کو
دیکھ شب بزم میں رشک آ گیا پروانوں کو
قیس و فرہاد جو سرخیل ہیں دیوانوں کے
اُن کے بھی ہوش اڑے سُن مرے افسانوں کو
جب یگانوں کا یہ ہو حال کہ ہوں دشمنِ جاں
دوش دیوے کوئی پھر کیا لہو بیگانوں کو
دورِ کس چشمِ سیہ مست کا یاد آیا کہ یوں
توڑ کر پھینک دیا رندوں نے پیمانوں کو
بدگمانی ہے یہاں تک کہ نہ مل جائیں کہیں
اس لیے روز بدلتا ہے وہ دربانوں کو
گر نہیں سودۂ الماس، بلا سے نہ سہی
سربسر زخم مرے توڑ نمک دانوں کو
تیرے عشاق پریشان ہیں نہ زلفیں سلجھا
یوں پریشان نہ کر اس طرح پریشانوں کو

جوہری جانتے ہیں خوبی جوہر اے عیش
تیرے اشعار کی ہے قدر سخن دانوں کو

(۹)

جگر خوں شدہ کا حال حنا سے پوچھو
اور پریشانیِ دل زلفِ دوتا سے پوچھو

استخواں ریزہ (و) شورابہ کشِ غم کا مزار
پوچھتے ہو تو چلو چل کے ہما سے پوچھو

جیسی بے دردی سے توڑا ہے مرا شیشۂ دل
اس کا حال اپنے ہی تم سنگِ جفا سے پوچھو

ہم سے کیا پوچھتے ہو اپنے ستم کا احوال
اپنا ظلم اپنے ہی تم ناز و ادا سے پوچھو

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شرحِ طپشِ دل کو مری
جا کے اے قبلۂ من قبلہ نما سے پوچھو

میں نے افشا کیا کیا؟ راز کے افشا کا سبب
میری جاں اپنی ہی تم شرم و حیا سے پوچھو

دشتِ وحشت میں مری سرزنشِ خار کو عیش
ہاتھ آئے تو کسی برہنہ پا سے پوچھو

(۱۰)

چھیڑے اس کو نہ ذرا بادِ صبا سے کہہ دو
نہ کرے چھیڑ کہیں زلفِ دوتا سے کہہ دو
ہم کہے دیتے ہیں تیرِ نگہِ قاتل سے
اک ذرا بچ کے چلے تیرِ قضا سے کہہ دو

۱۔ اصل : جواہر
۲۔ اصل : پوچھتے
۳۔ اصل : کے

جب تلک چونچ نہ پیدا کرے وہ آتشگیر
ہڈیاں میری نہ کھاوے یہ ہما سے کہہ دو

امتحاں پر ہے مزاج اس بتِ سفّاک کا آج
ہو مبارک تمھیں یہ اہلِ وفا سے کہہ دو

خون برسائے گا عاشق، جو خبر سُن پائی
زیبِ پا اس کے نہ ہو رنگِ حنا سے کہہ دو

ہم بُری طرح سے پیش آئیں گے آ آ کے یہاں
نہ بکے، واعظِ بے ہودہ سرا سے کہہ دو

سیکھ جا آ کے تڑپنا دلِ بسمل سے مرے
سیکھنا ہو تجھے گر، قبلہ نما سے کہہ دو

مجھ کو سمجھاتے ہیں جو واعظ و ناصح آ آ
اس سے کیا فائدہ ہے، اُن حمقا سے کہہ دو

عیشؔ جو ہو سو ہو اب حالِ دلِ زار اپنا
وہ سنے یا نہ سنے تم تو بلا سے کہہ دو

(۱۱)

نسیم لاتی ہے تو لا شمیم کاکل کو
میں کیا کروں گا تری لے کے نکہتِ گل کو

خدا کے واسطے اس درد سے نہ کر نالے
مری طرف سے کوئی کہہ دو اتنا بلبل کو

دکھو تو فکرِ معیشت میں عمر بے ہودہ
تجھے وہ بھولے گا کیا رزق دے ہے جو کل کو

جو اس کی چشمِ سیہ مست کے ہیں دیوانے
نہ آنکھ اُٹھا کے وہ دیکھیں گے ساغرِ مُل کو

جو اس کی چشمِ سیہ مست کے ہیں متوالے
کریں گے عیشؔ وہ کیا لے کے ساغرِ مُل کو

(۱۲)

جہاں میں کیسی ہے بے قدریِ سُخن دیکھو
کبھی سُنی نہ تھی سو اب وہ ان سُنی دیکھو

تھے آگے نوبت و نقارہ جن کے ہاں سو اب — لیے پھرے ہیں وہ ہاتھوں میں ٹُنٹُنی دیکھو

رقیب بزم ہے اس شعلہ خو کی تو ہم سے — یہ باتیں کرتے ہیں کیسی جلی بُھنی دیکھو

تمھارے سوختہ جانوں کو کیا تماشا ہے — دوا بھی دے ہے تو کر کر کے گُن گُنی دیکھو

بڑے غرور تھے جن جن کو عیشؔ اب اُن کے
کہیں بھی نام کو باقی ہے بِھن بُھنی دیکھو

(۱۳)

ہو گیا ویران دہلی و دیارِ لکھنؤ — اب کہاں وہ لطفِ دہلی و بہارِ لکھنؤ

باغِ دہلی تو ہوا یوں یک قلم برباد اور — مل گیا سب خاک میں نقش و نگارِ لکھنؤ

اہلِ جوہر تو ملائے خاک میں دہلی کے دُوں — اور کیے یوں بے سر و پا دستکارِ لکھنؤ[ف]

جو تھے دہلی میں عمائد وہ کیے یکسر خراب — اور قبہ سارے کیے صاحب وقارِ لکھنؤ

تھا خس و خاشاکِ دہلی غیرتِ صد لالہ زار — رشکِ صد گلزار تھا ایک ایک خارِ لکھنؤ

سو فلک نے یوں کیا دہلی کو تو پامالِ جور — اور کیا وقفِ جفا ہر برگ و بارِ لکھنؤ

رشکِ صد خورشید تھا ہر ذرۂ دہلی سنا — مارتا چشمک صفا پر تھا غبارِ لکھنؤ

غم میں دہلی کے، گلوں کے تو گریباں چاک ہیں — اور سوسن ہے چمن میں سوگوارِ لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سُن کے عیشؔ!
اور دل پھٹتا ہے سُن کر حالِ زارِ لکھنؤ

(۱۴)

وصلِ جاناں ہی سے کم کچھ غم کی شدّت ہو تو ہو
سو یہ حاصل بات جب ایسی ہی قسمت ہو تو ہو

آدمی کو شکل و صورت سے نہ کہیے آدمی
آدمی جب آدمی میں آدمیت ہو، تو ہو

مینھہ برستا ہے بڑا حسرت کا اس پر رات دن
یہ تو اس ناکام الفت کی ہی تربت ہو تو ہو

ف۔ د: رہ گئے یوں بے سر و پا وضعدارِ لکھنؤ

عاشقی سے منع کیوں کرتا ہے واعظ تو ہمیں　　یہ نہیں ہوگی اذیت پھر اذیت ہو تو ہو
امتیازِ نیک و بد بے اس کے ہو سکتا نہیں　　یہ فقط انسان میں جب کچھ حمیت ہو، تو ہو
کام سارے منحصر نیت پہ ہیں انسان کی　　سو درستی ان کی جب اصلاحِ نیت ہو، تو ہو
تیرا کہنا میرے سر آنکھوں پہ ہے واعظ مگر　　کارگر تا بو میں جب اپنی طبیعت ہو تو ہو
رند کہتے ہیں کریں گے ان کی خدمت ایک دن　　شیخ جی صاحب کو جب شاید نصیحت ہو تو ہو

سر سے پاؤں تک گناہوں میں ہے تو ڈوبا ہوا
عیشؔ اس کے فضل سے تیری بریت ہو تو ہو

(۱۵)

کہا، جو رحم مرے حال پر ذرا کھاؤ　　تو ہنس کے بولے کہ چلتے بنو ہوا کھاؤ
نہیں ہے یہ خبط تو کیا ہے جو حضرتِ ناصح　　مریضِ عشق کو فرماتے ہو دوا کھاؤ
تم اس سے ملتے تو ہو رات دن پہ حضرتِ دل　　مجھے یہ ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو، دغا کھاؤ
کہو یہ حضرت ناصح سے، قبلہ و کعبہ!　　خدا کے واسطے جاؤ، نہ سر مرا کھاؤ
جو ان سے شدتِ غم اپنی ہم لگے کہنے　　تو بولے ہو کے خفا جاؤ سنکھیا کھاؤ
حصول ان کی ملاقات سے نہیں کچھ اور　　مگر یہ بات کہ ہاں گالیاں سدا کھاؤ
مقابل آتے ہو اس رخ کے اے گلو دیکھو　　کہیں نہ ایسا ہو تم لطمۂ صبا کھاؤ
بتاؤ تو یہی دبتے ہو اس سے کیوں اتنا　　بلا دبے ہے کسی کا نہ جب دیا کھاؤ

نہ کھاؤ تم غمِ دنیائے دوں مگر ہاں عیشؔ
جو کھاؤ غم تو غمِ آلِ مصطفےٰ کھاؤ

ی

(۱)

کرم کر حال پر میرے خدارا، یا رسول اللہ
میں کیوں مسکین و عاجز ہوں تمھارا، یا رسول اللہ

ہوئی امید اسی دم اس کی، درگاہِ الٰہی سے
غریبی میں تمھیں جس نے پکارا، یا رسول اللہ

تری چشمِ کرم سے سختیِ ایام تو کیا ہے
وہ وہ ہے جس سے ہووے موم خارا، یا رسول اللہ

وسیلہ جس نے پکڑا تم کو اس کا ایک دم میں، ہاں
خدا نے پار بس بیڑا اتارا، یا رسول اللہ

شہا، تم وہ ہو حالِ دین و دنیا سے حق تعالیٰ نے
کیا ہے تم پہ سب کچھ آشکارا، یا رسول اللہ

یہاں اور واں تو ہی ہے باعثِ بخشایشِ عالم
نہ کیوں ہووے تو ہی اللہ کا پیارا، یا رسول اللہ

جو ہووے ناصیہ سا تیرے دروازے کا پھر اس کا
نہ ہو کیوں کر بلندی پر ستارا، یا رسول اللہ

یہاں بھی ہو وسیلہ بس تمھیں، اور آخرت میں بھی
تمھارا ہی ہے بس ہم کو سہارا، یا رسول اللہ

جنابِ حق سے تقصیریں ہم سبھوں کی بخشوا دو کیوں
ہے پکڑا سب نے آ دامن تمھارا، یا رسول اللہ

تمھاری امتِ عاصی بہت تکلیف پاتی ہے
نہیں ہوتا کہیں اس کا گزارا، یا رسول اللہ

کیا ہے رحمۃ اللعالمیں اللہ نے تم کو
نہ کیجیے ہم پہ یہ حالت گوارا، یا رسول اللہ

برے ہیں یا بھلے ہیں، جو ہیں، پر ہم سب تمھارے ہیں
نہیں تیرے سوا کوئی ہمارا، یا رسول اللہ

نظرِ الطاف کی کر، ہم پہ کیوں چرخِ ستمگر نے
کیا ہے غم سے دل کو پارا پارا، یا رسول اللہ

دعائیں بھی ہمارے واسطے کر اب نہیں ہم کو
بس اس تکلیف کے سہنے کا یارا، یا رسول اللہ

درِ دولت پہ تیرے یہ شفاعت خواہ آیا ہے
ہو مقبول عرضِ عیشِ ہیچ کارا، یا رسول اللہ

(۲)

خدا ہی جانے کہ کیوں دل کو اضطراب ہے یہ — بغل میں دل نہیں، اک جان کو عذاب ہے یہ
کہے ہیں جس کو کہ ہستی سو ایک خواب ہے یہ — نمایش اس کی ہے دھوکا فقط سراب ہے یہ
بندھا رہے ہے سدا دل کو اس کی زلف کا دھیان — سو اس کا باعث و منشاءِ پیچ و تاب ہے یہ
برا نہ کہیے جوانانِ رندِ مشرب کو — معاف رکھیے انھیں عالمِ شباب ہے یہ
بسانِ برق ہے ہر لحظہ دل کو بے چینی — فراقِ یار میں حالِ دلِ خراب ہے یہ
ابھر نہ اتنا تنک ظرف، بحرِ عالم میں — کہے ہیں زندگی جس کو سو بس حباب ہے یہ

تمام عمر گزاری ہوائے نفس میں عیشؔ!
دکھائیں گے انھیں منہ کیا، ہمیں حجاب ہے یہ

(۳)

لعل کو دیجو نہ تشبیہ لبِ لال کے ساتھ — مردمِ چشم کو نسبت نہیں اُس خال کے ساتھ
مال دیتا ہے جسے چرخ اسے چین کہاں — دیکھو چرخی کو بھی گردش ہے سدا مال کے ساتھ
خال کیوں ابروئے قاتل کے نہ ہو پہلو میں — خوش نما ہوتی ہے تلوار جو ہو ڈھال کے ساتھ
کیوں نہ مشہور ہو عالم میں فلکِ دوں پرور — ہے ہمیشہ سے تعلق اسے ارذال کے ساتھ
شیخ کی شکل کسی سے نہیں ملتی لیکن — کچھ مشابہ (رہے) تو ہے صورتِ دجّال کے ساتھ
زلف کہتے ہیں جسے گانٹھ کی وہ پوری ہے — سیکڑوں بستہ ہیں دل اس کے ہر اک بال کے ساتھ

لغو سمجھے ہیں سب اُس قول کو اہلِ تحقیق
عیشؔ وہ قول موافق جو نہ ہو حال کے ساتھ

(۴)

جان کھنچتی ہے خیالِ نگہِ یار کے ساتھ — مبتلا ہے دلِ بیمار اس آزار کے ساتھ
اُنس وحشت میں ہے ہاتھوں کو گریبان سے اور — ربط ہے آبلہ پائی کو مری، خار کے ساتھ
ہوتا یہ کیونکہ نہ حاصل اسے ظاہر میں عروج — نسبتِ معنوی منصور کو تھی دار کے ساتھ
اُس کو کس طرح ہو جمعیتِ خاطر، جس کے — بستگی دل کو ہو اُس زلف کے ہر تار کے ساتھ

ے اصل: "دکھائے گی"

ابر نیساں کبھی ہوتا نہ مقابل زنہار — دیکھ تو جان مری چشم گہربار کے ساتھ
شیخ ظاہر میں برہمن سے جھگڑتا ہے عبث — ربط باطن میں ہے تسبیح کو زنار کے ساتھ
عوضِ بوسہ اگر چاہیے دل حاضر ہے — اس میں کیا عذر رہے انکار ہے انکار کے ساتھ

نہیں یارائے زباں عیشؔ جو میں تم سے کہوں
حق کے الطاف جو ہیں مجھ سے گنہگار کے ساتھ

(۵)

ہے صلح ساتھ صلح کے اور شر ہے شر کے ساتھ — رکھتا معاملہ یہ بشر ہے بشر کے ساتھ
ہر اک کا آب و دانہ ہے ہر اک کے ساتھ یوں — ہے آب و دانہ جیسے گہر کا گہر کے ساتھ
یہ کیا اثر ہے دیکھو تو اک پل میں ملتی ہے — کر جاتی کام کیا ہے نظر بھی نظر کے ساتھ
دل نے بھی دے دیا جگر خستہ کو جواب — ہاں اک رفیقِ دردِ جگر ہے جگر کے ساتھ
بالطبع میل مثل کو ہوتا ہے سوے مثل — کھنچتا جہاں میں یارِ سنار زر ہے زر کے ساتھ
دوری ہو کیونکہ جوہر ذاتی کو ذات سے — رہتا ہمیشہ نورِ قمر ہے قمر کے ساتھ
ہے فرق لعل و سنگ میں جوہر کا بس فقط — دیتا میں قدر اہلِ ہنر ہے ہنر کے ساتھ

ہر اک کا آب و دانہ ہے ہر اک کے ساتھ یوں
جیسے کہ عیشؔ آب گہر ہے گہر کے ساتھ

(۶)

باغ میں کرتی ہے عشقِ ذکر آ، آ، فاختہ — بہر قطعِ ماسوی اللہ، روز مرّا فاختہ!
ہے اسی کوکو پہ تجھ کو اپنی غرّا فاختہ! — بلبلِ شیدا کے آگے جا نہ ٹرّا فاختہ!
ہمسری کا اس سے گر دعویٰ کیا تو نے تو بس — تا قیامت تجھ پہ ہووے گا تبرّا فاختہ!
سن لیا گر شور میرے نالۂ پُر درد کا — بید کی مانند ابھی جائے گی تھرّا فاختہ!
تو تو کیا ہے مرغ و ماہی تک ابھی ہوویں شکار — آہ کا اپنی اگر چل جائے چھرّا فاختہ!

ے اصل : نے،

گرمیِ الفت تو وہ ہے، دیگِ تن میں گوشت کیا — ہڈیاں تک گھل کے ہو جائیں مُہرّا، فاختہ!
عندلیبِ زار کے نالوں میں ہے جو دردِ دل — وہ نہیں کوکو میں تیری ایک ذرّا، فاختہ!
عاشقِ صادق ہے تو گر سروِ لبتاں کی تو بس — غیر کی الفت سے دل کو رکھ مُعرّا، فاختہ!
ہنس کے بلبل نے پڑھا کل عیشؔ یہ مصرعِ نظیر
خوش پسندیداست سروِ بے ثمر را فاختہ

(۷)

ے فلک، طرزِ جفا یار سے سیکھ — سرزنشِ نوک، سرِ خار سے سیکھ
کہ دو یہ تیغِ صفا ہانی سے — بُرّش اُس ابروے خمدار سے سیکھ
مست کیا جانے ہیں لُطفِ مستی — طرزِ مستی، کسی ہشیار سے سیکھ
ابرِ نیساں، گہر افشانی تو! — آ مری چشمِ گہربار سے سیکھ
خاکساری و تواضع کی روش
عیشؔ، تو شاخِ ثمردار سے سیکھ

ی

(۱)

نہ کر فقیروں سے تو چھیڑ چھاڑ، دیوانے! نہ چھیڑ کر انھیں حق سے بگاڑ، دیوانے!
تو اپنے حق میں نہ بو، ان کو چھیڑ کر، کانٹے یہ اپنے پیچھے نہ چمٹا تو جھاڑ، دیوانے!
تو اپنی طرح سے مردانِ حق کو مردہ نہ جان یہ مردہ وہ ہیں کہ ڈھا دیں پہاڑ، دیوانے!
غبار ان کا ملائے گا خاک میں تجھ کو تو اس کو دامنِ خاطر سے جھاڑ، دیوانے!
رہے ہے ان کے سنا عزتِ الٰہی ساتھ ہوئے ہیں حق کے جو سب چھوڑ چھاڑ، دیوانے!
جو ان کی کرتا ہے کوئی جہان میں توہین حق ان کو دیتا ہے جڑ سے اکھاڑ، دیوانے!
خدا کے واسطے تیرے بھلے کی کہتا ہوں یہ دل سے دفترِ باطل تو پھاڑ، دیوانے!
نہ کر فقیروں کو ناداں شکستہ دل، تو جان نہ ڈال خانۂ حق میں دراڑ، دیوانے!
پچھاڑتا ہے تو لڑ لڑ کے کیا فقیروں کو تو اپنے نفسِ لعیں کو پچھاڑ، دیوانے!
ثمر جو نیک تو چاہے تو مزرعِ دل میں بس ان کی نخلِ محبت کا گاڑ، دیوانے!

جو غیرِ حق انھیں سمجھے ہیں عیش ان کو سمجھا
کہ حق نے ان کو بنایا ہے آڑ، دیوانے!

(۲)

مقابل اس دُرِ دنداں کے یہ گہر کیا ہے اور عقیقِ لال کی، اس لب کے آگے، قدر کیا ہے
خیالِ یار میں ہوں محو بے خودی ایسا مجھے خبر نہیں، دل کیا ہے اور جگر کیا ہے
کہے ہے عشق میں ناصح کہ ہے ضرر دل کا جو واقعی ہے ضرر یہ ہی، تو ضرر کیا ہے
کیا ہے نوح کے طوفاں کو تو نے شرمندہ ارادہ اب ترا کہہ اور چشمِ تر کیا ہے؟

ملا ہے جس کو حشم قطع ماسوی اللہ کا
نظر میں اس کی یہ دنیا کا کرّ و فر کیا ہے

تو میری آہ سے سینہ سپر نہ ہو اے چرخ
تجھے خبر نہیں اس آہ میں اثر کیا ہے

تو راہِ عشق کے صدموں سے مت ڈرا واعظ
جو سر فروش ہیں اس رہ میں ان کو ڈر کیا ہے

ہمارا چاکِ جگر بخیہ گر سیے گا چہ خوش
یہ چاک وہ نہیں مقدورِ بخیہ گر کیا ہے

خیال جس کو رخ و زلفِ یار کا ہے بندھا
وہ جانتا ہی نہیں شام اور سحر کیا ہے

ہے دل کو ناز ترے جس جہانِ فانی پر
بتا وہ اور بجز خانۂ دو در کیا ہے

تو کس گھمنڈ پہ مثلِ شرر اچھلتا ہے
خیال دل میں تو کر ہستیِ شرر کیا ہے

خدا نے کھولا ہے یہ راز جن پہ عالم میں
وہ جانتے ہیں کہ ماہیّتِ بشر کیا ہے

بتوں کو سجدۂ در کے سوا بتا اے عیش!
جہاں میں ہم نے کیا اور عمر بھر کیا ہے

(۳)

نکلی اس زلف کے ہو کر یہ صبا پاس تو ہے
آتی کیوں اس میں سے اُس زلف کی بُو باس تو ہے

شغل کچھ چاہیے بہلانے کی خاطر دل کے
نہیں گر وصل کی اُمید، چلو یاس تو ہے

نہ سہی اس سے ملاقات بظاہر، نہ سہی
للہ الحمد تصوّر میں مرے پاس تو ہے

نمک و مشک بھی کر مرہم زنگار میں حل
اس میں ہر چند ملا سودۂ الماس تو ہے

پھیر لیتا ہے مجھے دیکھ، وہ منھ غیروں سے
دل میں کچھ ہو، پہ بظاہر یہ مرا پاس تو ہے

آگے قسمت، نہیں تقدیر کے لکھے کی خبر
اس کے ملنے کی یہ اللہ سے ہمیں آس تو ہے

منع بکنے سے نہ کر ناصح ناداں کو، عیشؔ!
اور گر کچھ نہیں، یہ ہی سہی، بکواس تو ہے

(۴)

عشق میں نوبت اب بجاں آئی
کارد ایلو، بہ استخواں آئی

آپ آئے، تو آئے، لو کس وقت
لب پہ جب جانِ ناتواں آئی

کب چھپائے سے چھپ سکے ہے وہ
بات جو بر سرِ زباں آئی

دعویٔ عشق کھل گئے سب کے
جب کہ نوبت بہ امتحاں آئی

ہے طبیعت ہی تو یہ انسان کی
آئی کم بخت یہ جہاں آئی

موسمِ گل میں عندلیبِ چمن
ق
روکے کہتی بصد فغاں آئی

آہ دیکھو تو دفعتاً کیسی
گلشنِ ہند میں خزاں آئی

نظرِ رحمتِ خدا اے کریم
ق
عیشؔ جب سوئے عاصیاں آئی

ہو گیا ہر گناہ شادیٔ مرگ
اور یہ بیت بر زباں آئی

اے نثارِ تو بر گنہ گاراں
از سرِ لطف آں چناں آئی

(۵)

کہے ہیں جس کو کہ دل عرشِ کبریا یہ ہے
اسے نہ ڈھاؤ، میاں، خانۂ خدا یہ ہے

کیا ہے ایک تو تیرِ نگہ سے دل زخمی
اور اس پہ نون چھڑکتے ہیں وہ، مزا یہ ہے

سوائے وصل نہیں چارہ گر علاج اس کا
مریضِ دردو غمِ ہجر کی دوا یہ ہے

بغل میں بیٹھ کے دل ہی ہوا ہے دشمنِ جاں
گلا ہو غیر کا کیا، حالِ آشنا یہ ہے
زباں پہ لا نہیں سکتے کہیں تو خاک کہیں
مکر گئے ہیں وہ دل لے کے ماجرا یہ ہے
بسانِ شیشۂ ساعت پُر از غبار ہے دل
چلی زمانے میں کچھ ان دنوں ہوا یہ ہے
جلانا عاشقِ شیدا کو لے کے دل، رہ و رسم
بتاؤ تو سہی اُلفت میں، کیوں جی، کیا یہ ہے؟
لیا ہے ایک تو دل چھین، دوسرے ہے خفا
ستم ہے ایک تو وہ، اس پہ دوسرا یہ ہے
فسانۂ غمِ عاشق ہے شہرۂ آفاق
غرض جہان میں اب ذکر جا بجا یہ ہے
سیے سے چاک گریباں کے میرے فائدہ کیا
ہزار بار تو اے بخیہ گر سیا یہ ہے
رُخ اُس کا دیکھ کے زلفوں میں، دل لگا کہنے
کہ جس کو کہتے ہیں کالبدر فی الدجا یہ ہے
جہاں میں سچ ہے اقارب ہیں کالعقارب، ہاں
ازل سے ان کی طبیعت کا مقتضا یہ ہے
نگاہِ لطف سے مطلب ہے ان کو دل لینا
یہ سب فریب ہے، اور اصل مدّعا یہ ہے
محاورات و مضامینِ شُستہ و رُفتہ
وہ طرزِ میر ہے اور طرزِ میرزا یہ ہے

سو عیشؔ پاتے ہیں تیرے کلام میں دونوں
تری زبان میں اعجاز اک نیا یہ ہے

(۶)

ستم تو یہ کہ بنی عاشقوں کی جان پہ ہے
اور اس پہ اُن کا مزاج اب تلک امتحان پہ ہے

زبان پہ کون سے شیریں دہن کا نام آیا
کہ جس کے نام کا اب تک مزا زبان پہ ہے

زمیں کی سطح پہ جس دن سے ہے بہار آئی
دماغ بلبلِ شیدا کا آسمان پہ ہے

لگا کے اس بُتِ قاتل نے سرمہ آنکھوں میں
چڑھائی اور یہ تیغِ نگہ سان پہ ہے

مدار دوستی و دشمنی کا اللہ نے
رکھا جہان میں انسان کی زبان پہ ہے

ہر ایک ذرّہ و ہر برگ و ہر شجر ہر سنگ
یہ دال قدرتِ خلّاقِ انس و جان پہ ہے

میں ریجھ بوجھ کا اے عیشؔ اس کی قائل ہوں
طبیعت آئی زلیخا کی کس جوان پہ ہے

(۷)

آپ ہم پہ بھلا ظلم و ستم کیا نہیں کرتے
پر اس پہ بھی ہم آپ کا شکوا نہیں کرتے

کس رات وہ گھر غیروں کے جایا نہیں کرتے
کس دن انھیں گھر اپنے بلایا نہیں کرتے

دل عاشقِ شیدا کا دکھایا نہیں کرتے
اللہ کا گھر ہے اسے ڈھایا نہیں کرتے

اس زلف کو سونگھا ہے جنھوں نے وہ کبھی تو
مشکِ ختن و عنبر و سارا نہیں کرتے

عشاق پہ ہاں ناز کیا کرتے ہیں معشوق
پر ان کی طرح نازشِ بیجا نہیں کرتے

جو سایہ نشیں اس کی ہیں دیوار کے وہ تو
ہرگز ہوسِ سایۂ طوبیٰ نہیں کرتے

سر بازہ جو ہیں کوچۂ سفاک میں جا کر
کب شورِ قیامت ہو برپا نہیں کرتے

دیں گر لبِ شیریں کا وہ اک بوسہ تو کیا ہو
پر کیا کریں، دل اپنا وہ کڑوا نہیں کرتے

---

۵ اصل : بتان

جو عاشقِ جانباز ہیں سر دیتے ہیں وہ لو ‎ ‎ معشوقوں سے تیور کبھی بدلا نہیں کرتے
معشوق کے وعدوں پہ یقیں آئے تو کیا آئے ‎ ‎ وعدہ تو وہ کرتے ہیں، پہ ایفا نہیں کرتے
غیرت جنھیں اللہ نے دی ہے وہ جہاں میں ‎ ‎ مر جاتے ہیں پر منتِ اعدا نہیں کرتے
معلوم ہیں سب اُن کے فریب عتیق وہ جھوٹے ‎ ‎ باتیں کہو کس روز بنایا نہیں کرتے

دکھلاتے نہیں باغ بھلا سبز وہ کس دن
کب ہاتھ پہ سرسوں وہ جمایا نہیں کرتے

(۸)

دل خانۂ خدا ہے تکریم اس کی کیجے ‎ ‎ عظمت کی وہ جگہ ہے تعظیم اس کی کیجے
پاؤ جو تم جہاں میں کوئی دلِ شکستہ ‎ ‎ کعبہ سے ہے وہ بہتر، ترمیم اس کی کیجے
کلمہ، درود، قرآں، ہے کہہ دیا یہ تم سے ‎ ‎ بس ہو سکے جہاں تک تعلیم اس کی کیجے
گر کچھ جہان میں ہے تو اسمِ ذات ہی ہے ‎ ‎ ہاں لوحِ دل پہ ہر دم ترقیم اس کی کیجے
فرصت جہاں میں کم ہے جو کام نیک ہووے ‎ ‎ ہر کام پر ہے بہتر تقدیم اس کی کیجے
روٹی کا ایک ٹکڑا اگر ہاتھ آئے تم کو ‎ ‎ لازم ہے راہِ حق میں تقسیم اس کی کیجے

گر کوئی بات اچھی اے عتیق تم کو کہوے
لازم ہے طوعِ دل سے تسلیم اس کی کیجے

(۹)

مل گئی خاک میں شانِ دہلی ‎ ‎ مٹ گیا نام و نشانِ دہلی!
نہیں برباد ہوا کوئی مکاں ‎ ‎ آ دنیا میں بسانِ دہلی
ہو گیا کیا کہوں پامالِ ستم ‎ ‎ ہائے ہر ایک مکانِ دہلی
وحشتِ غربت میں پھریں چھانتے خاک ‎ ‎ یوں فلک، پیر و جوانِ دہلی

۔ نذر ہلا (ف د: ۶۱)

گردِ کلفت ہوئی، افسوس، افسوس — غازۂ ماہ رُخانِ دہلی
شان و شوکت ہوئی آن کی برباد — جن سے تھی شوکت و شانِ دہلی
کیا ہوا فائدہ اے چرخ، تجھے — سچ بتا کرکے زیانِ دہلی
دیکھ، کہتی تھی جسے چشمِ فلک — ق کھاکے سوگند بجانِ دہلی
دوسرا گلشنِ دنیا میں چمن — نہیں سرسبز بسانِ دہلی
سو وہ ایسے ہوئے برباد کہ ہیں — بلبلیں مرثیہ خوانِ دہلی
نخل بندِ چمنِ دہر کو کیا — ناپسند آئی تھی آنِ دہلی
یک قلم یوں جو کیے اس نے قلم — نخلِ امیدِ کسانِ دہلی
قمریاں کرتی ہیں کوکو غم میں — ق کرکے اس طرح بیانِ دہلی
مل گئے خاک میں کیسے کیسے — اے فلک، سرو قدانِ دہلی
عندلیبانِ چمن ہیں نالاں — یاد کر غنچہ لبانِ دہلی
پہنی سوسن نے ہے نیلی پوشاک — کھا کے غم ماتمیانِ دہلی
پیچ کھاتی ہے یہ سنبل کر یاد — زلفِ پُرپیچ بُتانِ دہلی
لالہ ہو داغ بہ دل کرتا ہے — یادِ خالِ پری یانِ دہلی
یاد کر کرکے ہے نرگس حیراں — نگۂ خوش نگہبانِ دہلی
خوں بدل شام و شفق بھی کر یاد — زیبِ لبِ مسّی و پانِ دہلی
گل کھلایا یہ نیا عالم میں — بل بے نیرنگِ خزانِ دہلی
اب کہاں ہے وہ کلامِ شیریں — ہے کہاں اب وہ زبانِ دہلی
پیشہ ور ایسے کہاں ہیں پیدا — جیسے تھے پیشہ ورانِ دہلی

---

[1] کے ۔ الف د : ۶۱)

[2] پری یاں ۔ الف د : ۶۱)

[3] ہے ۔ (ف د : ۶۱)

مل گئے خاک میں سب اہلِ کمال　　مرمٹے قاعدہ دانِ دہلی
الغرض چرخِ جفاکار نے آہ　　خوانِ یغماکیا خوانِ دہلی
دل بھرا آتا ہے، خاموش ہو عیش!
تجھ سے سُن سُن کے بیانِ دہلی[1]

(۱۰)

اے خداوندِ بنائے دہلی!　　کر پھر آباد سرائے دہلی
تھے عجب کوچہ و بازار اس کے　　تھی عجب آب و ہوائے دہلی
وہ وہ گلزار تھے، سبحان اللہ　　کیا کرے کوئی ثنائے دہلی
ایک ادنیٰ یہی رکھتے تھے شرف　ق　بادشاہوں پہ گدائے دہلی
سُنتا تعریف اگر جنّتِ عدن　　چومتا آن کے پائے دہلی
یا یہ افلاس نے گھیرا اس کو　　یا وہ زرخیز تھی جائے دہلی
دل الٹ جائے ہے، جب آئے ہے یاد　　وہ نفاست، وہ صفائے دہلی
سُن کے بربادیِ دہلی ہر شخص　　روکے کہتا ہے کہ ہائے دہلی
سانپ سا چھاتی پہ لوٹے ہے عیش
یاد آتی ہے ادائے دہلی

(۱۱)

چاہے ہیں دردکشانِ دہلی　　ہووے آباد مغانِ دہلی
اب دعا ہے یہ خدایا تجھ سے　　پھر[2] ہو آباد مکانِ دہلی
تجھ سے مانگے ہیں شب و روز کریم!　　یہ دعا خورد و کلانِ دہلی!

---

[1] مقطع سے قبل اصل مخطوطے میں ناقل نے درج ذیل شعر کا اضافہ کیا ہے جو بحر اور وزن سے خارج ہے اور ناقل کی فکر کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔

اب یہاں مردوں کا یہ حال ہے یارو　　اپنی عورتوں کو بنایا پیشہ ورانِ دہلی

[2] اصل میں مصرع اس طرح نقل ہوا ہے ع کر پھر آباد ہو مکانِ دہلی

دور کر دل سے ہمارے غم کو — ہم ہیں کیوں غمزدگانِ دہلی

ہم گنہ گاروں پہ رحمت فرما! — کیونکہ بے کس ہیں کسانِ دہلی

ہم غریبوں کی ہو تقصیر معاف — ہم ہیں آشفتہ سرانِ دہلی

یہ غزل عیشؔ، دعا پر کر ختم

تا ہو موقوف فغانِ دہلی

(۱۲)

کیا جانئے اہلِ دہلی سے کیا بات ہو گئی — جو دہلی ایسی موردِ آفات ہو گئی

تھی رات وہاں کی دن سے بھی روشن زیادہ تر — یا وہ ہی ہے کہ دن کی وہاں رات ہو گئی

ہر شب شبِ برات تھی واں، روز روزِ عید — یارب وہ جا محلِ مخافات ہو گئی

یہ واردات دہلی کی وہ ہے کہ یاں تو کیا — مشہور تا بہ سبع سماوات ہو گئی

وہ سرزمین جو[1] مسکنِ قدسی صفات تھی — اب اس طرح وہ وقف بلّیات ہو گئی

حیرت[3] کی جا ہے یا اولی الابصار دیکھنا — مسمار کیسی کیسی عمارات ہو گئی

نقشِ قدم کی طرح سے سب خاک میں ملے — سو[4] اب وہ جائے مدفنِ اموات ہو گئی

مت پوچھیے، بگڑتے ہی دہلی کے، کیا کہیں — کیا واردات خلق پہ ہیہات ہو گئی

دیکھا بقولِ حضرتِ سوداؔ تو عیشؔ بس

"دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی"

(۱۳)

رشکِ فردوس تھی جائے دہلی — کس زباں سے ہو ثنائے دہلی

---

۱ جو ۔ (ف د : ۶۲)

۲ کہ ۔ (ف د : ۶۲)

۳ عبرت ۔ (ف د : ۶۲)

۴ لو ۔ (ف د : ۶۱)

تھے عجب کوچہ و بازار اس کے — تھی عجب آب و ہوائے دہلی
سنتا وصف اس کے اگر جنتِ عدن — چومتا آن کے پائے دہلی
رشکِ صد باغِ اِرَم تھی وہ جا — خلد تھا ناصیہ سائے دہلی
مشک و عنبر سے زیادہ خوشبو — تھی جہاں میں گلِ وِلائے دہلی
رشکِ زلف و رُخِ خوبانِ جہاں — تھے یوں ہی صبح و مسائے دہلی
ماہ تو چرخ پہ ہوتا تھا خفیف — دیکھ کر ناخنِ پائے دہلی
بادشاہوں پہ (جو) رکھتے تھے شرف — تھے غنی یہ فقرائے دہلی
رشکِ سحبان تھے ایک ایک، سنا — بلغان و فصحائے دہلی!
کون سا مرغِ چمن تھا کہ نہ تھا — رات دن نغمہ سرائے دہلی
الغرض تھی وہ عجب باغ و بہار — رشکِ جنّت تھی فضائے دہلی
دل الٹ جائے ہے جب آئے ہے یاد — وہ نفاست وہ صفائے دہلی
ہو گئی غیرتِ بازارِ منیٰ — اب وہ صد حیف سرائے دہلی
سن کے بربادی کو اس کی ہر شخص — رو کے کہتا ہے کہ ہائے دہلی
اور تہِ دل سے یہ مانگے ہے دعا — عیش ہر ایک برائے دہلی
کہ پھر آباد اُسے ویسا ہی! — اے خداوند بنائے دہلی[ؔ]

(۱۴)

چرخِ دنیا میں جسے زر دے ہے — کوفت بھی اس کو مقرّر دے ہے
عشق کیا دیتا ہے، اور گر دے ہے — لبِ خشک و مژۂ تر دے ہے
آنکھ وہ، نوکِ مژہ سے ہر پل — بس رگِ جان کو نشتر دے ہے
عشق ہے خانہ خرابِ عالم — دل میں ایسے کو کوئی گھر دے ہے
لبِ شیریں سے بتوں کی گالی — مزۂ قندِ مکرّر دے ہے
فرحتِ تازہ مشامِ جاں کو — نکہتِ زلفِ معنبر دے ہے
قتل پر بے گنہوں کی، صاحب! — شاہدی آپ کا تیور دے ہے

ؔ اس زمین میں ایک غزل اوپر گزر چکی ہے اور دونوں میں کچھ شعر مشترک ہیں۔

پاؤں رکھتا ہے رہ عشق میں وہ
پہلے جو شمع صفت سر دے ہے

میں تو چاہوں، نہ ملوں اُس سے، و لے
چین کب یہ دلِ مضطر دے ہے

نہیں محتاج وہ زیور کا کبھی
حق جسے حسن کا زیور دے ہے

چین دیتی نہیں اُس کو تقدیر
جس کو حرص و ہوس زر دے ہے

سچ تو یہ ہے کہ تو نگر وہ ہے
دل خدا جس کو تونگر دے ہے

رنج و راحت نہیں دیتا کوئی
عیش جو دے ہے مقدر دے ہے

(۱۵)

دعاے جان و دلِ بیقرار ہے تو یہ ہے
الٰہی آملے وہ، انتظار ہے تو یہ ہے

بہارِ ہستیِ ناپائیدار ہے تو یہ ہے
خزاں کو رشک ہے اس پر بہار ہے تو یہ ہے

کرے وہ لاکھ ستم ہم پہ، ہم کریں گے وفا
ازل سے اہلِ وفا کا شعار ہے تو یہ ہے

بسانِ نقشِ قدم اُس گلی میں مر مٹیے
ارادۂ دلِ ناکردہ کار ہے تو یہ ہے

کہے ہے زلفِ معنبر صبا جسے ہاں ہاں
جہاں میں غیرتِ مشکِ تتار ہے تو یہ ہے

گلی میں یار کی فریاد و نالہ و زاری
بس عاشقوں کو اگر کار و بار ہے تو یہ ہے

خیالِ زلف و رخِ یار (ر) میں بسر کرنا
ہم عاشقوں کو جو لیل و نہار ہے تو یہ ہے

مرے غبار سے آئینے کو جلا دے ہے
جہاں میں صاف دلوں کا غبار ہے تو یہ ہے

گلہ ہو غیروں کا کیا عیش اس زمانے میں
ہوا ہے دشمنِ جاں اے لو یار ہے تو یہ ہے

(۱۶)

حالِ دل ہم انھیں گر اپنا سنا دیویں گے
تو یہ لکھ رکھو کہ ان کو بھی رلا دیویں گے

بزم میں ہم کو اگر اپنی وہ جا دیویں گے	تو مزا تجھ کو ہم اے چرخ چکھا دیویں گے
عشق میں گر ہمیں وحشت کی ترنگ آئے تو ہم	چوکڑی آہوے صحرا کی بھلا دیویں گے
مُنھ ہلال اپنا نہ دکھلائے گا خفّت سے کبھی	ہم اگر ناخنِ پا اس کا دکھا دیویں گے
دل کے رہنے میں تو کچھ عذر نہیں بسم اللہ	لیجے پر اُس کے عوض آپ ہمیں کیا دیویں گے
نالۂ دل کو نہ مانع ہو اگر ضبط تو بس	ہم ابھی خیمۂ گردوں کو جلا دیویں گے

لے چلے ہیں دل و جاں نذر کو ان کی ہم عیشؔ
دیکھیے ہم کو وہ کیا اس کا صلہ دیویں گے

(۱۷)

لے کے دل تو مجھے اچھا بتِ طناز نہ دے	یہ گوارا ہے، پہ دم تو مجھے دم باز نہ دے
پوچھے وہ حالِ دلِ غمزدگاں کا کیوں کر	لب ہلانے کی بھی فرصت جسے انداز نہ دے
مرغِ دل چپکے سے کیا تیر نگہ نے مارا	خوبیِ تیر یہی ہے کہ جو آواز نہ دے
رات دن مجھ کو یہ ڈر ہے کہ مری جانب سے	کان بھر اس کے کوئی دیکھیے غمّاز نہ دے
بچ سکے اس سے کوئی کیونکہ بتا تو جس کا	بچّے رستم کو بھی تیر نگہ ناز نہ دے
کس توقع پہ کہو عاشقِ شیدا جیوے	جبکہ جھوٹی بھی تسلّی کوئی ہمراز نہ دے

چاہے آسایشِ دارین، تو رہنے اے عیشؔ
خانۂ دل میں تو حرص و ہوسِ آز نہ دے

(۱۸)

نہ لب خشک، نہ کچھ دیدۂ پُر آب نے کی	عشق میں سب یہ خرابی دلِ بیتاب نے کی
سر جھکائیں نہ بھلا اہلِ جہاں کیونکر جب	پُشت خم سامنے اس ابروؔ کے محراب نے کی
ماری وہ دَھول صبا نے کہ ہوا بس تڑکا	ہمسری رُخ سے جو اس کے گلِ شاداب نے کی

ے ابرو کا 'و'، تقطیع سے خارج ہے

باتیں کہنے ہی کی ہیں، دل کی جلن میں تخفیف
خاک بھی تو نہ کچھ اس رشک کے سیلاب نے کی

پے تسکین دلِ زار کریں کیا، ہر چند
بن سکی ان سے جو تدبیر سو احباب نے کی

عشق میں حضرتِ دل سمجھے تھے ہوگا آرام
بڑھی الفت تو کمی اور خور و خواب نے کی

عیش شورابہ کشِ عشق کے آنسو سنا
سخت شرمندہ ہوا ریں جو تیزاب نے کی

(۱۹)

صدمۂ عشق جس بشر کو ہے
شاباش اس کے دل و جگر کو ہے

نامہ بر کو کہیں سنا ہے ضرر
واں ضرر پہلے نامہ بر کو ہے

دل کے لینے کی تاک جھانک لگی
رہتی اس شوخ مفت بر کو ہے

چھین لیتا ہے اک نگاہ میں دل
یہ اثر اس کی کچھ نظر کو ہے

سینے آیا ہے چاکِ جیب مرا
یہ نیا خبط بخیہ گر کو ہے

عشق میں دل کا ہے اگر کچھ غم
تو لبِ خشک و چشمِ تر کو ہے

جانتا اس کو ہے وہ بے مایہ
کھینچتا جو بلند سر کو ہے

حق تعالیٰ نے خو تواضع کی
دی سنا شاخِ پر ثمر کو ہے

دل نہ ہو تو جہاں میں طالب نام
کہہ دیا تجھ سے اس ضرر کو ہے

روسیاہی سوا بیانِ نگیں
کیا حصول اور نامور کو ہے

یہ جو دنیا میں عیشِ حسنِ قبول
دیا اللہ نے سیم و زر کو ہے

اس سے منظور امتحان فقط
خالقِ ہستی و در کو ہے

واقع فی الوسط ہے سرائے دو در
جائے موزوں یہ رہ گزر کو ہے

اس سرائے دو در میں سوچ ذرا
چاہتا تو جو کرّ و فر کو ہے

تیری ہستی ہے اس میں مثلِ شرر
کب ثبات ہستیِ شرر کو ہے

شیخ سعدی نے حال سے اس کے
دی خبر جانِ بے خبر کو ہے

ہرکہ آمد عمارتِ نو ساخت رفت و منزل بدیگرے پرداخت
واں دگر پخت ہمچنیں، ہوَسے ایں عمارت بسر نبرد کسے
یار تا پائیدار دوست مدار دوستی را نشاید ایں غدّار

دولت عقبیٰ کی چاہ اللہ سے
کافی وہ واں کی عمر بھر کو ہے

(۲۰)

غم ہو یا شادی ہوئی کرتا یہ بشر سب کچھ ہے
جاتی انسان پہ القصّہ گزر سب کچھ ہے

پاس بالفرض ترے دولت و زر سب کچھ ہے
آخرِ کار وہ سب خاک ہے گر سب کچھ ہے

مجھ کو انکار ہے کب دینے میں، اے قبلہ من!
لیجیے موجود، دل و جان و جگر، سب کچھ ہے

وہ سمجھتے ہیں کہ کھلتا نہیں میرا احوال
یہ نہیں جانتے یاروں کو خبر سب کچھ ہے

ایک اس دل میں مقرر نہیں کرتا تاثیر
ورنہ اس نالۂ دل میں بھی اثر سب کچھ ہے

وہ کہاں پلتے ہیں ہم اور بتوں میں، ہرچند
ناز و انداز و رخ و زلف و کمر سب کچھ ہے

امتیاز ان میں کرے وہ ہی، جسے آنکھ ہو یاں
زلف و رخ، دیر و حرم، شام و سحر سب کچھ ہے

ے ا اصل : ع۔ وہ کہاں پاتے اور بتو نہیں ہر چند

ایک تقدیر کے ہاتھوں سے تو ناچار ہے یہ
ورنہ کرنے کو تو کرتا یہ بشر سب کچھ ہے

(۲۱)

دل میں جو خوف نہ اس آفتِ جاں سے لاوے
دل بھلا ایسا کہو کوئی کہاں سے لاوے
جس گلی میں ہو گزر بادِ صبا کا مشکل
کس طرح کوئی خبر جا کے وہاں سے لاوے
شیشۂ دل نہیں عاشق کا ارے وہ شیشہ
شیشہ گر کی جو کوئی اور دکاں سے لاوے
ابروئے یار کے ہوگی نہ مقابل زنہار
تیغ سو چھانٹ کے کوئی صفہاں سے لاوے
ایسے صیاد کے پھندے سے ہے بچنا (بھی) محال
مرغِ دل دام میں جو طرزِ بیاں سے لاوے
جان کیوں کر بچے جب نشترِ مژگاں اس کا
کاوش اس طرح سے میری رگِ جاں سے لاوے
سامنے شمع کے پر جلتے ہیں، کوئی کیوں کر
ذکر پروانے کا اس شعلہ زباں سے لاوے
آدمی چاہیے تکیہ کرے اللہ پہ عیش!
خوف بس دل میں نہ کچھ سود و زیاں سے لاوے

(۲۲)

دل ہی میں دل کا مارنا بس جوش چاہیے
رکھنا چراغ یہ تہِ سرپوش چاہیے

ے اصل: جب

خم خانۂ جہاں میں وہ مے نوش چاہیے
پی کر شراب ہووے نہ مدہوش، چاہیے

معشوق لاکھ ظلم کریں، عاشقوں کو، پر
کرنی نہ ان کی[1] یاد فراموش چاہیے

ہے سرو و گل کو بلبل و قمری سے اختلاط
ہونا تمھیں بھی ہم سے ہم آغوش چاہیے

رکھے ہر ایک کام میں اندیشۂ مآل
اتنا تو آدمی کو بھلا ہوش چاہیے

گو عرضِ مدّعا ہو خلافِ ادب ہے کیوں
رہنا بتوں کے سامنے خاموش چاہیے

بہتر ہے راہ رَو کو جہاں تک بنے اُسے
رہنا جہاں میں عیش سبک دوش چاہیے

(۲۳)

رہی گر صحبتِ اغیار باقی — تو کاہے کو رہیں گے یار باقی
گریباں میں مرے دستِ جنوں نے[2] — نہ چھوڑا نام کو اک تار باقی
نہیں عاشق کے تن میں خون کی بوند — رہی اے دیدۂ خونبار، باقی
نہ چھوڑی شیخ جی صاحب کے سر پہ — سنا رِندوں نے کل دستار باقی
رہے گا یوں ہی تا روزِ قیامت — خلاف سبحۂ و زُنّار باقی
محبّت میں بتوں کی مر مٹے ہیں — ق رہا ہے اک فقط ہنکار باقی
وئے اس سردمہریِ فلک کی — ہے وہ ہی[3] گرمیِ بازار باقی

---

[1] اصل : کو
[2] اصل : کے
[3] اصل : وہی

یہ پوچھا میں نے اک دن اپنے دل سے ق ہوس ہے تم کو کچھ اے یار! باقی
کہا اُس نے اگر مل جائے وہ شوخ تو کہنا کچھ نہیں زنہار باقی
ترے بیمارِ غم کو ہے، تو بس ہے فقط اک حسرتِ دیدار باقی
عوض بوسے کے دل دیں گے انھیں عیشؔ
نہیں اب اس میں کچھ تکرار باقی

(۲۴)

ہر چند کہ اس چرخ کی بیداد غضب ہے
پر اپنی بھی آہ (اے) دلِ ناشاد غضب ہے
ہاں اور بھی بیداد ہزاروں ہیں یہ ملنا
غیروں سے ترا اے ستم ایجاد غضب ہے
دعوے تھے بڑے ہم کو، یہ دل دینے کے، لیکن
دل لینے میں وہ بھی کوئی استاد غضب ہے
ایذا دہِ جاندار سنا ہی نہیں آباد
ہو خانۂ صیاد گر آباد، غضب ہے
کیا کم ہے ستم فصلِ بہاری میں اسیری
اور اس پہ ہو بے رحمیِ صیاد غضب ہے
بے یار کے عاشق کے نشتے کیوں نہ ہرن ہوں
ہاتھ آئے نہ افیونی کو معتاد غضب ہے
پابندی ہے اے عیشؔ ہر اک سب کے لیے، پر
سچ یوں ہے کہ پابندیِ آزاد غضب ہے

ے اصل: ہیں

(۲۵)

نہیں ناصح، مرے قابو میں طبیعت اپنی
اپنے ہی پاس تو رہنے دے نصیحت اپنی

واعظا! تیرا دل آیا ہے ادھر، میں سمجھا
مجھ کو سمجھا کے تو چاہے ہے بریّت اپنی

وادیِ عشق میں رکھنا نہ قدم بھول کے بھی
ہے یہ یارانِ طریقت کو وصیّت اپنی

شیخ، ”آمان“ کہا، رندوں سے، جانے دے، نہ مل
ہاتھ سے اپنے نہ کر دیکھ فضیحت اپنی

اپنی تدبیر سے کیا ہوتا ہے، وہ ربِّ کریم
وہی کرتا ہے، جو ہوتی ہے مشیّت اپنی

یہ تو ہاں سچ ہے مگر شرط ہے انسان کو بھی
تا بہ مقدور نظر رکھے حمیّت اپنی

کام سب اُس کے دُرست ہوئیں گے انشاء اللہ
شخص رکھے گا دُرست عیشؔ، جو نیّت اپنی

(۲۶)

ابروے قاتل ہے اک شمشیر سی
اور نگہ کافر ہے اس کی تیر سی

فصلِ گُل میں تیرے وحشی کے لیے
بن گئی موجِ ہوا زنجیر سی

دل کے لینے کو بنی پھرتی ہے کیا
وہ پری نامِ خدا تصویر سی

منہ بنائے باغ میں پھرتی ہے آج
عندلیبِ زار کیوں دل گیر سی

عُجب و نخوت سے کوئی خالی نہیں
ہے ہوا کچھ یہ تو عالم گیر سی

دل بچے اُس سے تو کیونکر بچ سکے
اس کے ہاتھوں میں ہے کچھ تسخیر سی

یہ یونہی رہوے گا چاک، اے بخیہ گر!
لاکھ تو اس کو بصد تدبیر سی

عاشقِ شیدا کی میرے خود بخود
ان دنوں حالت ہے کچھ تغیّر سی

جُبّہ و دستار ہیں زاہد کے عیشؔ
ہم کو آتی ہے نظر تزویر سی

(۲۷)

تپشِ غم نے نہیں پھوڑے پھپھولے دل کے
عقدے ہیں ناخنِ تدبیر نے کھولے دل کے

یادِ مژگانِ بتاں کیا ہے، کسی نے گویا　　نیشتر ڈال کے اندر ہیں گھنگولے دل کے
مہندی کیوں ہاتھ میں ملتا ہے جو منظور ہے رنگ　　انگلیاں آ کے مرے خون میں ڈبولے دل کے
کوے جاناں میں چلا جاؤں میں کیونکر جب تک　　فیصلہ میرے اور آپس میں نہ ہو لے دل کے
یاد میں اس بتِ نجار پسر کے شب و روز　　ٹکڑے [illegible] ہیں پڑے غم کے بسولے دل کے

جاں [illegible] ام ہو گیا کر [illegible] میں جب عیش
چین [illegible] سینے میں جھکولے دل کے

(۸)

گیا جو دوسری بار ان کے گھر میں کل پھر کے
پڑا ہے اس سے طبیعت [illegible] ان کی بل پھر کے
قدم ڈگا تھا رہِ مستقیم سے لیکن
خدا کے فضل [illegible] ہارے گیا سنبھل پھر کے
گئے تھے مجھ سے وہ لڑ کر پھر آئے بر سرِ صلح
یہ آیا نخلِ تمنا میں میری پھل پھر کے
کہا تھا پہلے تو آؤں گا، پھر کہا کہ نہیں
وہ کر کے وعدہ زباں کو گیا بدل پھر کے
گیا تھا قصد چلیں گے گلی سے اس بت کی
اب اس کو کیا کریں دل واں گیا مچل پھر کے
جو اور شے کوئی ٹوٹے تو مل بھی جائے ولے
یہ بعد ٹوٹے کے ملتا نہیں ہے [1] دل پھر کے

ـہ کل اور بل کے قوافی میں "دل" کو قافیہ بنانا درست نہیں جس کی معذرت عیش نے ایک دوسری غزل اسی ردیف اور بدلے ہوئے قافیوں میں کہہ کر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

بدل تھا قافیہ بھولے سے بندھ گیا واں دل　　جتا نا دوست سے پڑھوا کے یہ غزل پھر کے

طبیعت آپ کی رہتی ہے کچھ اُداس، اسے
خدا کے واسطے بہلاؤ عیش چل پھر کے

(۲۹)

نیا ہوا مرے سینے میں داغ دل پھر کے
اٹھا کے زلف دکھایا جو اس نے تل پھر کے

ذرا تو دامنِ مژگانِ یار، ہل پھر کے
کہ تا یہ آگ ہو سینے میں مشتعل پھر کے

متاعِ تاب و تواں سب ہوئی وہیں برباد
نہ آیا کوچۂ قاتل سے ایک تل پھر کے

خدا کے واسطے کر ضبط نالہ اے بلبل!
یہ زخم دل مرے جائیں کہیں نہ کھل پھر کے

وہیں تھا نقشِ قدم کی طرح سے مرمٹنا
ہوا میں کوچۂ قاتل سے منفعل پھر کے

جو اور رشتے کوئی ٹوٹے تو مل بھی جائے ملے
ق
یہ بعد ٹوٹنے کے ملتا نہیں ہے دِل پھر کے

بدل تھا قافیہ بھولے سے بندھ گیا واں دل
جتانا دوست سے پڑھوا کے یہ غزل پھر کے

نگاہِ یار پڑے جس پہ، وہ بچے کیوں کر
گئی ہے آئی ہوئی بھی کہیں اجل پھر کے

(۳۰)

لکھے ہیں زلفوں کو لام اس کی مناسبت دے ہیں شام کی بھی
بتلاتے مارِ سیاہ بھی ہیں، کہے ہیں (ہے؁) شکل دام کی بھی

پسند کر لیں خواص اس کو، سمجھ میں آوے عوام کی بھی
غرض ہو سب کی پسندِ خاطر، یہی ہے خوبی کلام کی بھی

دیا ہے جس مہر وش کو ہم نے دل اپنا نام خدا وہ وہ ہے
جو دیکھے اس کو تو گم ہو ستی فلک پہ ماہِ تمام کی بھی

نزولِ غم ان کو پہلے ہی تھا خزاں کے موسم (سے) اور اب اس پر
گلوں کی صحبت میں بلبلوں کو ہوئی ہے شدّت زکام کی بھی

؁ قیاسی تصحیح

چلے تو ہو پر سمجھ کے جانا گلی میں اُس بت کی حضرتِ دل!
بتا دیا ہے یہ ہم نے تم کو وہاں ہے رسم اتّہام کی بھی

ہے جس کا در سجدہ گاہِ عالم بتا دے واعظ وہ قاعدہ تو
کہ جس کے باعث ہو اس کے جلسے میں اپنی صورت قیام کی بھی

چلے ہیں کعبے کو شیخ صاحب کہے ہیں بیت الصنم میں ایسا
کہ واں تو جائیں گے وہ ولیکن خبر ہے یاں اک قیام کی بھی

یقیں ہو وعدہ پہ کیونکہ اس کے کیا نہ ایفا کبھی انھوں نے
ہزاروں قسمیں وہ کھا چکے ہیں کہ پہلے تیسوں کلام کی بھی

نگیں کو حاصل ہے روسیاہی جہاں میں ہر چند ہم نے مانا
یہ واقعی ہے و لے جو دیکھو تو بات ہے اس میں نام کی بھی

گیا جو قاصد پیام لے کر ہماری جانب سے پاس اُس کے
پیام کیسا ہوئی اجازت نہ اُس کو ہرگز سلام کی بھی

ترا ہی وحشت زدہ ہے ایسا کہ چوکڑی گم ہو آہوؤں کی
جو دشتِ وحشت میں دیکھ لیں چال تیرے وحشت خرام کی بھی

لکھے ہیں اے عیشؔ جس زمیں میں یہ شعر تو نے سنا ہے ہم نے
کہ اس سے پہلے غزل اسی میں ہے میرؔ عالی مقام کی بھی

(۳۱)

کوئی کب جان دینے اس طرح مردانہ آتا ہے
یہ جیسے بن کے اندھا شمع پر پروانہ آتا ہے

سنے ہیں جب کبھی یہ ہم کہ وہ جانا نہ آتا ہے
تو دل باہر نکل سینے سے بیتابانہ آتا ہے

پھنسا دل دیکھ خالِ زیرِ زلف اس بت کے مکھڑے پر
یہ سچ ہے مرغ پھندے میں پئے یک دانا آتا ہے
نہیں سنتا ہماری کیا فرشتہ خاں کی بھی وہ تو
کسی پر جب ہمارا یہ دلِ دیوانہ آتا ہے
پڑی ہے کھلبلی شیشوں میں اور چکر میں ساغر ہیں
سوئے میخانہ یارب کون سا مستانہ آتا ہے

(۳۲)

دور ہیں دیکھ کے کہتے ہیں رفل کی مکھی — ہے حقیقت میں وہ پیغام اجل کی مکھی
ہے بنی آج کی وہ، اور نہ کل کی مکھی — ہے بنائی ہوئی یہ روزِ ازل کی مکھی
جمع کرتی ہے رطوبت کو خدا ہی جانے — کون سے پھول کی اور کون سے پھل کی مکھی
ایسے مخبوط تھے کفار عیاذاً باللہ — ق — خندہ زن عقل پہ تھی ان کی زحل کی مکھی
چاہتے دفعِ ضرر اس سے تھے اپنا، احمق — خود اڑاتی تھی وہ جس لات و ہبل کی مکھی
ہوگئے اس سے قوی اور .... اجزا — ساتھ ان کے جو ملا کر یہ کھرل کی مکھی
ہیں جہاں اور سبب قے کے لکھا ہے یہ بھی — باعث ہوتی ہے کبھی قے کے خلل کی مکھی
اک فرنگی بچہ کل ایک سے یہ پوچھے تھا — پیدا ابتلا تو بھی کس نے یہ ول کی مکھی

کیا عجب عیشؔ ترا سن کے کلام شیریں
روحِ فرہاد بنے تیری غزل کی مکھی

(۳۳)

کچھ حنا سے نہیں ہے اس کفِ پا کی خوبی — بلکہ ہے اس کفِ پا ہی سے حنا کی خوبی
زیبِ تن اس کے ہوئی یہ ہے قبا کی خوبی — نکہتِ زلف کا لانا ہے صبا کی خوبی
مثل آئینہ کے ظاہر میں صفا ہیں تو ہوا کیا — اہلِ عالم میں ہے باطن کی صفا کی خوبی
استخواں ریزہ پہ کرتا ہے قناعت جو وہ — اس سے ہے سارے طیوروں میں ہما کی خوبی
جانور ہے نہ ہو انساں میں گر شرم و حیا — کیوں ہے انساں میں فقط شرم و حیا کی خوبی

خوبیِ اہلِ دول دولت و حشمت سے نہیں　　متواضع ہو یہی ہے امرا کی خوبی

صحت و عافیت و فرحتِ رزق و ایماں
عیشؔ بخشی تجھے، ہے سب یہ خدا کی خوبی

(۳۴)

پسند ان کی یہ جب سرخیِ حنا ٹھہری　　تو خون عاشق شیدا کی قدر کیا ٹھہری
یہ کام دل کا تھا افشاءِ راز کیونکہ نہ ہو　　جہاں میں جب کہ یہ پیغامبر صبا ٹھہری
ملے جہاں میں نہ کیوں کر حنا کو رنگ قبول　　وہ خوش نصیب جب اس بت کی زیب پا ٹھہری
سنی جو نزع میں آنے کی ان کی خوش خبری　　تو جان سینے (سے) کھنچ کر لبوں پر آ ٹھہری
مریضِ غم کی تمھارے کہیں ہیں، بیماری　　بالاتفاق طبیبوں میں لا دوا ٹھہری
ہم اس کی کجرویوں (سے) نہ کیونکہ واقف ہوں　　ہمارے سامنے اس چرخ کی بنا ٹھہری

طلب وہ کرتے تھے دل تم سے عیشؔ، یہ تو کہو
کہ اس معاملے میں تم سے ان سے کیا ٹھہری

(۳۵)

خوبیوں میں نہیں کچھ دولت و زر کی خوبی　　آدمیت سے ہے دنیا میں بشر کی خوبی
کرتے ہیں نیم نگہ میں وہ مس کو طلا　　ہے یہ ادنیٰ نظرِ اہلِ نظر کی خوبی
بے ثمر سبز ہوئی شاخ تو کیا سبز ہوئی　　ہو ثمردار یہ ہے شاخِ شجر کی خوبی
بدمزا اور ہوئے شور و فغاں سے وہ مرے　　دیکھ لی ہم نے یہ نالوں کے اثر کی خوبی
نام ہی نام سنوان کا وہ آدیں نہ نظر　　ہے یہی بس دہنِ تنگ و کمر کی خوبی
رونقِ حضرتِ دہلی تھی اُسی کے دم سے　　بعد مرنے کے کھلی سب پہ ظفر کی خوبی

ہو نہ اقبال تو دے جلوۂ صد عیب ہنر
ساتھ اقبال کے ہے عیشؔ ہنر کی خوبی

(۳۶)

مستوں میں تھی دھوم ہاؤ ہو کی　　ساغر کی خبر ہے نہ سبو کی

تقصیر نہیں ہے کچھ عدو کی — خوبی ہے یہ ساری ان کی خو کی
جب دل ہی سے ترک آرزو کی — کیوں سہوے کوئی بھلا کسو کی
تشبیہ نہ دو کمر سے مو کی — اس میں نہیں جائے گفتگو کی
مارا اسے جس نے آرزو کی — عادت ہے یہ چرخ کینہ جو کی
کل اس نے جو ہم سے گفتگو کی — تھی طرز یہ کوئی گفتگو کی
شب تم نے نہیں لگائی مہندی — کھاؤ تو قسم مرے لہو کی
بو باس تھی یہ کہاں صبا میں — نکہت ہے یہ زلفِ مشک بو کی
جو چاہو سو یاں بناؤ باتیں — ہم سنتے ہیں کب بھلا کسو کی
یہ اوروں سے کہیے اس کے آگے — ہے کس کو مجال گفتگو کی

(۳۷)

اس نے جو وعدہ کیا ہے سب وہ ہم کو یاد ہے
گو وہ کیسا ہی ہو لیکن دل ہمارا شاد ہے

سب تو کہتے ہیں فلک کو یہ ستم ایجاد ہے
پر ہمارا وہ ستم گر اِس کا بھی استاد ہے

قید سے حرص و ہوا کی جو ہوا آزاد ہے
آدمی وہ ہی ہے دنیا میں، وہی دل شاد ہے

اِس نے کیا اُس کا بگاڑا یہ بتاؤ تو بھلا
دشمنِ جاں بلبلِ شیدا کا جو صیاد ہے

عیشؔ، تو ان سے بچانا دل جہاں تک بچ سکے
کیونکہ دل لینے کے فن میں وہ بڑا استاد ہے

(۳۸)

سیب شرمندہ ہے اُس سیبِ ذقن کے آگے
اور خجل غنچہ ہے اُس غنچہ دہن کے آگے

وہ بھی چکرا ہی گیا سنتے ہی جو نہی اس کا
آگیا ذکرِ ستم چرخِ کہن کے آگے !

شمع جل جائے گی اس تفتہ جگر کا میرے
آگیا ذکر جو اس سوختہ تن کے آگے

ایک بھی تو نہ کیا وعدہ وفا اس نے کبھی
پھوڑے سر کیا کوئی اس عہد شکن کے آگے

(۳۹)

آرزوئے آن ملے تو یہ ہے — رات دن ہم کو تگ و پو یہ ہے
دیکھ کر جس کو ہو خمِ تیغ دو دم — چشمِ بد دور وہ ابرو یہ ہے
ان کی زلفوں سے اڑا لائی ہے تو — اے صبا تجھ میں جو خوشبو یہ ہے
لے ہے دل نیم نگہ میں وہ اڑا — اس کی آنکھوں میں تو جادو یہ ہے
خاکساری و تواضع کرنی ! — لاکھ جادو کا تو جادو یہ ہے
زلف و رخ میں ہے بتا کیونکہ فساد — وہ مسلمان ہے، ہندو یہ ہے

تول لیتے ہیں نظر میں سب کو
عیش پاس اپنے ترازو یہ ہے

(۴۰)

جو آکے جنت سے حور دیکھے زمیں پہ فصلِ بہارِ دہلی
تو ہوئے سو جاں سے بے تکلف یقین سمجھو نثارِ دہلی

بیاں وہاں کی لطافتوں کا ہو کس زباں سے اک ادنیٰ یہ ہے
صفائے گردوں پہ مارتا ہے پڑا یہ چشمک غبارِ دہلی

جہاں کی جو خوبیاں ہیں ساری وہ سب ہیں دہلی کی سرزمیں پر
نہیں ہے کوئی دیار ہرگز جہاں میں مثلِ دیارِ دہلی

مبالغہ اس میں کچھ نہیں ہے جو نقشِ اثر رنگ آ کے دیکھے
تو گم ہو اس کی بھی دیکھ سُدھ، ہے ایسا نقش و نگارِ دہلی
دُعا ہے یوں عیشِ خوش زباں کی بصد تضرع جنابِ حق میں
الٰہی عیش و نشاط و عشرت رہے سدا ہمکنارِ دہلی

(۴۱)

بتوں کے ساتھ طبیعت کو آشنا کر کے — ہوئے خراب غرض دل کو مبتلا کر کے
بتا تو اے فلکِ فتنہ کار اُس بت سے — لگا ہے ہاتھ ترے ہم کو کیا جدا کر کے
اب آگے دیکھیے کیا بنتی اس کے درباں سے — ہم اس کے پہنچے ہیں در تک خدا خدا کر کے
کہاں ہے دل جو لگائیں کسی سے پہلے ہی — ہم اپنا بیٹھے ہیں دل صرفِ مدّعا کر کے
کیا نہ فائدہ کچھ خاک، چارہ گر آخر — مریضِ عشق کی نادم ہوئے دوا کر کے

اٹھایا ہاتھ جو عشقِ بتاں سے تم نے تو پھر
بسر کرو گے بھلا عیش عمر کیا کر کے

(۴۲)

شمیمِ زلف سے مشکِ ختن کو خجلت ہے — اور اس دہن سے عروسِ چمن کو خجلت ہے
تمھیں خبر نہیں دیوانہ آپ کا وہ ہے — کہ جس سے قیس کے دیوانہ پن کو خجلت ہے
تمھارا طرزِ ستم وہ ہے سامنے جس کے — ستم شعاریِ چرخِ کہن کو خجلت ہے
تمھارے سوختہ جانوں کا دیکھ سوز و گداز — جہاں کی بزم میں شمعِ لگن کو خجلت ہے

یہ عیش اُس تنِ رشکِ چمن میں ہے بُو باس
کہ جس سے بوئے گلِ یاسمن کو خجلت ہے

(۴۳)

چمن میں لے کے صبا مژدۂ بہار آئی — مراد اب تو تری عندلیبِ زار آئی
جو یادِ بُرّشِ تیغِ نگاہِ یار آئی — تو سر جھکائے ہوئے جاں پئے نثار آئی

یہ لطف دیکھئے آئے تو آئے وہ کس وقت ... لبوں پہ کھنچ کے یہ جب جانِ بےقرار آئی
جو چھیڑا آبلہ پاؤں سے اس کے کی تو نے ... تو گھری ہاتھ یہ کیا ترے نوکِ خار آئی
قمار خانۂ الفت میں مل کے اس بت سے ... نگاہ دیدہ و دانستہ دل کو ہار آئی
جو اس کی زلف کو چھیڑا نہیں، تو بادِ صبا ... کہاں سے ہو کے بتاؤ یہ مشکبار آئی
مزار پر پسِ مُردن نہ کوئی یار آیا ... بس ایک شمع ہی روتی سرِ مزار آئی
جواب دے گئے ہوش و حواس و تاب و تواں ... پے مدد نہ اجی آہِ شعلہ بار آئی
ادا و عشوہ و ناز و کرشمہ و انداز ... مقابلے میں جب اس دل کے یہ گہار آئی

بڑا غرور تھا بھٹیا پڑا جب عشق سے عیشؔ
تو کچھ بھی کام نہ یہ عقلِ پختہ کار آئی

(۴۴)

جب عندلیب چمن سے ہوا چمن خالی ... تو آبسے اسی جا زاغ اور زغن خالی
جو بعدِ مرگ ترے ناتواں کو دفن کیا ... تو پایا آکے نکیرین نے کفن خالی
ہر ایک بات میں ناز و ادا ہو جس کے بھری ... کب اس کا ناز و ادا سے ہو بانکپن خالی
وہ جانستان ہے جسے اس نے آنکھ بھر دیکھا ... تو اس کا وہیں ہوا جان سے بدن خالی
ہم ان سے بزم میں احوالِ دل کہیں کیوں کر ... ق جب ایک دم نہ ہو غیروں سے انجمن خالی

بتاؤ آکے وطن میں بھلا لگے دل کیا
جب عیشؔ ہوگیا یاروں سے ہی وطن خالی

(۴۵)

ناخنِ بیداد سے مت چھیل چھاتی خلق کی
غیرتِ اللہ ہے تو جان ساتھی خلق کی

ے معنی سمجھ میں نہ آسکے۔ ممکن ہے گذشتہ زمانے میں اہلِ دہلی بھٹیا پڑا" "پالا پڑا" کے مترادف کی حیثیت سے بولتے ہوں۔

بہرِ استقبال آتا ہے قبولِ حق، شنا
جب دعا جاتی ہے یہاں سے بلبلاتی خلق کی
دل دکھانا بندگانِ حق کا کچھ اچھا نہیں
کیونکہ اللہ کو نہیں تکلیف بھاتی خلق کی
ہے زبانِ خلق نقارہ خدائے پاک کا
منہ سے نکلی بات کب خالی ہے جاتی خلق کی
خلق کی تکلیف میں ہے ناخوشی اللہ کی
پر نہیں تکلیف کچھ تکلیفِ ذاتی خلق کی
ظالمو، جس ملک و دولت پر تمھیں غرا ہے آج
خاک میں ہے آہ ان سب کو ملاتی خلق کی
پھولتا پھلتا وہی ہے باغِ دنیا میں، شنا
عیش جس سے جان ہے آرام پاتی خلق کی

(۴۶)

دل میں آ مسکن ہے یہ اے سیم بر تیرے لیے
ہے کیا آراستہ یہ میں نے گھر تیرے لیے
چاک دل سیوے گا کیا تو آکے میرا بخیہ گر!
ڈھونڈنا اک اور پڑے گا بخیہ گر تیرے لیے
ہستیِ موہوم پر اے دل! نہ کر اتنا گھمنڈ
جلوہ آنی ہے یاں مثلِ شرر تیرے لیے
بے خبر اُس کی خدا کے واسطے اے بے خبر!
سر پٹکتا ہے ترا آشفتہ سر تیرے لیے
کان پر تیرے نہیں جوں بھی چلی ہے آج تک
جان سے اپنی گئے لاکھوں گزر، تیرے لیے

حالِ جان و دل یہ ہے فرقت میں تیری رات دن
وہ اُدھر بے چین، یہ بے تاب اِدھر تیرے لیے

نشترِ مژگاں دکھا، میری رگِ جاں سے کہا
چشمِ فتّاں نے کہ ہیں یہ نیشتر تیرے لیے

دل تو کیا ہے اے پری وش، ہم تو وہ جانباز ہیں
جان بھی دے دیں کوئی مانگے اگر تیرے لیے

عیش ہی کو کچھ نہیں صدمہ جدائی کا تری
مبتلائے غم ہے اک عالم ظفر، تیرے لیے

(۴۷)

گل کو اس رُخ سے تقابل کیا ہے — آگے اس زلف کے سنبل کیا ہے
دل ہی لینا ہے اگر مدِ نظر — لیجے پھر اس میں تامل کیا ہے
دیکھیے، ہے وہ گیا سوئے چمن — کھلتا پھر آج نیا گل کیا ہے
سُن کے نالے مرے، یہ بھی نہ کہا — کوئی پوچھو تو کہ یہ غل کیا ہے
جو ہیں اس چشمِ سیہ مست کے مست — اُن کے آگے نشۂ مُل کیا ہے
بردباری کو زمیں سے سیکھو — دیکھو تو اس کو تحمل کیا ہے
کمرِ شاخ کو توڑے ہے ثمر — اس سوا لطفِ تأہل کیا ہے
اس کی عیاری کو دیکھو تو بھی — دیتا ہر بات میں وہ جُل کیا ہے

عیش اتنا تو صبا سے پوچھو
ماجرائے گُل و بلبل کیا ہے

(۴۸)

یہ صبا کوئے یار کی سی ہے — اس میں بُو گل عذار کی سی ہے
مثلِ سیماب دل کی سینے میں — حالت اک اضطرار کی سی ہے
ہے طرب ریز نالۂ بلبل! — شاید آمد بہار کی سی ہے

میکشی کی ہے شب کہیں کیوں یہ　　سرگرانی خمار کی سی ہے
وہ درازیِ روزِ حشر بھلا　　کب شبِ ہجرِ یار کی سی ہے
رات دن دل کی جائے سینے میں　　چھیڑ اک نوکِ خار کی سی ہے

عیشؔ ملتی ہوئی فلک میں بھی
طرز کچھ خوئے یار کی سی ہے

شہر آشوب

عجیب طرح کی باغ و بہار تھی دہلی جہاں میں غیرتِ صد لالہ زار تھی دہلی
ریاضِ قدرتِ پروردگار تھی دہلی غرض گل چمنِ روزگار تھی دہلی

وہ وہ تھی ابرِ گہر بار جس کو کہتے تھے
وہ وہ تھی گلشنِ بے خار جس کو کہتے تھے

بیان اس کے کروں لطف کا کیا نامِ خدا وہ قطع روے زمیں پر بڑا معظم تھا
کہیں اگر اسے فردوس ننگ ہے اس کا نسیم خلد سے بہتر تھی واں کی آب و ہوا

مشامِ جان کو بس فرحت اُسی سے آتی تھی
ہر اک بشر کی مزا روح اس سے پاتی تھی

مریضِ غم کے لیے خانۂ شفا تھی وہ جہاں (میں) دردِ دل و جان کی دوا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ

زمیں وہاں کی شرف آسماں پہ رکھتی تھی
فلک کی آنکھ بھی حسرت سے اُس کو تکتی تھی

عجیب طرح کے تھے اُس کے کوچہ و بازار ہنسے تھا آئینے پر اس کا ہر در و دیوار
اور اس صفائی پہ تھا ایسا لطفِ نقش و نگار بعینہ جیسے کہ آئینے میں کھلے گلزار

نگار ہے وہیں اہل نظر کا دیدۂ دل
نہ ہوئے اور طرف دیکھ کے[2] اُسسے مائل

عمارتیں تھیں وہاں کیسی کیسی شانوں کی — بیاں کیجیے کیا خوبی ان مکانوں کی
تھی اہلِ دیدہ کی وہ فرح بخش جانوں کی — انھیں تھی دیکھ کے حیرت عقل آسمانوں کی

زمیں بھی تھی تو وہاں کی اس آب و تاب پہ تھی
کہ جس کے ذرّے کو بھی چشمک آفتاب پہ تھی

ہر ایک ذرّہ وہاں کا تھا رشکِ صد خورشید — وہ جائے اہلِ نظر کے لیے تھی قابلِ دید
جو عالم اس کا تھا وہ تو نہ دید ہے نہ شنید — جہاں میں قفلِ درِ آرزو کی تھی وہ کلید

ہر ایک طرح کا واں انبساط حاصل تھا
وہ طبقہ باعثِ آرام دیدہ و دل تھا

وہ کیا جگہ تھی، طلسمات کا سا عالم تھا — مدام فصلِ بہاری کا واں تو موسم تھا
بھرا ہوا وہ خوشی سے مکان ہر دم تھا — نہ دل تھا ایسا کوئی واں کہ جو نہ خرّم تھا

ہر ایک فردِ بشر کو خوشی سے کام تھا واں
نہ جانتا کوئی زنہار غم کا نام تھا واں

ہوا وہاں کی تھی بس مشکبار و عنبر بیز — ہر ایک دل کو تھی فرحت فزا طرب انگیز
ہر ایک موج تھی اس کی خوشی سے واں لبریز — تھی جان و دل کے لیے اس کی نکہت عشرت خیز

لطافت ایسی تھی واں کی ہوا میں نامِ خدا
کہ جس کے لطف کو کہتی تھی دیکھ صلِّ علیٰ

بلسانِ آئینہ اس سوچ میں میں حیراں ہوں — کہ اس مکان کو میں تشبیہ دوں تو کس سے دوں
خلافِ ادب کے ہے باغِ جناں گر اس کو کہوں — عجیب قدرتِ حق سے تھی وہ جگہ موزوں

---

[1] وہاں۔ فغانِ دہلی: ۳۲

[2] کر۔ فغانِ دہلی: ۳۲

کہ جس پہ روضۂ رضواں کو رشک آتا تھا
اور اس کو خلدِ بریں دیکھ رشک کھاتا تھا

وہاں تھا مجمعِ اہلِ کمال و اہلِ ہنر — وحیدِ عصر تھا واں کا ہر ایک فردِ بشر
رکھے تھا ہمتِ عالی ہر اک بلند اختر — کسی کو فیض ہو، تھی ان کو یہ ہی مدِّ نظر
ہر ایک طرح کا واں فیض اُن سے جاری تھا
ہر ایک شخص پہ القصہ فضلِ باری تھا

وحیدِ عصر تھے جو اہلِ علم و فضل و کمال — جہاں میں دولتِ جوہر سے تھے وہ مالامال
ہر ایک عقدے کو ناخن تھا اُن کا بس حلاّل — اور ان کمالوں کے تھے ساتھ صاحبِ اقبال
زمیں کی سطح پہ فیض اُن سے اِک جہان کو تھا
زمیں پہ اُن کے سبب رشک آسمان کو تھا

زبان ویسی ہی، اہلِ زبان ویسے ہی! — مکین ویسے ہی تھے اور مکان ویسے ہی
فصیح ویسے ہی تھے خوش بیان ویسے ہی — خدا کے فضل سے ذی عزّ و شان ویسے ہی
ہر ایک طرح کا صاحب کمال تھا اس میں
ہر ایک صاحبِ حُسن و جمال تھا اس میں

ہر ایک چیز میں اس (شہر) کی لطافت تھی — اور اہلِ شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور نظافت تھی — ہر اک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی
غرض وہاں کا تھا ہر خاص و عام ویسا ہی
جہان میں تھا وہ خطّہ تمام ویسا ہی

شبِ برات کی مانند واں کی تھی ہر رات — ہر ایک روز مشابہ تھا روزِ عید کے سات
ہر ایک شخص تھا واں نیک ذات نیک صفات — سو ہو گئی وہ جگہ ایسی موردِ آفات
کہ اس کا نام بھی لینے سے خوف آتا ہے
خیال بھی وہاں جانے سے منہ چھپاتا ہے

وہ بارگاہ کہ تھا جس کا عتبہ[1] عرش فلک   طواف کرتے تھے جس گھر کا مہر و ماہ تلک
جہاں میں اس کی تھی عظمت سماسے تابہ سمک   پہنچا درِ[2] تلک اس کے تھا فخرِ حور و ملک
تباہی ان کی سنا قابل بیان نہیں
کہوں تو کیونکہ کہوں طاقتِ زبان نہیں

فلک نے ان کے وہ آپس میں تفرقے ڈالے   دل و جگر پہ پڑے غم کے پڑتے ہیں بھالے[2]
پھنسے ہیں ان کے سب آفت میں بوڑھے اور بالے   اور ان کو اس پہ بھی جینے کے ہیں پڑے پالے
خبر نہ جان کو دل کی، نہ دل کو جان کی ہے!
اور ان سے ویسی ہی چھیڑ اب تلک آسمان کی ہے

وہاں چنے ہوئے ذوالاقتدار تھے جو جو   یگانہ و شرفِ روزگار تھے جو جو
متین و صاحبِ عزّ و وقار تھے جو جو   زمیں پہ باعثِ صد افتخار تھے جو جو
فلک نے ان ہی کو جن جن کے پائمال کیا
انھیں کو موردِ صد رنج و صد ملال کیا

اب اس میں دل کو ہے مثل آئینے کے حیرانی   بسان زلف کی خاطر کو ہے پریشانی
کہ اس طرح کی لطافت وہاں[3] تھی ارزانی   یہ دل میں کہتا ہوں سن سن کے واں کی ویرانی
الٰہی خواب تھا وہ[4] یا خیال تھا کیا تھا
وہ واقعی تھا کہ احتمال تھا کیا تھا

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی   نہ تھی مجال صبا کی جو ان تلک جاتی
خدا نے دی تھی انھیں ایسی عظمتِ[5] ذاتی   کہ نام غیر جو سنتیں تو ان کو شرم آتی

---

[1] قد: ف د ۴۴

[2] دل و جگر نہ پڑے پڑتے غم کے ہیں بھالے: ف د ۴۴

[3] جہاں: ف د ۴۴

[4] یارہ: ف د ۴۴

[5] عصمت: ف د ۴۴

فلک نے بخشا ہے ان کو لباسِ عریانی
ہے ستر ان کے لیے ان کی پاک دامانی

غرض مری فقط اس داستان سے یہ ہے | مآل کار مرا اس بیان سے یہ ہے
مراد ان کی بس اظہارِ شان سے یہ ہے | حصول شرحِ مکین و مکان سے یہ ہے

کہ ایسے ایسے مکین و مکاں خراب کیے
فلک نے سب دل و جان و جگر کباب کیے[1]

وہ دل ہے کون سا اس غم سے جو خراب نہیں | وہ کون شخص ہے جو گردِ پیچ و تاب نہیں
وہ جان کون سی ہے جس کو اضطراب نہیں | اب آگے حال یہ[2] لکھنے کی مجھ کو تاب نہیں

کروں ہوں ختم دعا پر درِ قبول ہے وا
خدا سے عرض ہے اب یہ ہی اپنی صبح و مسا

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو | کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو
مے نشاط سے بھر دے ایاغِ دہلی کو | دلوں سے خلق کے تو دھو دے داغِ دہلی کو

دعا ہے تجھ سے یہی اے مسبّب الاسباب
کر اپنے ابرِ کرم سے وہ باغ پھر شاداب

انھیں مکینوں سے پھر وہ مکاں ہوں آباد | الٰہی عیشِ جگر خستہ کا بھی کر دل شاد
رکھ امن میں اسے اور اس کی آل اور اولاد | بحقِ سیّدِ کونین آلہ الامجاد!

پھر اس کو ویسا ہی آباد کر خدائے کریم
بحقِ سورۂ یٰسین و سورۂ حٰم[3]

---

[1] اصل: خراب۔ ف۔ د سے اصلاح کی گئی۔

[2] کے۔ ف د: ۳۴

[3] رحیم۔ ف د: ۳۵

دیگر

کیا کہوں اس فلکِ شعبدہ گر کے نیرنگ　　دیکھ کر اس کے طلسمات سنا عقل ہے دنگ
متحیر ہیں سن اس حال کو اہلِ فرہنگ　　ان پہ کیا سن کے ہے اس ظلم سے ہر یک[1] دل تنگ
شمع ساں سب کو کیا خاک جلا کر اس نے
چھوڑا بس خاک میں ایک اک[2] کو ملا کر اس نے

نہیں ایسا کوئی دل جو نہیں اس غم سے دوچار　　کس کے دل میں نہیں اس غم کا یہ بتلاؤ تو خار
سن کے اس حال کو سینہ نہیں ہے کس کا فگار　　کون ایسا ہے جو اس غم سے نہیں زار و نزار
کون سا دل ہے جو اس غم میں گرفتار نہیں
کون سی آنکھ ہے اس غم سے جو خوں بار نہیں

سر جھکاتا تھا جہاں آن کے سارا عالم　　قبلہ و کعبہ سمجھتے تھے انھیں اہلِ حشم
دست بستہ وہاں حاضر تھی سدا شوکتِ جم　　دفعتاً ان سے ہوا ایسا زمانہ برہم
آج تو نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہیں وہ
کل گدا بھی کوئی ایسا نہ تھا جو آج ہیں وہ

جس کے پاس آہ صبا کا بھی گزرنا تھا محال　　کیا بیاں تم سے کروں ان کے تھے جو جاہ و جلال
مثلِ خورشید درخشندہ تھا ان کا اقبال　　الغرض دوسرا عالم میں نہ تھا ان کی مثال
ان کو یہ چرخِ جفا کار نے پامال کیا
تن پہ کپڑا بھی نہیں ان کا ہے یہ حال کیا

ڈالا اوقات میں ان اہل کمالوں کی خلل　　عقدے حل ہوتے تھے جن پاس کہ مالا ینحل
قول کو جن کے یہ سب سمجھے تھے قولِ فیصل　　ان کی کیونکر نہ ہو حالت متغیر پل پل

---

[1] ایک۔ ف د: ۳۵
[2] اصل: ایک ایک

دل سے بے چین ہیں، خاطر سے پریشان ہیں وہ
کچھ میسّر نہیں ہر چیز سے حیران ہیں وہ

اور سوا اس کے ہیں جالوں کے پڑے اندیشے   دل پہ پڑتے ہیں مرے ان کے غموں کے تیشے
ڈر سے جالوں کی لگے کرنے وہ ارزل پیشے   جوتیاں بیچے ہیں ان میں کوئی، کوئی شیشے

اس پہ (بھی) چین نہیں جان کو بے تابی ہے
ان کی قسمت میں فقط بے خور و بے خوابی ہے

ابرِ غم دل پہ ہے ہر شخص کے ایسا چھایا   چرخ نے اُن پہ سُنا غم کا یہ مینھ برسایا
ان کا اس چرخ ستم گر کو یہ عالم بھایا   یاں تلک روتے کہ ہے منہ کو کلیجا آیا

اشک کے آنکھوں سے بھرنے سے پڑے جھڑتے ہیں[1]
اور ساتھ ان کے یہ کٹ کٹ کے جگر گرتے ہیں

تھے وہ جن باغوں میں اقسام کے میوے بوفور   ناشپاتی وہی سیب و انار و انگور
اور اسی قسم کے میووں سے چمن تھے معمور   ان کی بو باس سے ہو جاتا تھا خفقان بھی دور

یا اُنھیں باغوں میں ہیں چاروں طرف خاک کے ڈھیر
اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

دیکھ واں بزم کا اور آبِ رواں کا عالم   اور ہی ہوتا تھا واں پیر و جواں کا عالم
جمع ہوتا تھا وہاں ایک جہاں کا عالم   کچھ بیاں ہو نہیں سکتا ہے وہاں کا عالم

یا وہاں کانٹوں کے اب ڈھیر ہیں اور پتے ہیں
تھے جہاں پھول، نجاست کے وہاں کھتے ہیں[2]

جس جگہ رہتے تھے پریوں کے اکھاڑے دن رات   مہروش کرتی تھیں واں سیر لیے ہاتھ میں ہات
اور ہر طرح کے موجود تھے ان کو نعمات   جُز خوشی سننے میں آتی نہ تھی اس جا کچھ بات

---

[1] ع ۔ اشک دن رات بس آنکھوں سے پڑے جھڑتے ہیں ف د : ۳۵

[2] کرتے تھے ۔ ف د : ۳۶

یاد ہی جا ہے کہ انساں کا وہاں نام نہیں
اور جو ہے کوئی تو بس غم کے سوا کام نہیں

وہ پری زاد جنھیں دیکھ کے جان آتی تھی — نام سے اُن کے سنا روح مزا پاتی تھی[1]
بیٹھے بیٹھے جو طبیعت کبھی گھبراتی تھی — ان سے ملتے تھے تو فوراً یہ بہل جاتی تھی
خاک میں اُن کو ہر اک طرح ملایا اُس نے
ہم جگر سوختوں کو اور جلایا اُس نے

وہ نہ جو پاؤں نزاکت سے زمیں پر دھرتے — بات بھی کرتے کسی سے تو اشارہ کرتے
ان سے کچھ چپکے بھی کہتے تھے تو ڈرتے ڈرتے — مرد و زن پیر و جواں دم تھے سب اُن کا بھرتے
خاک اب چھانتے پھرتے ہیں وہ صحراؤں میں
اور ستم اس پہ کہ چھالے ہیں پڑے پاؤں میں

جن کو دنیا میں کچھ انداز سوا کام نہ تھا — دم بھر اسباب طرب بن انھیں آرام نہ تھا
کچھ بھی اندیشہ انھیں صبح سے تا شام نہ تھا — رات دن چین تھا کچھ غم سے انھیں کام نہ تھا
دشتِ غربت میں مری ہیں کہ سب آوارہ ہیں
بحرِ غم دل ہے، جو مژگاں ہیں وہ[2] فوارہ ہیں

جامِ عشرت سے سدا رہتے تھے دن رات بمست — اور موجود وہاں رہتے تھے سب بادہ پرست
بزم میں ان کی سدا اہلِ طرب کی تھی نشست — ہاتھ اٹھائے تھے وہ سب رنج و الم سے یکدست
اب وہ غم کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں
خاک جیتے ہیں، مگر کہنے کو، ہاں جیتے ہیں

وہ نگاہیں کہ جو دل چھینتے تھے زہادوں کے — اور پابند وہ دل کرتے تھے آزادوں کے
اور وہ کر لیتے تھے قابو میں دل عبادوں کے — بید کی طرح سے دل کانپتے تھے جلادوں کے

۱؎ اصل: ہے (ف د: تھی)

۲؎ سو۔ (ف د ۳۶)

الغرض خلق کے دل لینے میں استاد تھیں وہ
دم میں کر دیتیں دل و دین کو برباد تھیں وہ

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا یہ حال
بار سے رنگِ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال

خوابِ مخمل سے کفِ پا کو تھا ہاں ان کے ملال
میلے ہوتے تھے نظر کرنے سے وہ چاند سے گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے
مل گئی خاک میں سب میری و مرزائی ہے

جن کو موجود تھی جمعیتِ خاطر ہر دم
خواب راحت سے نہ تھی جن کو کو فرصت یکدم

اور آرام سے شیرازۂ خاطر تھا بہم
کیا کروں عیش میں ان لوگوں کا احوال رقم

یعنی اب زلف ہے دام ان سے پریشانی کو
آئینہ لیتا ہے مول ان سے ہی حیرانی کو

رُباعیات

اے خداوندِ دو عالم، رحمتے
رحمتِ فرطِ بحالم، رحمتے

عرض دارم، کُن طفیلِ مصطفیٰ
بر من و (بر) اہلِ عالم رحمتے

اے خدا برحال زارم رحمتے
کُن بجانِ بیقرارم رحمتے

چشمِ رحمت از تو دارم روز و شب
رحمت، اے پروردگارم، رحمتے

اے خدا، بہرِ مصطفیٰ مددے
مددے کن بحالِ ما مددے

نیست بجز ذاتِ تو مددگارم
بہرِ پیغمبر، اے خدا، مددے

یاشفیع المذنبیں، اشفع اللنا
یا انیس المجرمیں، اشفع اللنا

ذات پاکت را خدا فرمود خود
رحمت اللعالمیں، اشفع اللنا

خالقا از بہر روحِ پیرِ ما
شاد گرداں خاطرِ دلگیرِ ما
از تو میخواہم عفوِ جرمِ خویش
کن معاف از فضلِ خود تقصیرِ ما

اے تشنہ لبو! نمود دیتا ہے سراب
دھوکا ہے نہ ہوگے اس سے ہرگز سیرلب
کھل جائے گی تم پہ جب حقیقت اس کی
معلوم کرو گے تھا وہ افسانہ وخواب

اک عمر تو لہو اور لعب میں گزری
اک عمر بس عیش اور طرب میں گزری
پیری میں بندھا خیالِ بربادیِ عمر
یہ عمر بھی یوں ہی تاب وتب میں گزری

دنیا کے حصول کا نہ کر دل میں خیال
رکھ ذکرِ خدا سے دل کو تو مالا مال
یہ دولتِ سرمدی ملے گر اس کو حصول
چھوڑ اس کی تلاش کیوں کہ وہ ہے خواب وخیال

ہاتھ عشق سے ہم نہیں اٹھانے والے
ہرگز نہیں اس سے باز آنے والے
کب سنتے ہیں ہم کسی کی الفت میں بھلا
بیہودہ سرا ہیں سر پھرانے والے

یہ جیفۂ دنیوی ہے افسانہ وخواب
تو اس کی تلاش میں نہ ہو دیکھ خراب
یہ بات تو ہو چکی نصّ سے ثابت
دنیا جیفہ ہے طالب اس کا ہے کلاب

معشوقوں سے دل ہم نے لگا کر دیکھا
غم ان کا ہزار طرح کھا کر دیکھا
نقصان سوا ہوا نہ کچھ اس میں حصول
سو بار اس کو آزما کر دیکھا

اے عیشؔ تم ان بتوں کی الفت چھوڑو
اس رشتۂ جاں گزا کو دل سے توڑو
منزل ہے یہ خوفناک آؤ مانو
اس راہ سے بس عنانِ خاطر موڑو

ہیں حضرت عشق کے جو نیرنگ نئے
دل کے بھی اسی سبب سے ہیں ڈھنگ نئے
میں سخت ہوا ہوں اس کے ہاتھوں لاچار
رکھتا ہے یہ مجھ سے رات دن جنگ نئے

ہر بات پہ چین ہے جبیں کے اوپر
ہر لحظہ ہے ہاتھ آستیں کے اوپر
نخوت سے دماغ ہے فلک پر اُن کا
رکھتے نہیں پاؤں وہ زمیں کے اوپر

گر طالبِ حق ہے چھوڑ یہ لاف و گزاف
بُغض و حسد و کینہ سے کر سینہ صاف
جب ہو چکے عیشؔ بات یہ تجھ کو حصول
گر مصقلۂ ذکر سے دل کو شفاف

کب سیب میں اس کے ہے ذقن کی سی بو
غنچہ میں کہاں ہے اس دہن کی سی بو
مشک و ختن و عنبرِ سارا میں صبا
ہے کاہے کو زلفِ پُرشکن کی سی بو

کیں مصلحتیں جو دشمنوں میں ہیں گی
ٹھہرائیں جو باتیں ہم تنوں میں ہیں گی
دل میں تو وہ کھوٹ اور ظاہر میں وہ لطف
یہ باتیں ہمارے ناخنوں میں ہیں گی

بنڑے تو نبیڑ دلبروں سے اچھی
کرنی نہیں چھیڑ دلبروں سے اچھی
ہاں توسنِ طبع کو بس اپنے اے عیشؔ
کر جاتے ہیں ایڑ دلبروں سے اچھی

انسان ہے اختیار میں بھی اپنے مجبور
اس رمز کو سمجھیں وہ، جو ہیں اہلِ شعور
بالفرض ہے اختیار و جبر اس کو حصول
بالذّات نہیں ہے اس کو کچھ بھی مقدور

معشوقوں سے عیشؔ، دل لگانا ہے عبث
دل دے کے پھر اس کا رنج کھانا ہے عبث
سنتے نہیں وہ فرشتہ خاں کی ظالم
افسانۂ غم انھیں سنانا ہے عبث

یہ عمر ہوئی وہ طرزِ مستی نہ چھٹی
معشوقوں سے ربط و بیش دستی نہ چھٹی
پیری میں بھی عیشؔ ہے بتوں کا دھیان
بوڑھے بھی ہوئے پہ بت پرستی نہ چھٹی

اس عمرِ گراں بہا کو کیوں کھوتے ہو
غفلت میں پڑے ہوئے یہ کیا سوتے ہو
یہ مزرعۂ آخرت ہے دنیا اے عیشؔ!
کاٹو گے وہی یہاں جو کچھ بوتے ہو

طفلی تو تمام، آہ، رو کر کاٹی
اور، اور سنو، جوانی سو کر کاٹی
پیری میں خیال تھا کہ کچھ کر لیں گے
سو وہ بھی اس طرح سے کھو کر کاٹی

بلبل، تو چمن میں آشیانہ نہ بنا
آتا ہے خزاں کا پھر زمانہ، نہ بنا
کہتا ہوں ترے بھلے کی، آگے تو جان
رہنے کا نہیں یہ کارخانہ، نہ بنا

دانے سے جہاں میں خاکساری سیکھو
اور عیشؔ زمیں سے بردباری سیکھو
رکھتے ہو قدم جو عاشقی (میں) تو سنا
پروانے سے پہلے جاں نثاری سیکھو

قطعاتِ تاریخ

تاریخِ وفاتِ بہادر شاہ

شاہِ دہلی کاں بہادر شاہ بود | جانشینِ حضرتِ تیمور لنگ
ماجرائے طرفہ شد از فوجِ خویش | حاکماں را از قضا افتاد جنگ
روبسوئے حضرتِ دہلی نہاد | جوق جوق از فوج با تیغ و تفنگ
ماند کشت و خون باہم چند ماہ | خلق را زیں ماجرا شد عقل دنگ
شد چو فتح حاکماں بر فوجِ خویش | شاہ را کردہ مقیّد بعد جنگ
سوئے رنگونش روانہ کردہ داد | تیغِ اقبالش شد آلودہ بزنگ
ماند چندیں سال در رنگون قید | داد آں بر باد جملہ . . . . .
از قضایش جان بحق تسلیم کرد | بس کہ . . . .
چوں شنیدم غور ستم از ہاتفے | . . . .
گفت ہاتف از . . .
مُرد شاہ . . . .

چوں گزشت ایں . . .
داد آواز ہاتف از سر طور | "داخلِ خلد سالِ رحلتِ او"
(۹+ | ۱۲۶۹ = | ۱۲۷۸)

این عفیفہ چونکہ بگذشت از جہاں ۔۔۔ سال تاریخش بجستم از پیش
ہاتف غیب از سر افسوس گفت ۔۔۔ "خانہ خاک است سال رحلتش"
(۱۲۷۸ = ۱۲۷۷ھ +۱)

تاریخ وفات حضرت شاہ غلام محمد صاحب معروف بہ مسکین شاہ

کرد رحلت زایں جہاں چوں حضرت مسکین شاہ ۔۔۔ خار غم در دل خلید از رحلت آں نیک ذات
عیش چوں سال وفاتش خواست از پیر خرد ۔۔۔ "واصل ذات الٰہی گفت تاریخ وفات"
(۱۲۷۴ھ)

تاریخ واگذاشت مسجد جامع

. . . . پھر ہوا ۔۔۔ فضل خدا سے عیش ظہور تبرکات
. . . . ۔۔۔ بحر جہاں میں دیکھ عبور تبرکات
. . . . ۔۔۔ سال ظہور اس کا ہے "نور تبرکات"
(۱۲۷۹ھ)

تاریخ واگذاشت مسجد جامع

. . . . ۔۔۔ تاریخ کے سجدے میں خدا سے کرکے
. . . . مسجد جامع پھر کے

زچندے مسجد جامع شدہ بود ۔۔۔ بحکم حاکمان عصر مقروق
رہا کردند بازش سال تاریخ ۔۔۔ بگویند از "عبادت گاہ مخلوق"
(۱۲۷۹)

تاریخ تعمیر مکان عمر بخش صاحب

خوش طرح فگند دست کاراں ۔۔۔ از زور طبیعت ہنر بخش

دید عیش چوں آں مکان مسعود کرد عرض بہ ہاتفِ خبر بخش
کز سالِ بنائش نظمِ تاریخ من منتظرم تر دو تر بخش
بشنید سوالِ من چو ہاتف
فرمود "حویلی عمر بخش"

(۱۲۷۶ھ)

میر مسجد

چونیکو مسجدے مرزا . . . . .
چناں سالِ بنائش گفت ہاتف "عبادت گاہِ مخلوق از سرِ بام"
(۱۲۷۶ھ)

تاریخ وفات سیّد سعادت علی

بود کاں سیّدِ سعادت علی میر منشی ملکِ راجستھان
زیں جہاں کرد چوں بحکمِ قضا سفر سوے روضۂ رضوان
خواستم از خدائے عز و جل سالِ تاریخ او بدیں عنوان
کہ کشادیم مصحفِ ناطق! بود مضمونِ بخشش اوّلِ آں
الغرض عیش سالِ تاریخش یافتم بخشش از سرِ فرقاں!
. . . . داخلِ زمرۂ وصیِ رسول
(۱۲۸۹ھ)

تاریخ وفات اسداللہ خاں غالب

. . . . راہیِ درگہِ رحیم ہوئے
. . . . اونکا قاف و لام و میم ہوئے
. . . . شب یوں کلیم ہوئے
. . . . سیلم ہوئے

اور بڑے چین سے گزاری عمر | جب تلک وہ یہاں مقیم ہوئے
اب جو یہاں سے وہاں گئے تو وہ عش! | موردِ بخشش کریم ہوئے

رکھتے دل خوش تھے وہ سو بادلِ خوش
"داخلِ جنّتِ نعیم ہوئے"
(۶ + ۱۲۷۹ = ۱۲۸۵)

ایضاً تاریخ ثانی

مرتے ہی حضرتِ غالب پہ یہ انعام ہوا | اُٹھ گیا آنکھوں کے آگے سے حجاب کوثر
یا یہ کہیے کہ زراہِ کرم و لطفِ عمیم | کھینچ دی ان کے لیے حق نے طناب کوثر
بس کہ سرخوش وہ رہا کرتے تھے دنیا میں مدام | جام . . . .
میں اِدھر فکر میں از روئے شمارِ ابجد | کر . . . .
عین اُسی حال میں ناگاہ نظر آئے مجھے | . . . .
پئے تاریخ وہیں میں نے کیا اُس سے سوال | . . . .

حضرتِ غالب مغفرت . . .
یہ ہے . . . .

تاریخ "تہذیب القلوب"

(۱۲۸۶ھ)

کتاب کرد ور آخر . . .

چو دیدم بس مفیدِ خاص و عام است | پُر از اخلاق و ہم قولِ حکیماں
مسمّیٰ کرد "تہذیب القلوبش" | شدہ در خلق مقبولِ دل و جاں
پئے تاریخِ سالش فکر کردم | زہاتف شد ندا عیشم بدیں ساں
کہ نامِ اوست سالِ اختتامش | ازیں بہتر نہ باشد اے سخن داں!

تاریخِ منشی امّو جان

وارِدِ دنیا سے یہ جس روز امین اللہ خاں | خواہشِ حق سے روانہ ہوئے سوئے جنت

اہلِ پورب میں سے اک شخص نے اُن کی تاریخ ۔ اس طرح آکے پڑھی سامنے میرے حضرت !
. . . . . . ہو بھیا "داخلِ خلد ہوئے" ہے یہی سالِ رحلت

(۱۲۸۶ھ)

. . . .
. . . . چو شُد راہی سوے دارالسّرور است
. . . . زمُنیش سینۂ اُو پُر از نور است
. . . . بہرِ شاں حور قصور است
. . . . از فضل و انعامش چہ دور است
. . . . کہ تاریخش ضرور است
. . . . از نامِ غفور است

(۱۲۸۶ھ)

(تاریخِ وفاتِ قاضی مبارک علی)

جب کہ قاضی مبارک علیِ نیک نہاد ۔ سیرِ جنت کو گئے چھوڑ کے دنیا کا چمن
دل نے چاہا لکھوں اس واصلِ حق کی تاریخ ۔ کندہ کی جائے وہ تا ان کی بہ لوحِ مدفن

دی یہ ہاتف نے صدا از سرِ حوضِ کوثر
ان کی تاریخ کہو "خانۂ جنت مسکن"

(۸ + ۱۲۷۹ = ۱۲۸۷ھ)

ے بھئے بمعنی ہوئے پوربی بول چال میں رائج ہے

بیورو کی مطبوعات

ابوالکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	۲۱/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (دوسرا ایڈیشن)	احتشام حسین	۱۹/۵۰
ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ گیر شخصیت	مرتب پروفیسر رشید الدین خاں	۵۸/-
انتخاب غزلیاتِ میر	مرتب: ڈاکٹر حامد کاشمیری	۱۵/-
انتخاب کلام حسرت	" ڈاکٹر فضل امام	۹/-
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	۱۸/-
تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ، مترجم پروفیسر نذیر احمد	۱۰/-
جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن	ظفر محمود	۱۲/-
خسرو شناسی (دوسرا ایڈیشن)	مرتبین۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ابوالفیض سحر	۱۷/۵۰
درس بلاغت (دوسرا ایڈیشن)	ترقی اردو بیورو	۱۱/-
دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	۴۲/-
دکنی ہندو اور اردو	" " "	۱۵/۵۰
دکنی نثر کا انتخاب	مرتب۔ پروفیسر سیدہ جعفر	۱۲/۵۰
دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	۱۹/-
شعر شور انگیز جلد اوّل حصہ اوّل	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۴/-
" " " " حصہ دوم	" " "	۶۴/-
فکر و تحقیق سہ ماہی پہلا شمارہ	مرتب: ترقی اردو بیورو	۱۵/-
فکر و تحقیق سہ ماہی دوسرا شمارہ	مرتب: ترقی اردو بیورو	۱۵/-
" " " تیسرا "	" " " " "	۱۵/-
" " " چوتھا "	" " " " "	۱۵/-
" " " پانچواں "	" " " " "	۱۵/-

کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	۴۴/-
〃 〃 (ڈی لکس)	〃 〃 〃	۴۸/-
کلیات قلی قطب شاہ	پروفیسر سیدہ جعفر	۶۵/-
کلیات میر	ظل عباس عباسی	۴۶/-
مجموعۂ نغز (تذکرہ شعرائے اردو)	مرتب: محمود شیرانی	۵۰/-
کلیات سودا (حصہ اول)	مرتب: پروفیسر محمد حسن	۴۸/-
〃 〃 (حصہ دوم)	〃 〃 〃	۱۳/-
مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات	〃 〃	۲۸/-
مقالات مسعود	پروفیسر مسعود حسین خاں	۱۸/۵۰
وضاحتی کتابیات (جلد اول)	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۱۶/-
وضاحتی کتابیات (〃 دوم)	پروفیسر مظفر حنفی	۴۳/-
کلیات ذوق	مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۳۴/-
فسانۂ آزاد (جلد اول)	رتن ناتھ سرشار، فرہنگ امیر حسن نورانی	۱۰/-
〃 〃 (〃 دوم)	〃 〃 〃	۶۵/-
〃 〃 (〃 سوم، حصہ اول)	〃 〃 〃	۶۷/-
〃 〃 (〃 〃، حصہ دوم)	〃 〃 〃	۶۷/-
〃 〃 (جلد چہارم، حصہ اول)	〃 〃 〃	۵۰/-
〃 〃 (〃 〃، 〃 دوم)	〃 〃 〃	۵۰/-

ملنے کا پتہ

ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸

آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶